مسائل اجتہاد

مولانا وحید الدین خاں

مسائل اجتہاد

مولانا وحید الدین خاں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

First Published 2003
E-Published 2026

Masail-e-Ijtehad
By Maulana Wahiduddin Khan

This book is copyright free.

Goodword Books
A-21, Sector 4, Noida-201301
Delhi NCR, India
Tel. +91-120 4131448, Mob. +91 8588822672
e-mail: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Centre for Peace and Spirituality International
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Mob. +91-9999944119
e-mail : info@cpsglobal.org
www.cpsglobal.org

Centre for Peace and Spirituality USA
391 Totten Pond Road,
Suite 402, Waltham Ma 02451, USA
Mob. + 1 617 960 7156
e-mail : info@cpsglobal.org

فہرست

تقلید اور اجتہاد

تقلید اور اجتہاد 6

موجودہ مسلم معاشرہ 6

احترام انسانیت 8

حالات کی رعایت 10

نفاذ احکام میں تدریج 12

میدان عمل کی تبدیلی 14

مطالعۂ حدیث کے درجات 16

اجتہادی عمل کی اہمیت 16

اجتہاد کیا ہے 17

فکری المیہ 18

ازسرِ نوغور کرنے کی صلاحیت 19

فقہ کی تدوین دور اقتدار میں 22

نمونہ موجود نہیں 22

شتم رسول کا مسئلہ 24

امن کی طاقت 27

موجودہ فقہ کافی نہیں 30

جدید امکانات کا استعمال 32

ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند 34

خلاف زمانہ روش 35

تقلیدی نظر اور

اجتہادی نظر کا فرق 37

تنقید اور اجتہاد 39

میدان بدر کا انتخاب 41

تنقید نہ سننے کا نقصان 43

شخصیت نہیں بلکہ اصول 45

تنقید کا فائدہ 46

صحیح معیار اور غلط معیار 49

انقلابی ذہن کی ضرورت 50

اجتہادی مسائل

تفسیر بالرائے 58

تفسیر بذریعہ تدبر 63

سلطانی ماڈل، دعوتی ماڈل 67

دوگونہ غلطی 70

خلاصۂ بحث 75

ربّانی تعقّل 76

ایک سادہ مثال 79

کائنات کا ابتدائی دھماکہ 81

زوجین کی مثال 83

پاکستان کے لیے انتخاب 86

فراست مومن 94

نزاع کے موقع پر 95

آغاز کار 96

توہین کو برداشت کرنا 97

قبل از وقت اقدام نہیں 98

مقام نزاع سے ہٹ جانا 99

اغیار کی رعایت 100

رازداری 101

صورت موجودہ کو مان لینا 102

مشکل میں آسانی 103

تدبیری پسپائی 104

اصلاح میں تدریج 105

عملی حالات کی رعایت 106

مستقبل بینی 107

تفکیر وتدبّر

فن تفکیر 110

علم بغیر معرفت 111

زاویۂ نظر کا فرق 113

دوقسمی سوچ 115

دانش مندکی پہچان 116

سیکنڈ چانس 117

مشکل آسان ہوگئی 118

غلط سوچ کا نقصان 118

مثالوں سے استدلال 121

چھوٹا شر 122

تحمل کی طاقت 123

ذہنی سکون 124

آئیڈیل یا پریکٹیکل 127

مقصد کی حفاظت 129

معاملہ برابر ہوگیا 130

سیاق وسباق کی اہمیت 131

حافظہ کا مسئلہ 133

قناعت، ترقی 134

یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ 135

مشکل میں آسانی 137

تعمیم کی غلطی 138

سبق لینا، نہ کہ سبق سکھانا 140

عملی طریقہ 141

اقدام نتیجہ خیز ہونا چاہیے 142

ذہنی تناؤ 143

معیار کا فرق 144

بے بنیاد سوچ 146

ذہنی ترقی میں رکاوٹ 148

امن کس لیے 149

وقت کے پیچھے سوچنا 150
برائی کی جڑ 151
سوچ کے بغیر 153
سیکنڈری پوزیشن 154
میڈیا کلچر 155
الٹی سوچ 157
اوپر اٹھ کر سوچنا 159
تنقید کوئی برائی نہیں 160
بچوں کے لیے زیادہ بہتر تحفہ 161
اتحاد کا راز 161
عسر کے ساتھ یسر 162
کامیاب ازدواجی زندگی 163
عقیدۂ خدا اور سائنس 164
مذہب اور سائنس 168
پہلا گروہ: برٹرینڈ رسل 168
دوسرا گروہ: آئنسٹائن 171
اسلام ایک نعمت 175
قناعت کامیابی کا راز 177

امن عالم

نظریۂ امن 184
امن کیا ہے 184
کائنات کا مذہب امن ہے 185
قرآن ایک کتاب امن 186
امن اور تشدد کا فرق 187
صلح بہتر ہے 188
فساد فی الارض نہیں 189
سازش کا خاتمہ 190
شدت پسندی نہیں 191
ایک انسان کا قتل
ساری دنیا کا قتل 192
تشدد کی آگ کو بجھانا 193
اصلاح کے بعد فساد 194
اعراض، نہ کہ ٹکراؤ 195
صبر ترقی کا راز 196
نزاع نہیں 197
جنگ صرف دفاع کے لیے 198
صبر کا طریقہ حمایت یافتہ طریقہ 199
پُرامن نظریاتی اشاعت 200
دشمن کو دوست بنانا 201
خود اپنے عمل کا نتیجہ 202
غصہ ایک کمزوری ہے 203
حق پر صبر کے ساتھ جمنا 204
امن کی قیمت 205
صلح کی پیشکش کو قبول کرنا 207
زیادہ بڑا رزق 208
امن پسندی تحفظ کا ذریعہ 210
انسانوں کے لیے رحمت 211
جہاد پُرامن عمل کا نام ہے 212
ہر حال میں امن 213
اللہ کا نام سلامتی 214
طاقتور کون 215
سماجی امن کا فارمولا 216
خاموشی میں نجات 216
دشمن سے ٹکراؤ نہیں 218
نان وائلنس کا طریقہ 219
اختلاف کی حد 220
پُرامن طریق کار زیادہ بہتر 221
لچک کا طریقہ، نہ کہ اکڑ کا طریقہ 222
پُرامن شہری 223
انتظار بھی حل ہے 224
خدائی انتباہ، نہ کہ انسانی ظلم 224
خاموشی کی طاقت 226
تشدّد مایوسی کا نتیجہ 226
پازیٹیو اسٹیٹس کو ازم 227
تشدّد کا کوئی جواز نہیں 229
عداوت کے مسئلہ کا حل 229
ہتھیار جمع کرنا بے فائدہ 230
ضمیر بہترین جج ہے 231
فتح بھی شکست ہے 233
شکایت کو فوراً ختم کرنا 233
دہشت گردی کیا ہے 235
کھلی مذمت ضروری 236
ناکامی کا کیس 237
مذہب خطرہ میں ہے 238
انتقام سے تشدّد تک 240
جنگ کا زمانہ ختم 241
زمانہ کے خلاف 242
برداشت کی ضرورت 242
امن کے فائدے 243
مسلم پالیسی کو بدلنے کی ضرورت 244

متفرق مسائل

ہجر جمیل 248
غیر فطری ردعمل 256
جنگ سے امن تک 259
امن برائے امن 262
جنگ کا دور ختم 263
صحبت کا فلسفہ 265
عمومی صحبت 267
توسیع صحبت 269

تقلید اور اجتہاد

تقلید اور اجتہاد

انسانی ذہن کی دو قسمیں ہیں: تقلیدی اور اجتہادی۔ تقلیدی ذہن اور اجتہادی ذہن کے فرق کو سادہ طور پر اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ تقلیدی ذہن سے مراد بند ذہن ہے اور اجتہادی ذہن سے مراد کھلا ذہن۔ تقلیدی انسان کا ذہنی سفر ایک حد پر پہنچ کر رک جاتا ہے۔ اس کے برعکس اجتہادی انسان کا ذہنی سفر برابر آگے کی طرف جاری رہتا ہے، وہ موت سے پہلے کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس فرق کو ایک مثال سے سمجھیے۔

شیکسپیئر انگریزی زبان کا بہت بڑا ادیب ہے۔ اس کی وفات 1916ء میں ہوئی۔ دوسرا، بعد کے زمانے کا انگریزی ادیب جارج برناڈ شا ہے، جس کی پیدائش 1856ء میں ہوئی۔ زمانۂ عمل کے اعتبار سے دونوں کے درمیان تقریباً تین سو سال کا فاصلہ ہے۔ برناڈ شا کا مقام انگریزی ادب کی تاریخ میں شیکسپیئر سے کم ہے۔ برناڈ شا نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ — میرا قد اگرچہ شیکسپیئر سے چھوٹا ہے مگر میں شیکسپیئر کے کندھے پر کھڑا ہوا ہوں۔

> I am samller in stature than Shakespeare, but I stand upon his shoulder.

یہ مجتہدانہ طرزِ فکر کی ایک مثال ہے۔ اس طرزِ فکر سے بلند نظری اور حوصلہ مندی پیدا ہوتی ہے۔ جس معاشرہ کے لوگوں میں یہ مزاج ہو وہاں ذہنی ارتقاء کا سفر کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہے گا۔ ہر نسل کے افراد پچھلے لوگوں کے علمی سرمایہ پر اضافہ کریں گے اور اس کو مزید ترقی دے کر اگلی نسل تک پہنچاتے رہیں گے۔

موجودہ مسلم معاشرہ

اب مسلم معاشرہ کو لیجیے۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے اندر ذہنی ارتقاء کا عمل تقریباً رک گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندر مقلدانہ طرزِ فکر کا رواج ہو گیا، اور

مجتہدانہ طرزِفکر کا اس طرح خاتمہ ہو گیا جیسے کہ وہ کوئی برائی ہو اور جس کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہو۔ عام طور پر لوگوں کا ذہن یہ بن گیا کہ علم وتحقیق کا سارا کام علمائے سلف کر چکے ہیں۔ اب ہمارے لیے کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ ہم ان کی کتابوں کو پڑھیں اور ان کا اتباع کریں۔ مگر اس قسم کی سوچ فکری ترقی کے لیے ایک مستقل رکاوٹ ہے۔ اس معاملے میں مسلمانوں کے لیے طرزِفکر کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یہ دونوں صورتیں حسب ذیل ہیں:

1۔ میرا قد اسلاف سے چھوٹا ہے مگر میں اسلاف کے کندھے پر کھڑا ہوا ہوں۔

2۔ میرا قد اسلاف سے چھوٹا ہے اس لیے میں اسلاف کے قدموں میں پڑا ہوا ہوں۔

مذکورہ تقسیم میں پہلا طرزِفکر مجتہدانہ ہے۔ وہ مسلم گروہ کے علمی اور ذہنی سفر کو مسلسل ترقی کی طرف لے جانے والا ہے۔ جس گروہ کے اندر یہ فکری روایت ہو اس کی ہر اگلی نسل اپنی پچھلی نسل کا مکمل احترام کرتے ہوئے اس کی ترقی کو زینے کے طور پر استعمال کرے گی۔ اس طرح ہر اگلی نسل اپنی پہلی نسل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آگے بڑھتی رہے گی۔

اس کے مقابلے میں دوسرا طرزِفکر مقلدانہ ہے۔ وہ مسلمانوں کے ذہنی سفر کو ایک حد پر روک دینے والا ہے۔ اس طرزِفکر کا بیک وقت دو نقصان ہوگا۔ ایک یہ کہ ایسے لوگ اسلام کے اعلیٰ فکری درجات پر پہنچنے سے محروم رہ جائیں گے۔ وہ اضافہ پذیر معرفت سے آشنا نہ ہوسکیں گے۔ اس کا مزید نقصان یہ ہوگا کہ وہ علمی وفکری میدان میں دوسری قوموں سے پچھڑ جائیں گے۔ انسانیت کے رواں دواں قافلے میں وہ گرد راہ بن کر رہ جائیں گے۔

یہ تقلیدی طرزِفکر عین وہی ہے جس کو جاہلی دور کے مشہور شاعر عنترۃ بن شداد العبسی (وفات 615ء) نے اپنے معلقہ کے مَطلع میں ان الفاظ میں بیان کیا تھا:

هَلْ غَادَرَ الشّعراءُمِنْ مُتَرَدَّمِ

اس کا مطلب یہ ہے کہ پچھلے شعراء نے کیا کوئی جگہ پیوند لگانے کی باقی چھوڑی ہے۔ یعنی وہ سب کچھ کہہ گئے ہیں، اب کسی شاعر کے لیے کوئی چیز باقی نہیں رہی کہ اس پر وہ کچھ اضافہ کرسکے۔

ادب کی دنیا کا یہ طرزِ فکر جب مذہب میں داخل ہو جائے تو اس کو تقلیدی فکر کہا جاتا ہے۔اس قسم کا تقلیدی فکر ذہنی ترقی کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔وہ لوگوں کو ذہنی جمود میں مبتلا کر دینے والا ہے۔اور بلا شبہ ذہنی جمود سے زیادہ مہلک کوئی اور چیز کسی فرد یا گروہ کے لیے نہیں۔اس معاملے کو سمجھنے کے لیے یہاں میں ذخیرۂ حدیث سے چند مثالیں دوں گا۔

احترام انسانیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ مختلف راویوں کے ذریعہ حدیث کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔صحیح البخاری میں یہ واقعہ اس طرح ہے کہ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک جنازہ گزرا۔اس وقت آپ بیٹھے ہوئے تھے۔جنازے کو دیکھ کر اس کے احترام میں آپ کھڑے ہو گئے۔آپ کے ساتھ آپ کے اصحاب بھی کھڑے ہو گئے۔آپ سے کہا گیا کہ یہ ایک یہودی کا جنازہ تھا (وہ مسلمان کا جنازہ نہ تھا)۔آپ نے فرمایا: أَلَيْسَتْ نَفْسًا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1312)۔یعنی، کیا وہ انسان نہیں۔

امام البخاری کا یہ ایک عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے لاکھوں حدیثیں جمع کیں۔پھر غیر معمولی محنت کے ذریعے (مکررات سمیت) ان میں سے 7563 حدیثیں منتخب کیں اور وہ قیمتی مجموعۂ احادیث تیار کیا جو صحیح البخاری کے نام سے ہمارے پاس موجود ہے اور جس کو اصح الکتب بعد کتاب اللّٰہ کہا جاتا ہے۔اس اعتبار سے امام البخاری کا کارنامہ اتنا عظیم ہے کہ شاید اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔

لیکن بعد کی نسلوں کو یہیں رک جانا نہیں ہے، بلکہ اور آگے بڑھنا ہے۔مثلاً امام البخاری نے مذکورہ حدیث کو اپنے مجموعہ میں کتاب الجنائز (بَابُ مَنْ قَامَ لِجَنَازَةِ يَهُودِيٍّ) کے تحت درج کیا ہے۔اب اگر بعد کے لوگ اپنی سوچ کو امام البخاری کے قائم کردہ ترجمۂ باب تک محدود کر لیں تو وہ اس حدیث کو صرف جنازہ کا ایک معاملہ سمجھیں گے اور اس سے جنازے کے مسائل نکالنے پر اکتفا کریں گے۔ان کا ذہنی سفر، اس حدیث کے تعلق سے مسئلہ جنازہ سے آگے نہ بڑھ سکے گا۔

اس کے بعد دوسرا گروہ شارحین کا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، احادیث کی شرحیں کثرت سے لکھی گئیں۔ ان شارحین نے حدیث اور روایت کے مختلف پہلوؤں پر قیمتی بحثیں کی ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں بے حد ضروری مواد فراہم کیا ہے۔ یہ مواد بے حد اہم ہے۔ اس سے حدیث کی مختلف جہتیں معلوم ہوتی ہیں جو حدیث کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کے لیے بلا شبہ ضروری ہیں۔

لیکن اگر بعد کے لوگ حدیث کی ان شرحوں کو حرف آخر قرار دے دیں تو پیغمبر اسلام کی احادیث پر مزید غور و فکر کا عمل رک جائے گا۔ اور یہ فکری ارتقاء کے اعتبار سے بہت بڑے نقصان کا باعث ہوگا۔ مثلاً مذکورہ حدیث کی شرح کرتے ہوئے مختلف علما نے اس کا جو مفہوم بتایا ہے اس میں حدیث کا ایک اہم پہلو بیان ہونے سے رہ گیا۔ ان مختلف اقوال کو ابن حجر العسقلانی اور دوسرے شارحین حدیث کے یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے مطابق کسی شارح نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کا سبب ملائکہ کو بتایا ہے۔ کسی نے لکھا ہے کہ آپ نے کراہت بخور (دھونی) کے لیے ایسا کیا۔ کسی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ایسا کیا تھا مگر اب یہ عمل منسوخ ہو چکا ہے (فتح الباری، جلد 3، صفحہ 216-215)۔ ایک قول کے مطابق، آپ نے اس کو پسند نہیں کیا کہ یہودی کا جنازہ آپ کے سر کے اوپر سے گذرے اس لیے آپ کھڑے ہو گئے (وَكَرِهَ أَنْ تَعْلُوَ رَأْسَهُ جَنَازَةُ يَهُودِيٍّ، فَقَامَ)۔ حدیث کی یہ تمام شرحیں علمی اور اصولی اعتبار سے درست نہیں۔ یہ تمام شرحیں ذاتی قیاس پر مبنی ہیں نہ کہ کسی واقعی علمی دلیل پر۔ حدیث کا ظاہری متن واضح طور پر بتاتا ہے کہ آپ نے اس یہودی کو انسان کی حیثیت سے دیکھا اور بحیثیت انسان آپ اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ یہ حدیث اپنے متن کے مطابق، احترام انسانیت کی ایک عظیم مثال ہے۔

اب اس معاملے کو موجودہ زمانے کی نسبت سے دیکھیے۔ موجودہ زمانے میں اسلام

پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں احترام مسلم تو ہے مگر اس میں احترام انسانیت نہیں۔ یہ اعتراض بلا شبہ غلط ہے۔ قرآن وحدیث کے مختلف حوالوں سے اس کی تردید کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں بلا شبہ ایک اہم حوالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ واقعہ میں ملتا ہے۔ اس کو لے کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں انسان کا احترام کامل درجہ میں موجود ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان جس کو خدا نے پیدا کیا ہے وہ ہر حال میں قابل احترام ہے، خواہ وہ اپنے مذہب کا ہو یا غیر مذہب کا، خواہ وہ ایک قوم سے تعلق رکھتا ہو یا دوسری قوم سے، حتیٰ کہ اگر وہ بظاہر دشمن قوم کا فرد ہو تب بھی انسان کی حیثیت سے اس کا احترام کیا جائے گا۔ جب کہ مذکورہ شرح کی صورت میں اسلامی تعلیم کا ہی اہم اصول اوجھل ہو جاتا ہے۔

حالات کی رعایت

صحیح البخاری میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے فرمایا کہ قریش نے بعد کو جب کعبہ کی تعمیر کی تو انہوں نے اس کو حضرت ابراہیم کی اساس پر نہیں بنایا بلکہ اس کو بدل کر بنایا (حضرت ابراہیم نے کعبہ کو لمبائی میں بنایا تھا مگر قریش نے اس کو مربع صورت میں بنا دیا۔ انہوں نے قدیم کعبہ کے ایک حصہ کو خالی چھوڑ دیا جس کو اب حطیم کہا جاتا ہے)۔ حضرت عائشہ بتاتی ہیں کہ میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، آپ کیوں نہیں کعبہ کو دوبارہ ابراہیمی اساس پر بنا دیتے۔ رسول اللہ نے جواب دیا کہ تمہاری قوم (قریش) ابھی جلد ہی کفر کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوئی ہے۔ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ اس سے بھڑک نہ جائے۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا تو میں ضرور ایسا کرتا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1583)۔

امام البخاری نے یہ حدیث کتاب الحج (بَابُ فَضْلِ مَكَّةَ وَبُنْيَانِهَا) میں درج کی ہے۔ اب اگر بعد کے لوگ امام البخاری کے قائم کردہ اس ترجمۂ باب پر اکتفا کرلیں تو وہ اس

حدیث سے صرف فضائل مکہ جیسے مسائل اخذ کریں گے، اس کے علاوہ اور کوئی تعلیم وہ اس حدیث میں دریافت نہ کرسکیں گے۔ حالانکہ اس حدیث میں اسلام کی ایک نہایت اہم تعلیم بیان کی گئی ہے۔ اس تعلیم کو ایک لفظ میں حکمتِ حیات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ صحیح بات یہ تھی کہ کعبہ کی اساس کو دوبارہ حضرت ابراہیم کی اصل اساس پر قائم کیا جائے۔ اس کو مشرکین کی اساس پر چھوڑنا بظاہر ایک غیر صحیح فعل تھا اس کے باوجود آپ نے اس کی تصحیح کی کوشش نہیں کی، کیوں کہ اس وقت کے حالات میں کعبہ کی تعمیر میں یہ تصحیح نئے مسائل پیدا کرسکتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس سنّت سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ زندگی میں بعض اوقات ایسی صورت حال پیش آتی ہے جب کہ یہ نہ دیکھا جائے کہ کیا درست ہے (what is right) اور کیا نادرست (what is wrong)۔ بلکہ یہ دیکھا جائے کہ کیا ممکن ہے (what is possible) اور کیا ممکن نہیں ہے (what is impossible)۔

یہ بے حد اہم بات ہے، حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اس اصول کا لحاظ انتہائی ضروری ہے۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی اکثر ناکامیاں اس لیے پیش آئی ہیں کہ انھوں نے ممکن اور ناممکن کے اعتبار سے معاملے کو نہیں دیکھا بلکہ اس کو صرف درست اور نادرست کے اعتبار سے دیکھا اور پھر جو انہیں درست نظر آیا اس کی طرف وہ فوراً دوڑ پڑے۔ حالانکہ حالات کے اعتبار سے اس کا حصول ان کے لیے ممکن ہی نہ تھا۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی بے نتیجہ قربانیاں تمام تر اسی اصول کو ترک کرنے کا نتیجہ ہیں۔

اس مہلک انجام کا واحد سبب تقلید ہے۔ انھوں نے مذکورہ حدیث کو البخاری کے ترجمۂ باب کی بنا پر صرف فضائل مکہ کے اعتبار سے دیکھا، وہ اس کو حکمت حیات کے اصول کے طور پر اخذ نہ کرسکے، وہ تقلید کے دائرہ میں بند ہو کر رہ گئے، وہ اجتہاد کی اگلی منزلیں طے نہ کرسکے جس کے بغیر ترقی کا سفر ممکن ہی نہیں۔

نفاذ احکام میں تدریج

صحیح البخاری کی ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت عائشہ نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ قرآن میں پہلے جو کلام اترا وہ اس کی مفصل سورتیں تھیں، ان میں جنت اور جہنم کا ذکر تھا۔ یہاں تک کہ جب لوگوں کے دل اسلام پر مطمئن ہو گئے تو اس کے بعد حلال وحرام کی آیتیں اتریں۔ اس کے بعد حضرت عائشہ کہتی ہیں: وَلَوْ نَزَلَ أَوَّلَ شَيْءٍ: لَا تَشْرَبُوا الْخَمْرَ، لَقَالُوا: لَا نَدَعُ الْخَمْرَ أَبَدًا، وَلَوْ نَزَلَ: لَا تَزْنُوا، لَقَالُوا: لَا نَدَعُ الزِّنَا أَبَدًا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4993)۔ یعنی، اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ تم لوگ شراب نہ پیو تو ضرور لوگ یہ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہیں چھوڑیں گے اور اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ تم لوگ زنا نہ کرو تو ضرور لوگ یہ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے۔

امام بخاری نے اس روایت کو اپنی صحیح میں کتاب فضائل القرآن (بَابُ تَأْلِيفِ الْقُرْآنِ) کے تحت درج کیا ہے۔ اب اگر بعد کے لوگ حضرت عائشہ کی اس روایت کا مطالعہ صرف امام بخاری کے ترجمۂ باب کے تحت کریں تو وہ اس سے صرف فضائل قرآن یا تالیف قرآن کے مسائل اخذ کریں گے، اس سے زیادہ کوئی اور چیز انہیں اس روایت میں نہ مل سکے گی۔ حالانکہ اگر غور وفکر کے سفر کو بخاری کے ترجمۂ باب پر روکا نہ جائے بلکہ اس کو مزید آگے جاری رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس روایت میں اسلام کا ایک نہایت اہم مسئلہ بیان ہوا ہے۔

اس روایت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز جس کو تطبیق شریعت یا نفاذ شریعت کہا جاتا ہے، اس کے لیے ایک حکمت کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ یہ حکمت تدریجی عمل (gradual process) کی حکمت ہے۔ اسلام کے دور اوّل میں شرعی قانون کا نفاذ ایک تدریجی حکمت کے تحت کیا گیا۔ وہ حکمت یہ تھی کہ پہلے لوگوں کے دلوں میں اطاعت احکام کی آمادگی پیدا کی جائے، اور جب یہ داخلی آمادگی پیدا ہو جائے تو اس کے بعد خارجی احکام کا نفاذ کیا جائے۔

اس روشنی میں موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحیح البخاری کی مذکورہ حدیث کوبس اس کے ترجمۂ باب کے تحت پڑھتے رہے، وہ ترجمۂ باب سے آگے بڑھ کر اس پر غور نہ کر سکے۔ اس تقلیدی طرز فکر کا نقصان یہ ہوا کہ وہ اسلام کی اس اہم حکمتِ تدریج کو سمجھنے سے قاصر رہے جو اس حدیث میں بتائی گئی تھی۔

موجودہ زمانے میں اکثر مسلم ملکوں میں لمبی مدت سے تطبیق شریعت یا نفاذ شریعت کے نعروں کا شور سنائی دے رہا ہے۔ مثلاً مصر، پاکستان، ایران، سوڈان، افغانستان، الجزائر انڈونیشیاء نائجیریا، بنگلہ دیش، وغیرہ وغیرہ۔ مگر بے شمار قربانیوں کے باوجود کسی بھی مسلم ملک میں اب تک شرعی قوانین کا نفاذ عمل میں نہ آسکا۔

اس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں طول امد (الحدید، 57:16) کے نتیجے میں ضعف ایمان پیدا ہو چکا تھا۔ ان کے اندر وہ ذہنی موافقت اور قلبی آمادگی باقی نہیں رہی تھی جو شرعی احکام کو عملی طور پر قبول کرنے کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔ ان کا حال مذکورہ روایت کے مطابق، یہ ہو گیا تھا کہ جب ان کو خمر اور زنا کے احکام کا مخاطب بنایا جائے تو وہ کہہ دیں کہ — لَا نَدَعُ الْخَمْرَ أَبَدًا و لَا نَدَعُ الزِّنَا أَبَدًا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4993)۔ یعنی، ہم کبھی بھی شراب نہیں چھوڑیں گے اور کبھی بھی زنا نہیں چھوڑیں گے۔

مثال کے طور پر اکثر مسلم ملکوں میں پر جوش مسلم رہنماؤں نے یہ کیا کہ میڈیا کو اسلامائز کرنے کے لیے ٹی وی کے نظام پر قبضہ کیا اور پھر اس کے ذریعہ "اسلامی پروگرام" دکھانا شروع کر دیا۔ لیکن وہ عملاً مکمل طور پر بے فائدہ رہا۔ کیوں کہ مسلم گھروں میں ٹی وی سیٹ پر جب یہ اسلامی پروگرام آتے تو گھر والے اس کو دیکھتے ہی نہ تھے۔ اور اس وقت ٹی وی سیٹ کی سوئی گھما کر دوسرا کوئی تفریحی پروگرام دیکھنے لگتے۔

نفاذ شریعت کی ہنگامہ خیز کوششوں کے باوجود اس کی مکمل ناکامی کا بنیادی سبب یہ

ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں میں اجتہادی فکر موجود نہ تھی۔ وہ صرف تقلیدی فکر کا سرمایہ لے کر میدان سیاست میں کود پڑے۔ اس قسم کے تقلیدی فکر کا انجام وہی ہو سکتا تھا جو عملاً پیش آیا۔

میدان عمل کی تبدیلی

صحیح البخاری میں حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے ایک روایت ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أُمِرْتُ بِقَرْيَةٍ تَأْكُلُ الْقُرَى يَقُولُونَ يَثْرِبُ وَهِيَ الْمَدِينَةُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1871)۔ یعنی، مجھے ایک بستی (کی طرف ہجرت) کا حکم دیا گیا ہے، وہ بستیوں کو کھا جائے گی۔ لوگ اس کو یثرب کہتے ہیں اور وہ مدینہ ہے۔

امام بخاری نے یہ حدیث اپنی صحیح میں کتاب (فَضَائِلُ الْمَدِينَةِ: بَابُ فَضْلِ الْمَدِينَةِ وَأَنَّهَا تَنْفِي النَّاسَ) کے تحت درج کی ہے۔ اب بعد کے لوگ اگر اس کو تقلیدی ذہن کے تحت دیکھیں تو وہ اس سے صرف فضائل مدینہ کا مسئلہ نکالیں گے، چنانچہ حدیث کے شارحین نے اس روایت کے تحت زیادہ تر اسی قسم کی بحثیں کی ہیں۔ مثلاً اکثر شارحین حدیث اس کے حوالے سے یہ کہتے ہیں کہ مدینہ کو یثرب کہنا مکروہ ہے اس کو صرف مدینہ یا مدینہ منورہ کہنا چاہیے۔

جیسا کہ معلوم ہے، قرآن میں مدینہ کے لیے یثرب کا لفظ استعمال ہوا ہے (33:13)۔ اس قرآنی استعمال سے مذکورہ تاویل پر زد پڑتی ہے۔ چنانچہ اس کی توجیہ بھی ذاتی قیاس کے تحت یہ کر لی گئی کہ وہ صرف غیر مسلموں کے قول کی حکایت ہے (فتح الباری، جلد 4، صفحہ 105)۔

لیکن اگر تقلید اسلاف سے آگے بڑھ کر اس حدیث پر مجتہدانہ انداز سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی طریق کار کا ایک اہم اصول بیان کیا ہے۔ اسی اصول کو ایک نظر میں میدان عمل کی تبدیلی کہا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب

یہ ہے کہ جب مکہ میں اہل اسلام کے لیے احوال سخت ہو گئے تو اللہ نے حکم دیا کہ تم مکہ سے نقل مکانی کر کے عرب کے دوسرے شہر یثرب چلے جاؤ۔ وہاں تم کو مکہ کے مقابلے میں موافق حالات ملیں گے، یہاں تک کہ وہ اسلام کا مرکز بن جائے گا اور لوگ اس کو یثرب کے بجائے مدینۃ الرسول یا مدینۃ الاسلام کہنے لگیں گے۔

موجودہ دنیا میں عملی کامیابی کا یہ ایک نہایت قیمتی اصول ہے۔ اس اصول کو ہجرت کہا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مقام پر تم کو موافق حالات نہ مل رہے ہوں تو تم وہاں سے نکل کر دوسرے مقام پر چلے جاؤ۔ ٹکراؤ کے طریقے سے مقصد حاصل نہ ہو رہا ہو تو مفاہمت کے طریقے سے اپنا مقصد حاصل کرو۔ تشدّد کے ذریعے کامیابی نہ مل رہی ہو تو امن کے ذریعہ کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

واقعات بتاتے ہیں کہ موجودہ زمانے کے مسلم رہنما اپنے تقلیدی ذہن کی بنا پر اس عظیم حکمت کو دریافت نہ کر سکے۔ اس کے نتیجے میں انہیں زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ مثلاً وہ مختلف مقامات پر اسلام کے نام سے پُرتشدّد تحریکیں چلا رہے ہیں جس کے نتیجے میں مسلمان بے شمار جانی اور مالی نقصان سے دوچار ہو رہے ہیں۔ مگر اپنے تقلیدی ذہن کی بنا پر وہ مذکورہ حکمت نبوی کو دریافت نہ کر سکے۔ حالاں کہ اگر ان کے اندر اجتہادی ذہن ہوتا تو مذکورہ حدیث میں ان کو اس کا حل معلوم ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ پر تشدّد طریق کار کو چھوڑ کر پُرامن طریق کار کا انداز اختیار کر لیتے اور پھر قانون فطرت کے مطابق، وہ کامیابی کے مرحلے تک پہنچ جاتے۔

مذکورہ مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقلیدی فکر کیا ہے اور اجتہادی نظر کیا۔ ایک لفظ میں تقلیدی فکر گویا پہلے زینہ پر رک جانے کا نام ہے۔ اس کے مقابلے میں اجتہادی فکر اگلے زینوں کو طے کرتے ہوئے اوپر کی منزل تک پہنچ جانا ہے۔ پہلا زینہ اگر چہ ابتدا میں ہوتا ہے مگر اس کی اہمیت یہ ہے کہ اگر پہلا زینہ نہ ہو تو اگلے زینوں کا وجود بھی نہ ہوگا۔

مطالعۂ حدیث کے درجات

ابتدائی دور کے محدثین کا عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے حدیثوں کی جمع اور تدوین کا انتہائی مشکل کام انجام دیا۔ یہ گویا مطالعہ حدیث کا ابتدائی درجہ تھا۔ اس کے بعد اگلی نسل کا یہ کام ہے کہ وہ حدیثوں کا جامع انڈکس (Index) تیار کر کے حدیثوں سے علمی استفادے کو آسان بنا دے۔ اس کے بعد اس معاملے کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں احادیث کی جو تشریحات کی گئیں ان کو مرتب کیا جائے تا کہ ان احادیث کو سمجھنے کے لیے ابتدائی بیک گراؤنڈ معلوم ہو سکے۔

اس کے بعد اس معاملے کا چوتھا درجہ یہ ہے کہ ان احادیث کا مطالعہ زمانی حالات کے پس منظر میں کیا جائے تا کہ ان احادیث کا توسیعی مفہوم معلوم کیا جا سکے۔ احادیث کے توسیعی مفہوم سے کیا مراد ہے، اس کے چند نمونے اوپر کی مثالوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح اس معاملے کا پانچواں درجہ یہ ہوسکتا ہے کہ تمام صحیح احادیث کا مکمل انسائیکلو پیڈیا تیار کیا جائے، تا کہ جدید انسان کے لیے اس کے اپنے مانوس اسلوب میں حدیثوں کا مطالعہ ممکن ہو سکے، وغیرہ۔

حدیث کے مطالعے کے درجات جو یہاں بتائے گئے، وہ حتمی درجات نہیں ہیں۔ یہ مثالیں صرف اس مسئلہ کو بتانے کے لیے دی گئی ہیں کہ تقلیدی مطالعے کے مقابلے میں اجتہادی مطالعہ کا فرق کیا ہے اور اس سے انسان کو کیا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔

اجتہادی عمل کی اہمیت

اجتہاد محض ایک ذہنی مشغلہ نہیں، اجتہاد اہل اسلام کی ایک اہم ترین ضرورت ہے۔ اجتہادی عمل کے ذریعے اہل اسلام ہر زمانے میں اپنی دینی حیثیت کو از سرنو قائم کرتے رہتے ہیں۔ وہ بدلے ہوئے حالات میں اسلام کو از سرنو منطبق کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ

اسلام ایک ابدی مذہب ہے۔ وہ ہر آنے والے زمانے میں اتنا ہی مناسب (relevant) ہے جتنا کہ کسی قدیم زمانے میں۔ گویا کہ اجتہاد کا عمل اسلامی فکر کو مسلسل طور پر مطابق وقت (update) بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔

اجتہاد کیا ہے

اجتہاد سے مراد آزادانہ رائے قائم کرنا نہیں ہے۔ اجتہاد سے مراد یہ ہے کہ قرآن و سنّت جو اسلام کے اصل مصادر (sources) ہیں، ان پر غور کر کے قیاسی یا استنباطی طور پر شریعت کے نئے احکام معلوم کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتہاد بھی تقلید ہی کی ایک قسم ہے۔ عام مقلد فقہا کی تقلید کرتا ہے، اور مجتہد وہ ہے جو خدا اور رسول کی تقلید کرے اور قرآن و حدیث کے نصوص پر غور کر کے براہ راست طور پر احکام کا استنباط کرے۔

اجتہاد سے مراد وہی فکری عمل ہے جس کو قرآن میں استنباط (4:83) کہا گیا ہے۔ فقہا کی اصطلاح میں اس کا نام قیاس ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ اجتہاد سے مراد بالواسطہ اخذ احکام ہے، جب کہ براہ راست اخذ احکام کی صورت بظاہر موجود نہ ہو۔

استنباط کا لفظ نبط سے ماخوذ ہے۔ نبط کے لفظی معنی ہیں زمین کے اندر سے پانی کا نکلنا۔ اِسْتَنْبَطَ الْبِئْرَ کے معنی ہوتے ہیں کنواں کھود کر اس سے پانی نکالنا۔ اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ "اِسْتَنْبَطَ الْفَقِيهُ" یعنی فقیہ نے قرآن و حدیث پر غور کر کے اس کے پوشیدہ معنی کو نکالا۔

مفسر القرطبی نے لکھا ہے: الِاسْتِنْبَاطُ فِي اللُّغَةِ الِاسْتِخْرَاجُ، وَهُوَ يَدُلُّ عَلَى الِاجْتِهَادِ إِذَا عُدِمَ النص والإجماع (الجامع لأحکام القرآن، جلد 5، صفحہ 292)۔ یعنی، استنباط کے معنی استخراج کے ہیں۔ اس کا مطلب ہے نص اور اجماع کی غیر موجودگی میں اجتہاد کر کے شریعت کا حکم معلوم کرنا۔

فقہائے اسلام نے دوسری صدی ہجری میں اجتہاد کا یہی کام کیا۔ عباسی خلافت کے زمانے میں کثرت سے نئے مسائل پیدا ہوئے۔ ان مسائل کا براہ راست یا منصوص جواب بظاہر قرآن وسنّت میں موجود نہ تھا۔ اس وقت فقہائے اسلام نے اجتہاد کے ذریعے اس مسئلے کو حل کیا۔ انھوں نے قرآن وسنّت کے نصوص سے قیاس یا استنباط کے ذریعے نئے حالات کے لیے شرعی احکام معلوم کیے۔ اس اجتہاد کا یہ فائدہ تھا کہ اہل اسلام کے قافلے نے بدلے ہوئے حالات میں اپنے لیے شرعی رہنمائی پالی۔ تاریخ میں ان کا سفر کسی رکاوٹ کے بغیر مسلسل جاری رہا۔

مگر دوسری اور تیسری صدی ہجری کے بعد اہل اسلام کے درمیان بعض اسباب سے ایک غلط تصور قائم ہو گیا، وہ یہ کہ قرآن وسنّت سے براہ راست طور پر جو اجتہاد یا استنباط کرنا تھا وہ اس ابتدائی دور کے فقہا نے تکمیلی طور پر انجام دے دیا۔ اب براہ راست نصوص سے احکام اخذ کرنے کی ضرورت نہیں۔ بعد کے مسلمانوں کے لیے کرنے کا جو کام ہے وہ یہ ہے کہ وہ ان فقہا کی کتابوں کو پڑھیں اور ان پر غور کر کے بعد کے زمانوں کے لیے شرعی احکام معلوم کرتے رہیں۔ اس طرح اسلام کی علمی تاریخ میں عباسی دور کے فقہا کو مجتہد مطلق کا درجہ مل گیا اور بعد کے دور کے فقہا کو صرف مجتہد مقید کا۔ دورِ اوّل کے فقہا کا اجتہاد قرآن و سنّت پر مبنی ہوتا تھا مگر بعد کے علما کے لیے اجتہاد کا مطلب صرف یہ رہ گیا کہ وہ دور اوّل کے فقہا کے دائرہ میں محدود رہتے ہوئے اپنے لیے شرعی احکام کا تعین کریں۔

فکری المیہ

یہی وہ مقام ہے جہاں سے مسلمانوں کے فکری المیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس فکری موقف نے مسلمانوں کو ایک ٹھہرا ہوا قافلہ بنا دیا۔ امیر شکیب ارسلان (وفات 1946) نے اپنی کتاب ''لماذا تأخر المسلمون وتقدم غیرھم'' میں جو بحث چھیڑی تھی، اس کا اصل

جواب یہی ہے کہ زمانہ جدید میں مسلمانوں کے پچھڑے پن کا واحد سبب یہ تھا کہ ان کے درمیان اجتہاد کا عمل رک گیا۔

اجتہاد کوئی اختیاری عمل نہیں، وہ ایک ناگزیر فطری عمل ہے۔ ایسا نہیں کہ اجتہاد خواہ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتہاد کے عمل کو روکنا گویا فطرت کے عمل کو روکنا ہے، اور فطرت کے عمل کو روکنا صرف اس قیمت پر ہوتا ہے کہ خود روکنے والا اپنی ترقی کے سفر کو ختم کر دے۔

دریا کی زندگی اس کی روانی میں ہے۔ دریا کے جاری پانی کو اگر روک دیا جائے تو اس کے بعد وہ دریا نہ رہے گا بلکہ وہ ایک متعفن گڑھے میں تبدیل ہو جائے گا۔ اسی طرح کوئی گروہ اگر اپنے درمیان اجتہاد کے عمل کو روک دے تو اس کے اندر ایسا جمود پیدا ہوگا جو اس کے لیے ہر قسم کی ترقی کو ناممکن بنا دے گا، صرف مادی ترقی نہیں بلکہ خود مذہبی اور روحانی ترقی بھی۔

ازسرِ نو غور کرنے کی صلاحیت

مقلد انسان، عوامی مقولے کے مطابق، صرف لکیر کا فقیر ہوتا ہے۔ اس کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ کسی معاملے کا ازسرنو اندازہ (reassessment) کر سکے۔ وہ ایک ہی مانوس ڈگر پر چلتا رہتا ہے، خواہ عملاً وہ سراسر بےنتیجہ کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس اجتہادی مزاج رکھنے والا آدمی بار بار معاملات پر نظر ثانی کرتا ہے۔ وہ ماضی اور حال کا مطالعہ کر کے اپنے عمل کا نیا منصوبہ بناتا ہے۔ مقلد انسان اگر ماضی میں ہوتا ہے تو مجتہد انسان اس کے مقابلے میں مستقبل میں۔

اس کی ایک مثال برصغیر ہند کے حالات میں ملتی ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں جب ہندستان میں انگریزوں کا غلبہ ہوا تو اس زمانے کے مسلم رہنما صرف ایک ہی بات سوچ سکے۔ اور وہ انگریزوں سے مسلح ٹکراؤ تھا۔ دارالحرب اور جنگ وقتال کے قدیم

نظریات کے تحت ان کا جو ذہن بنا تھا وہ ان کو صرف ایک ہی سبق دیتا تھا اور وہ یہ کہ انگریزوں سے لڑ کر ان بیرونی دشمنوں کا خاتمہ کریں۔

اس مزاج کے تحت 1799ء میں سلطان ٹیپو انگریز کی فوجوں سے لڑ گئے۔ اگر چہ اس کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ وہ خود بھی ہلاک ہوئے اور ان کی وسیع سلطنت بھی ختم ہو گئی۔ انہیں نظریات کے تحت 1857ء میں مسلم رہنماؤں نے انگریزوں کے خلاف مسلح جنگ چھیڑ دی۔ یہ جنگ مختلف شکلوں میں نصف صدی سے زیادہ لمبی مدت تک جاری رہی۔ اس کا نتیجہ بھی معلوم طور پر مسلم رہنماؤں کی یک طرفہ تباہی کی صورت میں نکلا۔ اس خونیں جنگ کا کوئی بھی فائدہ نہ اسلام کو ملا اور نہ مسلمانوں کو۔

یہ ان لوگوں کی مثال تھی جنہوں نے انگریزوں کے معاملے کو مقلدانہ نظر سے دیکھا۔ تاہم ٹھیک اسی معاملے میں مجتہدانہ نظر کی ایک مثال بھی تاریخ میں موجود ہے۔ یہ سید محمد رشید رضا مصری (وفات 1935ء) کی مثال ہے۔ وہ 1912ء (1330ھ) میں مولانا شبلی نعمانی کی دعوت پر لکھنؤ آئے تھے تا کہ دار العلوم ندوۃ العلما کے اجلاس میں شرکت کر سکیں۔ اس کے بعد وہ دار العلوم دیوبند آئے جو اس وقت گویا انگریزوں کے خلاف تحریک کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس موقع پر دار العلوم دیوبند میں ایک خصوصی جلسہ ہوا۔ دار العلوم کی طرف سے مولانا انور شاہ کشمیری نے تقریر کی۔ اس کے بعد سید محمد رشید رضا نے جلسے کو خطاب کیا۔ انہوں نے اس موقع پر عربی زبان میں جو تقریر کی وہ دار العلوم دیوبند کی روداد (1330ھ) میں چھپی ہوئی موجود ہے۔ اس تقریر کا ایک حصہ یہ تھا:

”اسلام کی اشاعت کا دوسرا حصہ غیر مسلموں سے متعلق ہونا چاہیے۔ ہندستان میں صدہا قسم کے بت پرست ہیں، یہاں بتوں کو پوجنے والے، درختوں اور پتھروں کے پوجنے والے، چاند، سورج، ستاروں اور نہایت لغویات اور خرافات کو پوجنے والے بھی موجود ہیں۔ پس اگر ہمارے پاس دعاۃ اور مبلغین کی ایک مضبوط جماعت موجود ہو تو ان لوگوں میں اسلام کی

اشاعت اس قدر سرعت کے ساتھ ہوگی جو اس وقت ہمارے خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ ہمیں عیسائیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ کامیابی ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک خاص بات اور ہے جو ہر ایک دور اندیش مسلمان کی توجہ کے لائق ہے اور وہ یہ کہ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد غیر مسلموں کے مقابلے میں اس قدر کم ہے کہ ان کی ہستی کو اس ملک میں ہمیشہ معرض خطر میں سمجھنا چاہیے۔ انگریزی حکومت نے، جو عقل و عدل کی حکومت ہے، غیر مسلموں اور مسلمانوں کے درمیان موازنہ قائم کر رکھا ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ موازنہ کسی وقت ٹوٹ جائے تو آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ کیا نتیجہ ہوگا؟ غالباً مسلمانوں کا وہی حشر ہوگا جو اندلس میں ہوا تھا۔ اس لیے ایک جماعت ہم میں ایسی ہونی چاہیے جو ان شبہات کو رفع کرے جو اسلام پر عائد کیے جاتے ہیں۔ یہ شبہات جو موجودہ زمانے کے علوم وفنون کی بنا پر پیدا ہو گئے ہیں، ان کا دور کرنا بہت ضروری ہے۔ مگر ان شبہات کا رفع کرنا بغیر فلسفۂ جدید کی واقفیت کے ناممکن ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس داعی جماعت کے اشخاص فلسفۂ جدید کے اہم مسائل سے واقفیت رکھتے ہوں" (الجمعیۃ ویکلی، دہلی، 2 فروری، 1970ء، صفحہ 10)۔

سید محمد رشید رضا کی یہ تقریر مجتہدانہ بصیرت کی ایک مثال ہے۔ حالات کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کر کے انھوں نے پیشگی طور پر یہ جان لیا تھا کہ غیر منقسم ہندستان میں مسلم اقلیت اور غیر مسلم اکثریت کے درمیان بظاہر جو موازنہ (balance) قائم ہے وہ ایک تیسری طاقت (انگریز) کی موجودگی کی بنا پر ہے۔ اس تیسری طاقت کے ہٹتے ہی اس کا قائم کردہ موازنہ اچانک ٹوٹ جائے گا۔ اس کے بعد جو صورت حال پیدا ہوگی اور اس سے بالکل مختلف ہوگی جو 1992ء میں بظاہر دکھائی دے رہی تھی۔ گویا سیاسی آزادی کا آنا مسلمانوں کے لیے ایک نئے مسئلہ کا آنا ہوگا نہ کہ مسئلہ کا ختم ہونا۔

اس دوررس اندازے کی بنا پر سید رشید رضا نے ہندستان کے مسلم رہنماؤں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ میدان جنگ کے بجائے میدان دعوت میں سرگرم ہوں۔ وہ جنگی تیاری کے بجائے

علمی تیاری کریں تاکہ وقت کے تقاضوں کے مطابق مؤثر انداز میں دعوت وتبلیغ کا کام کرسکیں۔ مگراس وقت کے مسلم رہنما انگریز سے نفرت میں اتنا زیادہ گم تھے کہ وہ یہ سوچ ہی نہ سکے کہ انگریز کی موجودگی میں کوئی مثبت کام کرنا بھی ان کے لیے ممکن ہوسکتا ہے۔ ایک عظیم تاریخی امکان استعمال ہوئے بغیر ختم ہوگیا۔ اوراس کا سبب صرف اجتہادی بصیرت کا فقدان تھا۔ یہاں ہم اجتہادی تاخر کی چند مثالیں دیں گے جن سے اندازہ ہوگا کہ مقلدانہ فکر کو اختیار کرنے کے نتیجے میں مسلمان کس قسم کے نقصانات سے دوچار ہوئے۔ اجتہادی عمل کو موقوف کرنے کے نتیجے میں کس طرح وہ دورجدید میں ایک بچھڑا ہوا قافلہ بن کررہ گئے۔

فقہ کی تدوین دوراقتدار میں

اس حادثے کی جڑ یہ ہے کہ ہماری موجودہ فقہ خلافت عباسیہ کے زمانے میں مدوّن ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اہل اسلام کو عالمی دبدبہ حاصل تھا ان کو دنیا میں سب سے بڑی سیاسی طاقت کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس صورت حال کوایک شاعر نے اپنے ان الفاظ میں نظم کیا ہے:

ہمیں چھائے ہوئے تھے شرق سے تا غرب دنیا میں
نہ تھا پلہ کسی ملت کا دنیا میں گراں ہم سے

موجودہ فقہ اسی حاکمانہ دور میں مدوّن ہوئی، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے دور کا مزاج ان کے اندر داخل ہوگیا۔ یہ مدوّن فقہ ایک قسم کی حاکمانہ فقہ بن گئی۔

نمونہ موجود نہیں

میں نے ایک مشہور عالم اور مفکر کی تقریر سنی، یہ تقریر ہندستان کے ایک شہر میں ہوئی تھی۔ ان کی تقریر کا موضوع ''جدید دور میں اسلام'' تھا۔ تقریب کے آخر میں حاضرین میں سے ایک شخص نے سوال کیا کہ یہ بتائیے کہ ہندستان جیسے ملک میں ہمارے لیے شریعت میں کیا رہنمائی ہے۔ مذکورہ مسلم رہنما یہ سوال سن کر کچھ دیر خاموش رہے، اس کے بعد کہا

کہ اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے۔ کیوں کہ اسلامی شریعت میں طاقتور حالت (position of strength) کا ماڈل تو موجود ہے، مگر اسلام میں متواضع حالت (position of modesty) کا ماڈل موجود نہیں۔

میں عرصہ تک یہ سوچتا رہا کہ مذکورہ مسلم رہنما کو اسلامی شریعت میں متواضع حالت کا ماڈل کیوں نہیں ملا۔ آخر کار یہ سمجھ میں آیا کہ مذکورہ مسلم رہنما (دور جدید کے دوسرے مسلم رہنماؤں کی طرح) شریعت اسلام کے نام سے صرف مدوّن فقہ کو جانتے تھے، یعنی وہ فقہ جو اس وقت تیار ہوئی جب کہ اہل اسلام ہر اعتبار سے طاقت اور اقتدار کی حالت میں تھے۔ اس بنا پر اس زمانے میں بننے والی اسلامی فقہ شعوری یا غیر شعوری طور پر، گویا طاقتوروں کی فقہ ہو گئی۔ وہ طاقت اور اقتدار کی حالت کی نمائندگی کر رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جب مسلم رہنماؤں نے دیکھا کہ اب وہ مطلق اقتدار سے محروم ہو گئے ہیں تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی شریعت انہیں ان کی متواضع حالت کے لیے کوئی مثبت رہنمائی نہیں دے رہی ہے۔ اس بنا پر موجودہ زمانے میں انہیں اس کے سوا کوئی اور کام نظر نہ آیا کہ وہ اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے دوسروں سے لڑائی چھیڑ دیں۔

دور اقتدار میں مدوّن ہونے والی فقہ میں بلاشبہ یہ رہنمائی موجود نہ تھی مگر دور اوّل میں جو قرآن اترا وہ بلاشبہ ابدی تعلیمات پر مشتمل تھا۔ اس میں ہر حالت کے لیے رہنمائی موجود تھی، حتیٰ کہ اس حالت کے لیے بھی جس کو مذکورہ مسلم رہنما نے متواضع حالت سے تعبیر کیا ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو پیشگی طور پر یہ معلوم تھا کہ مسلمان ہمیشہ یکساں حالت پر نہیں رہیں ہے۔ ان کو کبھی ایک حالت سے سابقہ پیش آئے گا اور کبھی دوسری حالت سے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اگر تم کو کوئی زخم پہنچے تو دوسروں کو بھی ویسا ہی زخم پہنچا ہے اور ہم ان ایّام کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں، تا کہ اللہ ایمان لانے والوں کو جان لے اور تم میں سے کچھ لوگوں کو گواہ بنائے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا (3:140)۔

پیغمبر اسلام ﷺ پر یہ دونوں حالتیں گزریں۔ آپ کا مکی دور گویا آپ کے لیے متواضع حالت کا دور تھا اور آپ کا مدنی دور گویا آپ کے لیے طاقتور حالت کا دور۔ یہ دونوں حالتیں یکساں طور پر مطلوب حالتیں ہیں، اور دونوں حالتوں کے لیے پیغمبر کی سیرت میں یکساں نمونہ موجود ہے۔ دونوں نمونوں میں سے کوئی نمونہ نہ کمتر نمونہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی برتر نمونہ۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں سارا فیصلہ داخلی نیت پر ہوتا ہے نہ کہ خارجی اعتبار سے سیاسی یا غیر سیاسی حالت پر۔

شتم رسول کا مسئلہ

اس معاملے کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجیے۔ تمام فقہا اس پر متفق ہیں کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ پر شتم کرے، خواہ وہ اشارتاً ہی کیوں نہ ہو، اس کی لازمی سزا قتل ہے۔ شاتم رسول کو بطور حد قتل کیا جائے گا (يُقْتَلُ حَدًّا) اس معاملے میں بہت کم کسی قابل ذکر فقیہ کا استثناء پایا جاسکتا ہے۔ اس حکم کی تفصیل کے لیے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ کیجیے:

1۔ الصارم المسلول علی شاتم الرسول، ابن تیمیه

2۔ السیف المسلول علیٰ من سب الرسول، تقی الدین ابو الحسن علی السبكي

3۔ تنبیه الولاة والحكام على أحكام شاتم خير الأنام أو احد اصحابه الكرام، ابن عابدين الشامي

اس مسئلہ پر جب بھی کوئی شخص کوئی مضمون یا کتاب لکھتا ہے تو وہ ہمیشہ یہی کرتا ہے کہ ان فقہا کا حوالہ دے کر یہ ثابت کرتا ہے کہ شتم رسول کی سزا اسلام میں قتل ہے، اور یہ کہ یہ ایک ایسا متفق علیہ مسئلہ ہے جس پر شاید کسی فقیہ کا کوئی اختلاف نہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر شریعت کا مسئلہ یہی ہے کہ شاتم رسول کو لازماً بطور حد قتل کیا جائے تو یہ مسئلہ دور اوّل کے اسلام میں کیوں موجود نہ تھا۔ اسلام کے ابتدائی دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس زمانے میں بہت سے ایسے افراد موجود تھے جو شتم رسول کا فعل کر رہے تھے، مگر انہیں قتل نہیں کیا گیا۔

اس سلسلے میں ایک انتہائی واضح مثال مدینہ کے عبداللہ بن ابی ابن سلول کی ہے۔ وہ ایک کھلا ہوا شاتم رسول تھا۔ وہ رات دن شتم رسول کے کام میں مشغول رہتا تھا۔ اس کا شاتم ہونا غیر مشتبہ طور پر ثابت تھا۔ پھر بھی لوگوں کے اصرار کے باوجود، رسول اللہ ﷺ نے اس کے قتل کا حکم نہیں دیا یہاں تک کہ وہ اپنی طبعی موت مرا۔ اس عدم قتل کا سبب کیا تھا۔ علامہ ابن تیمیہ (وفات 827ھ) نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ — وَإِنَّمَا تَرَكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَتْلَهُ لِمَا خِيفَ فِي قَتْلِهِ مِنْ نُفُورِ النَّاسِ عَنِ الْإِسْلَامِ لَمَّا كَانَ ضَعِيفًا (الصارم المسلول علی شاتم الرسول، 179)۔ یعنی رسول اللہ ﷺ صرف اس لیے اس کے قتل سے باز رہے کیوں کہ یہ اندیشہ تھا کہ اس کے قتل سے لوگ اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے، کیوں کہ (اس وقت) اسلام ضعیف تھا۔ دور اوّل کے زمانے میں اور عباسی خلافت کے زمانے میں بننے والی فقہ کے درمیان یہ فرق کیوں۔

جیسا کہ معلوم ہے، فروری 1989ء میں ایران کے آیت اللہ خمینی نے یہ فتویٰ دیا کہ سلمان رشدی نے اپنی کتاب سیٹ ینک ورسیز (Satanic Verses) کے ذریعہ پیغمبر اسلام کی توہین کی ہے۔ اس لیے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس کو قتل کر دیں۔ یہ فتویٰ جب چھپا تو غالباً راقم الحروف کے واحد استثناء کو چھوڑ کر دنیا بھر کے تمام مسلمانوں نے اس فتویٰ کی تائید کی۔ اس کی حمایت میں زبردست مظاہرے ہوئے۔ مگر مسلمانوں کی عالمی تائید کے باوجود سلمان رشدی کو قتل کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ مزید یہ کہ قتل کے اس فتویٰ اور مسلمانوں کی طرف سے اس کی حمایت کے نتیجے میں اسلام ساری دنیا میں بدنام ہو گیا۔ اور اس کی تصویر یہ بن گئی کہ اسلام خدانخواستہ ایک وحشیانہ مذہب ہے۔

موجودہ زمانے میں آزادیِ رائے کو انسان کا سب سے بڑا حق سمجھا جاتا ہے۔ یہ گویا ان کا مذہب ہے۔ اس بنا پر پوری جدید دنیا نے اس فتویٰ کو اپنے مذہب (آزادی) پر براہِ راست حملہ سمجھا۔ یہ لوگ پوری طاقت کے ساتھ رشدی کے دفاع پر آ گئے۔ اس کے

ساتھ جدید میڈیا نے اس معاملے کو اتنا پھیلایا کہ اس کی خبر ساری دنیا کے تمام انسانوں تک پہنچ گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس اندیشہ کی بنا پر مدینہ کے عبد اللہ بن ابی کے قتل سے پرہیز کیا وہ اندیشہ سلمان رشدی کے خلاف قتل کے فتویٰ کے نتیجے میں ہزار گنا زیادہ بڑے پیمانے پر اہل اسلام کے لیے پیش آ گیا۔

اب ان دو متقابل نظیروں پر غور کیجیے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی نظیر بتاتی ہے کہ شتم رسول کے معاملے میں، خواہ وہ کتنے ہی زیادہ بڑے پیمانے پر ہو، یہ دیکھا جائے گا کہ شاتم کو اگر قتل کیا جائے تو اس کا عملی نتیجہ کیا نکلے گا۔ اگر حالات پر اہل اسلام کا اتنا کنٹرول نہ ہو کہ وہ قتل کے منفی نتائج کو روک سکیں تو اہل اسلام قتل کا اقدام نہیں کریں گے۔ وہ اس معاملے کو اللہ کے حوالہ کر دیں گے۔ اس کے برعکس، فقہا کی مثال بتاتی ہے کہ جب کوئی شخص شتم کا فعل کرے تو اس کو فوراً قتل کر دیا جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیوں ایسا ہوا کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کی نظیر سے اپنے لیے ہدایت نہیں لی۔ ان کی نظر فقہا کے مسلک پر اٹک کر رہ گئی۔ فقہا کی پیروی میں متحد ہو کر وہ قتل شاتم کے علم بردار بن گئے۔

اس سوال کا جواب تقلید ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلمان متفقہ طور پر یہ رائے بنا چکے تھے کہ اب امت کے لیے براہ راست قرآن وسنّت سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ اب صرف اجتہاد مقید ہی کا دروازہ ان کے لیے کھلا ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اب مسلمان براہ راست قرآن اور سنّت سے مسائل اخذ نہیں کر سکتے۔ اب ان کے لیے صرف ایک ہی ممکن صورت ہے، اور وہ یہ کہ وہ فقہا کے فتوؤں کو جانیں اور پورے تقلیدی جذبہ کے ساتھ اس پر قائم ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے رشدی کے معاملے میں یہی کیا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، موجودہ فقہ کی تدوین اس وقت ہوئی جب کہ اہل اسلام کو مکمل اقتدار حاصل تھا۔ ان کو حالات پر اتنا زیادہ کنٹرول تھا کہ کسی قوم کی طرف سے اگر باغیانہ

روش کا اندیشہ ہوتا تو خلیفہ صرف دھمکی کا ایک خط لکھتا اور باغی گروہ پست ہمت ہو کر خاموش ہو جاتا۔ اسی قسم کے ایک واقعہ پر عربی شاعر نے یہ پرفخر شعر کہا تھا:

إِذَا مَا أَرْسَلَ الْأُمَرَاءُ جَيْشًا إِلَى الْأَعْدَاءِ أَرْسَلْنَا الْكِتَابَا

مگر موجودہ زمانے میں حالات بدل چکے تھے۔ اب اہل اسلام کو پہلے کی طرح حالات پر کنٹرول حاصل نہ تھا۔ مزید یہ کہ ان کے لیے بہت سے ناموافق حالات پیدا ہو چکے تھے۔ مثلاً آزادی کا موجودہ زمانے میں خیر اعلیٰ (summum bonum) کی حیثیت اختیار کر لینا اور اظہار رائے کی آزادی کو مقدس حق کے طور پر مان لیا جانا۔ اسی طرح جدید میڈیا کا ظہور میں آنا جو گویا گرم خبر (hot-news) کی عالمی ایجنسی ہے، وغیرہ۔

انھی نئے حالات کا یہ نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی عالمی حمایت کے باوجود سلمان رشدی کو قتل کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ مزید یہ ناقابل تلافی نقصان ہوا کہ اسلام ساری دنیا میں بدنام ہو گیا۔ جدید انسان کی نظر میں اسلام کی یہ تصویر بن گئی کہ اسلام خدانخواستہ دہشت گردی کا مذہب ہے، وہ اپنے پیروؤں کو مذہبی جنون (fanaticism) کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ نتیجہ تھا بدلے ہوئے زمانے میں حاکمانہ دور کی فقہ کو نافذ کرنے کا۔

سلمان رشدی کے معاملے میں موجودہ زمانے کے مسلمان اگر اجتہاد مطلق کا طریقہ اختیار کرتے تو وہ اس معاملے میں براہ راست قرآن وسنّت سے روشنی حاصل کرتے اور پھر انہیں معلوم ہو جاتا کہ اس مسئلہ کا حل قتل کا فتویٰ نہیں ہے بلکہ ردّعمل سے بچتے ہوئے پُرامن دائرہ میں اپنی دعوتی کوشش کرنا ہے۔ مگر چونکہ وہ اپنے مقلدانہ ذہن کی بنا پر دور اقتدار میں بننے والی فقہ کے اندر اٹکے ہوئے تھے اس لیے ان کو وہی حاکمانہ مسئلہ نظر آیا جو فقہ کی ان کتابوں میں لکھا ہوا تھا، یعنی: الشَّاتِم یُقتل حداً۔

امن کی طاقت

جدید صنعتی انقلاب کے بعد جب نوآبادیاتی دور آیا اور مغربی قومیں تمام دنیا میں سیاسی

اور تہذیبی اعتبار سے غالب آ گئیں تو یہ مسلمانوں کے لیے ایک نیا مسئلہ تھا۔ ساری مسلم دنیا میں کثرت سے مسلم لیڈر پیدا ہوئے۔ ان تمام لیڈروں کا مشترک ذہن یہ تھا کہ: اَلْجِهَادُ هُوَ الْحَلُّ الْوَحِيدُ (جہاد ہی واحد حل ہے)۔ مگر تقریباً دو سو سال کی غیر معمولی جدو جہد اور قربانی کے باوجود اس مسلح جہاد کا کوئی مثبت فائدہ مسلمانوں کو نہیں ملا۔ اس مسئلہ پر اگر قرآن وحدیث کی روشنی میں غور کیا جائے تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حل پرامن دعوت ہے۔ قرآن میں اس طرح کی صورتحال میں پیغمبر کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ تم اللہ کی دی ہوئی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچاؤ۔ یہ عمل تمہارے لیے حفاظت کا ضامن ہوگا (5:67)۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حکمت کے ساتھ دعوت وتبلیغ کا کام کرو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو تمہارا دشمن ہے وہ تمہارا دوست بن جائے گا (41:34)۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قرآن اپنی خاموش زبان میں پکار کر یہ کہہ رہا تھا کہ: اَلدَّعْوَةُ هِيَ الْحَلُّ الْوَحِيدُ (دعوت ہی واحد حل ہے)۔ اس کے باوجود کیوں ایسا ہوا کہ دور جدید کے مسلمان قرآن کے اس واضح بیان میں ہدایت نہ پا سکے۔ وہ دعوت کے بجائے جہاد (بمعنی قتال) کے میدان میں سرگرم ہو گئے۔ جب کہ حالات کے اعتبار سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ اس قسم کے متشددانہ اقدام کا نتیجہ مزید تباہی کے سوا کچھ اور نکلنے والا نہیں۔

پھر موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں سے یہ بھیانک غلطی کیوں ہوئی کہ انہوں نے اَلْجِهَادُ هُوَ الْحَلُّ الْوَحِيدُ کا غیر قرآنی نظریہ قائم کرلیا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اجتہاد مطلق یعنی قرآن وسنّت سے براہ راست اخذِ احکام کو اپنے لیے ممنوع قرار دے چکے تھے۔ وہ اپنے مقلدانہ ذہن کی بنا پر صرف یہ جانتے تھے کہ موجودہ مدوّن فقہ سے اپنے لیے احکام حاصل کرتے رہیں۔

اب صورت حال یہ تھی کہ فقہ کی یہ کتابیں جہاد وقتال کے احکام سے بھری ہوئی تھیں۔ ہر فقہی کتاب میں اس کے احکام موجود تھے۔ دوسری طرف فقہ کی ان کتابوں کا حال یہ تھا کہ وہ دعوت الی اللہ کے مسائل واحکام سے یکسر خالی تھیں۔ ان میں کتاب الجہاد تو تفصیلی طور

پر موجود تھا مگر کتاب الدعوۃ یا کتاب التبلیغ سرے سے وہاں موجود ہی نہ تھا۔ دعوت کا حکم وہ قرآن میں پا سکتے تھے مگر قرآن کو انہوں نے ماخذ احکام کی حیثیت سے چھوڑ رکھا تھا۔ وہ اخذ احکام کا ذریعہ صرف فقہ کو سمجھتے تھے، اور کتب فقہ کے صفحات دعوتی رہنمائی سے بالکل خالی تھے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اجتہاد، بالفاظ دیگر، قرآن وسنّت سے براہ راست احکام اخذ کرنا کتنا زیادہ مفید ہے اور تقلید، بالفاظ دیگر، مدوّن فقہ کو احکام اخذ کرنے کا واحد ذریعہ سمجھ لینا، کتنا زیادہ نقصان دہ ہے۔

یہی غلطی برصغیر ہند کے مسلم رہنماؤں سے اس وقت ہوئی جب کہ انگریزوں کے غلبے کے بعد انہوں نے ہندستان کے دارالحرب ہونے کا اعلان کیا۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے 1823 میں یہ فتویٰ دیا کہ ہندستان دارالحرب ہو چکا ہے (فتاویٰ عزیزی فارسی، دہلی، 1322ھ، صفحہ 17)۔ اس کے بعد پانچ سو علما نے اپنے مشترک دستخطوں سے یہ فتویٰ جاری کیا کہ مسلمانوں پر جہاد فرض ہو چکا ہے۔ مسلمانان ہند کو چاہیے کہ وہ انگریزوں کے خلاف جہاد (قتال) کا آغاز کردیں۔

مسلم رہنماؤں کے ان فتووں اور اپیلوں کے بعد ہندستان کے مسلمان ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر انگریزوں کے خلاف مسلح جہاد میں مشغول ہو گئے۔ سو سالہ جنگ کے باوجود یہ جہاد عملاً سراسر بے نتیجہ ثابت ہوا۔ مگر عجیب بات ہے کہ آج بھی یہ مسلمان اعلان کے ساتھ یا بلا اعلان یہی سمجھتے ہیں کہ ہندستان دارالحرب ہے اور انہیں جہاد کے ذریعہ اپنے مسائل کو حل کرنا چاہیے۔

یہ عجیب وغریب صورت حال کیوں ہے، اس کا سبب یقینی طور پر یہی ہے کہ اجتہاد اور تقلید کے بارے میں اپنے مذکورہ مقلدانہ مسلک کی بنیاد پر ان کا ذہن بعد کو مدوّن ہونے والی فقہ میں اٹکا ہوا ہے۔ اور اس فقہ میں ملکوں کی جو تعریف وتقسیم کی گئی ہے، اس کے مطابق ہندستان جیسا ملک دارالحرب ہی قرار پاتا ہے۔

یہ مسلم رہنما اگر فقہ اور فقہا کے درمیانی دور سے پیچھے جاتے اور قرآن وسنّت کی روشنی میں یہ سمجھنے کی کوشش کرتے کہ ہندستان کی شرعی حیثیت کیا ہے تو یقینی طور پر وہ جان لیتے کہ موجودہ ہندستان ان کے لیے دارالدعوۃ کی حیثیت رکھتا ہے، جیسا کہ دوراوّل میں اس قسم کے تمام علاقے اہل اسلام کے لیے دارالدعوۃ کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر اجتہاد (براہ راست قرآن وسنّت سے مسئلہ اخذ کرنا) ان کے لیے امر ممنوع بنا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے مقلدانہ ذہن کی بنا پر صرف مدوّن فقہ پر انحصار کیا۔ اور جیسا کہ معلوم ہے، موجودہ مدوّن فقہ میں صرف دارالحرب کا باب ہے، اس میں دارالدعوۃ کا تصور سرے سے موجود ہی نہیں۔

موجودہ فقہ کافی نہیں

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں جو فقہ مدوّن ہوئی اس کے بارے میں بعد کو مسلمانوں کا یہ عمومی عقیدہ ہو گیا کہ یہ ایک مکمل فقہ ہے۔ انسانی زندگی سے متعلق قرآن وحدیث کی تمام تعلیمات مفصل اور مکمل طور پر اس میں شامل ہیں۔ یہ عقیدہ اس نظریہ کو حق بجانب ثابت کرتا تھا کہ فقہ کی تدوین کے بعد اب اجتہاد مطلق کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اب صرف اجتہاد مقید (یا مقلدانہ اجتہاد) کا دروازہ مسلمانوں کے لیے کھلا ہوا ہے۔

یہ عقیدہ قدیم زمانے میں بظاہر درست تھا مگر جب حالات بدلے، خاص طور پر جب روایتی دور ختم ہوا اور جدید سائنسی دور آیا تو یہ عقیدہ مسلمانوں کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہوا۔ مسلمان اپنے تصور کے مطابق، فقہ کو مکمل قانونی نظام سمجھ بیٹھے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں اپنے مسائل کے لیے مدوّن فقہ سے باہر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس بنا پر دور جدید کے مسلمان بہت سی ان قیمتی ہدایات سے محروم ہو گئے جو قرآن وسنّت میں تو موجود تھیں مگر مدوّن فقہ میں ان کو جگہ نہیں ملی تھی۔ چند مثالوں سے اس معاملے کی وضاحت ہوتی ہے۔

موجودہ زمانے میں جو سیاسی انقلاب آیا اس کے نتیجے میں ایک نیا سیاسی نظام پیدا ہوا

جس کو جمہوریت (democracy) کہا جاتا ہے۔ ہماری موجودہ فقہ اس سے پہلے بادشاہت کے دور میں بنی۔ اس لیے اس میں جدید جمہوریت کا کوئی تصور شامل نہ تھا۔ چنانچہ مدوّن فقہ کے ڈھانچے میں سوچنے والے اس کی اہمیت کو سمجھ نہیں سکے۔ کسی نے اس کو لادینی نظام قرار دے کر اس کو حرام بتایا۔ کسی نے اس کو صرف ''سرشماری'' سمجھا اور یہ کہہ کر اس کا مذاق اڑایا:

جمہوریت ایک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت مسلمانوں کے لیے ایک سیاسی نعمت کی حیثیت رکھتی تھی۔ قدیم بادشاہت کے برعکس جمہوریت شرکت اقتدار (power sharing) کے اصول پر مبنی ہے۔ جمہوری نظام مسلمانوں کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ حسن تدبیر سے ہر ملک میں سیاسی نفوذ حاصل کرسکیں۔ مگر مسلمان اجتہادی طرزِ فکر سے محرومی کی بنا پر ایسا نہ کرسکے۔ ان کے مقلدانہ ذہن نے یہ تو سوچا کہ وہ امریکہ جیسے ملک میں خلافت قائم کرنے کی تحریک چلائیں اور کیلی فورنیا کو خیلی فورنیا میں تبدیل کرنے کا مضحکہ خیز خواب دیکھیں۔ مگر ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ وہ شرکت اقتدار کے جدید اصول کو استعمال کرکے امریکہ میں اپنی سیاسی جگہ حاصل کریں۔

موجودہ زمانے میں مسلم فکر کی اس پس ماندگی کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے مجتہدانہ طرزِ فکر، بالفاظ دیگر مدوّن فقہ سے باہر آ کر، براہ راست قرآن وحدیث سے رہنمائی لینے کا دروازہ اپنے اوپر بند کرلیا۔ اگر یہ فکری حادثہ نہ پیش آتا اور وہ کھلے ذہن کے ساتھ قرآن میں تدبر کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ قرآن اس معاملے میں انہیں واضح رہنمائی دے رہا ہے۔

یہ رہنمائی قرآن کی سورۃ نمبر 12 میں موجود ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے پیغمبر یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ یہ بادشاہ

اگرچہ مشرک تھا اور مشرک ہی مرا، مگر اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر وہ اس کے لیے راضی ہو گیا کہ حضرت یوسف کو اپنے سیاسی نظام میں ایک با اختیار شریک کی حیثیت سے شامل کرے۔ حضرت یوسف اپنے ہم عصر بادشاہ کی اس پیش کش پر راضی ہو گئے اور اس کے سیاسی نظام میں ایک حکومتی عہدہ قبول کرلیا۔ یہ عہدہ بظاہر بادشاہ کے تحت وزیر غذا اور زراعت کا عہدہ تھا مگر عملاً وہ نائب سلطنت کا عہدہ تھا۔ کیوں کہ قدیم زراعتی دور میں کسی ملک کی تمام اقتصادی اور غیر اقتصادی سرگرمیاں زراعت (agriculture) پر مبنی ہوتی تھیں۔ اس لحاظ سے حضرت یوسف کو جو عہدہ ملا وہ گویا ملک کے سب سے زیادہ کلیدی عہدہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

دور جدید کے مسلمان اگر فقہی تقلید سے گزر کر براہ راست قرآن پر مجتہدانہ غور وفکر کرتے تو وہ جان لیتے کہ قرآن میں حضرت یوسف کا مذکورہ واقعہ ان کے لیے ایک عظیم پیغمبرانہ نظیر ہے۔ وہ انہیں یہ رہنمائی دیتا ہے کہ وہ جمہوریت کے نئے دور میں شرکت اقتدار کے اصول کو اپنے حق میں استعمال کریں اور یہ یقین رکھیں کہ ان کا ایسا کرنا پیغمبر کے اسوہ کے عین مطابق ہے۔

جدید امکانات کا استعمال

موجودہ زمانے کے مسلمان عجیب وغریب طور پر ایک استثنائی محرومی سے دوچار ہوئے ہیں۔ اس محرومی میں شاید کوئی بھی دوسری قوم یا دوسرا گروہ ان کا شریک نہیں۔ وہ ہے — دور جدید کے عظیم امکانات کو استعمال کرنے میں ناکام رہنا۔

موجودہ زمانے میں جن امکانات (opportunities) کا دروازہ انسان کے لیے کھلا، ان میں سے ایک نہایت قیمتی امکان وہ تھا جس کو آزادی (freedom) کہا جاتا ہے۔ فرانس کے انقلابی مفکر روسو نے اپنی کتاب معاہدۂ عمرانی (Social Contract) کا آغاز اس جملے سے کیا تھا: انسان آزاد پیدا ہوا تھا، مگر میں اس کو زنجیروں میں جکڑا ہوا

پاتا ہوں۔ یہ قول دورِ جدید کا کلمہ بن گیا۔ یہ تصور اتنا بڑھا کہ موجودہ زمانے میں مسلّمہ طور پر یہ مان لیا گیا کہ آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ ہر انسان کا یہ ناقابلِ تنسیخ حق ہے کہ وہ جس چیز کو درست سمجھتا ہے اس کو اختیار کرے اور اس کے مطابق عمل کرے۔ اس مطلق آزادی کو مقید کرنے والی صرف ایک چیز تھی، وہ یہ کہ آدمی اپنی آزادی کے استعمال میں جارح نہ بنے اور تشدّد کے بجائے پُرامن ذرائع سے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس کی وضاحت کے لیے دو متعلق قصے کا ذکر مفید ہوگا جو اس معاملے کو بخوبی طور پر واضح کرتا ہے۔

300 سال پہلے جب امریکہ انگریزوں کے سیاسی غلبے سے آزاد ہوا تو ایک امریکی شہری خوشی منانے کے لیے ایک سڑک پر نکلا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو زور زور سے ہلاتا ہوا جا رہا تھا۔ اس دوران اس کا ایک ہاتھ ایک راہ گیر کی ناک سے ٹکرا گیا۔ راہ گیر نے غصہ ہو کر کہا کہ یہ کیا نامعقول حرکت (What is this nonsense) ہے۔ امریکی شہری نے جواب دیا کہ اب امریکہ آزاد ہے، اب میں جو چاہوں کروں۔ راہ گیر نے نرمی کے ساتھ جواب دیا کہ بیشک تم آزاد ہو مگر تمہاری آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں سے میری ناک شروع ہوتی ہے:

Your freedom ends where my nose begins.

یہ قصہ آزادی کے جدید تصور کو نہایت خوبی کے ساتھ واضح کر رہا ہے۔ جدید دور انسان کو مکمل آزادی دیتا ہے، اس واحد شرط کے ساتھ کہ وہ دوسروں کے ساتھ تشدّد نہ کرے۔

مہاتما گاندھی جو اپنی مغربی تعلیم کے دوران اس حقیقت کو جان چکے تھے۔ انہوں نے اس کو ہندستان کی تحریک آزادی میں استعمال کیا۔ جیسا کہ معلوم ہے 1857 میں ہندستان کے مسلم رہنماؤں نے انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی کا آغاز کیا تھا۔ انہوں نے یہ تحریک پرتشدّد طریق کار کے اصول پر چلائی۔ 60 سال سے زیادہ لمبی مدت تک خونیں

جنگ کرنے کے باوجود یہ تحریک ناکام رہی۔ اس کے بعد 1919 میں مہاتما گاندھی نے اس تحریک کی قیادت سنبھالی۔ انہوں نے طریق کار کو بدل کر آزادی کی اس تحریک کو پر امن جدوجہد کے اصول پر چلایا۔ یہاں تک کہ 1947 میں ہندستان آزاد ہوگیا۔

اس فرق کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مسلم رہنما اپنے مقلدانہ فقہی ذہن کی بنا پر طریق کار کے نام سے صرف ایک ہی طریقے کو جانتے تھے اور وہ مسلح جہاد ہے۔ مدوّن فقہ کی تمام کتابیں پر امن جدوجہد (peaceful struggle) کے تصور سے خالی ہیں۔ یہ کتابیں صرف ایک ہی طریقے کا تعارف کراتی ہیں اور وہ پرتشدّد جدوجہد ہے۔ کیوں کہ یہ کتابیں اس دور میں لکھی گئیں جب کہ انسان طاقت کے نام سے صرف تلوار کو جانتا تھا۔ عربی کا ایک قدیم مقولہ ہے: جنگ کو جنگ کاٹتی ہے (اَلْحَرْبُ أَنْفَی لِلْحَرْبِ)۔ ایک فارسی شاعر نے اس قدیم تصور کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے — جو شخص تلوار مارتا ہے اسی کے نام کا سکہ چلتا ہے:

ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند

یہ عسکری طرز فکر موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں اس طرح سرایت کیے ہوئے ہے کہ شاید کوئی بھی مسلمان اس سے خالی نہیں مختلف شکلوں میں ہر جگہ اس کو دہرایا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر ایک فلسطینی ترانے کا ایک شعر یہ ہے کہ آؤ ہم لڑیں، آؤ ہم لڑیں۔ کیوں کہ لڑائی ہی کامیابی کا راستہ ہے:

هَلُمَّ نُقَاتِلْ، هَلُمَّ نُقَاتِلْ فَإِنَّ الْقِتَالَ سَبِيلُ الرَّشَادِ

قدیم فقہ پر مبنی یہ ذہنی ڈھانچہ (mental framework) اتنا زیادہ عام ہوا کہ نام نہاد جدید مفکرین بھی اس کے خول سے باہر نہ آسکے۔ مثلاً سید جمال الدین افغانی، سید قطب، ڈاکٹر اقبال، سید ابوالاعلیٰ مودودی، وغیرہ۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر موجودہ زمانے میں ہمارے رہنماؤں کی تمام قربانیاں رائگاں ہو کر رہ گئیں۔

موجودہ زمانے میں مسلّح طریق کار کے مقابلے میں پرامن طریق کار کس طرح زیادہ نتیجہ خیز ہے اس کا اندازہ مہاتما گاندھی کی ایک مثال سے ہوتا ہے۔ وہ ہندستان کی تحریک آزادی میں 1919 میں شریک ہوئے۔ اس وقت تک ہندستان کی تحریک آزادی تشدّد کے اصول پر چلائی جارہی تھی۔ برٹش حکومت اس تشدّد کو جوابی تشدّد سے کچل دیتی تھی۔ مہاتما گاندھی نے اچانک یہ اعلان کیا کہ ہم تشدّد کے بجائے عدم تشدّد کے اصول پر اپنی تحریک چلائیں گے۔ طریق کار کی اس تبدیلی نے برٹش حکومت کو بے بس کر دیا۔ کیوں کہ غیر متشدّدانہ تحریک آزادی کو کچلنے کے لیے اس کے پاس کوئی جواز باقی نہ رہا تھا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب مہاتما گاندھی نے تحریک آزادی کے لیڈر کی حیثیت سے نیا اعلان کیا تو ایک انگریز کلکٹر نے اپنے سکریٹریٹ کو یہ ٹیلی گرام بھیجا کہ براہ کرم یہ بتائیں کہ ایک شیر کو تشدّد کے بغیر کیسے ہلاک کیا جائے:

Kindly wire instructions how to kill a tiger non-violently.

خلاف زمانہ روش

موجودہ زمانے کے مسلم رہنما اور دانشور اپنے مقلدانہ فکر کی بنا پر ایک قسم کی خلاف زمانہ روش (anachronistic attitude) میں مبتلا ہو گئے۔ جن قدیم شخصیتوں کے وہ ذہنی مقلد بنے ہوئے تھے ان کے یہاں پُرامن طریق کار یا پُرامن جدو جہد کا تصور سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ یہ تصور قرآن وسنّت میں واضح طور پر موجود تھا مگر براہ راست قرآن و سنّت سے حکم اخذ کرنے کے لیے اجتہاد درکار تھا اور انھوں نے پہلے ہی اجتہاد کا دروازہ اس طرح بند کر دیا تھا کہ ایک صاحب کے بقول اب اس کی کنجی بھی گم ہو گئی تھی۔

قرآن میں فطرت کا ایک ابدی قانون ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: "الصُّلْحُ خَيْرٌ" (4:128)۔ یعنی ٹکراؤ کے طریقہ کے مقابلے میں مصالحانہ طریقہ زیادہ بہتر ہے۔ یہ واضح

طور پر تشدّد کے مقابلے میں عدم تشدّد کی اہمیت کی تعلیم ہے۔ اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إِنَّ اللّٰهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ، وَيُعْطِي عَلَى الرِّفْقِ مَا لَا يُعْطِي عَلَى الْعُنْفِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر، 2593)۔ یعنی، اللہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ متشددانہ طریق کار کے مقابلے میں پر امن طریق کار زیادہ نتیجہ خیز ہے۔

پر امن طریق کار (peaceful method) کے حق میں قرآن وسنّت میں اس قسم کی واضح تعلیمات موجود تھیں۔ مگر دور جدید کے مسلم رہنما اور دانشور اپنے مقلدانہ ذہن کی بنا پر ان کو دریافت نہ کر سکے، وہ تشدّد کی چٹان سے بے فائدہ طور پر اپنا سر ٹکراتے رہے اور بطور خود یہ سمجھتے رہے کہ وہ قربانی اور شہادت کی مثالیں قائم کر رہے ہیں۔

اس مقلدانہ ذہن نے موجودہ زمانے میں مسلمانوں کو بے شمار نقصانات پہنچائے اور فائدہ کچھ بھی نہیں دیا۔ مثال کے طور پر فلسطین کے عربوں کو اگر یہ راز معلوم ہوتا تو وہ 1948 کے بعد اپنی تباہ کن مسلح جدو جہد نہ چھیڑتے بلکہ وہ پر امن طریق کار کو استعمال کرتے ہوئے جدید امکانات سے فائدہ اٹھاتے۔ اس کے بعد فلسطین میں ان کو مزید اضافے کے ساتھ وہی پُر عظمت حیثیت حاصل ہو جاتی جو اسی اصول کو استعمال کر کے یہودیوں کو امریکہ میں حاصل ہوئی ہے۔

اسی طرح کشمیر کے مسلمان اگر اس قیمتی راز سے واقف ہوتے تو وہ کشمیر میں گن کلچر اور بم کلچر نہ چلاتے بلکہ اس کے بجائے وہ پیس کلچر چلاتے۔ وہ امن کے دائرے میں رہتے ہوئے جدید امکانات کو استعمال کرتے۔ اس کے بعد وہ نہ صرف کشمیر میں بلکہ پورے ہندستان میں ایسی باعظمت حیثیت حاصل کر لیتے جو نام نہاد آزاد کشمیر کے مقابلے میں ان کے حق میں 100 گنا زیادہ بہتر ہوتی۔ اسی طرح موجودہ زمانے کے مسلم رہنما جو مختلف مسلم ملکوں میں "لڑ کر اقتدار کی کنجی" چھیننے میں مشغول ہیں، اور اپنے ملکوں کو صرف تباہی میں

اضافے کا تحفہ دے رہے ہیں، وہ اگر پُرامن طریق کار کی اہمیت کو جانتے تو وہ اپنے ملکوں کو اب تک اسلامی چمنستان بنا چکے ہوتے۔ جیسا کہ سیکولرزم کا عقیدہ رکھنے والوں نے اس اصول کو استعمال کرتے ہوئے مختلف ملکوں میں انجام دیا ہے، مثال کے طور پر سنگاپور، وغیرہ۔

تقلیدی نظر اور اجتہادی نظر کا فرق

مولانا سید حسین احمد مدنی (وفات 1957ء) نے لکھا ہے کہ —''تاریخ بتاتی ہے کہ ہند میں جب مسلمان آئے تو عام طور سے اہل ہند بودھ مذہب رکھتے تھے اور چھوت چھات تو درکنار شادی بیاہ تک بخوشی کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اختلاط نے نہایت قوی تاثیر کی، خاندان کے خاندان مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد جب محمود غزنوی کا زمانہ آیا ہے تو ہندوؤں میں مختلف احوال کی وجہ سے اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ اور شنکر اچاریہ لوگوں کو بدھ مذہب سے نکال کر پھر برہمنی مذہب کو اختیار کروانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور پھر برہمنی مذہب سارے ملک میں پھیل جاتا ہے۔ برہمن چونکہ دیکھ رہے تھے کہ اسلام کا سیلاب اختلاط کی بنا پر ان کے مذہب کو مٹا رہا ہے۔ اس لیے انہوں نے عوام میں نفرت کا پروپیگنڈہ پھیلایا اور مسلمانوں کو ملیچھ کا خطاب دیا۔ اکبر نے اس تفریقی خیال اور اس عقیدہ کو جڑ سے اکھاڑنا چاہا۔ اگر اکبر کی جاری کردہ پالیسی جاری رہنے پاتی تو ضرور بالضرور برہمنوں کی یہ چال مدفون ہو جاتی۔ اور اسلام کے دلدادہ آج ہندستان میں اکثریت میں ہوتے۔ اکبر نے عام ہندو ذہنیت اور منافرت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ اکبر نے (اپنی کم علمی کے باعث) نفس دین اسلام میں بھی کچھ غلطیاں کیں، جن سے مسلم طبقے میں اس سے بدظنی ہوئی، اگرچہ بہت سے بدظنی کرنے والے غافل اور کم سمجھ تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے، صلح حدیبیہ ہی فتح مکہ اور فتح عرب کا پیش خیمہ ہے۔ جس روز صلح حدیبیہ تمام کو پہنچی ہے اسی روز اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا (48:1) کی آیت نازل ہوئی۔ آپس میں اختلاط کا ہونا، نفرت میں

کمی آنا، مسلمانوں کے اخلاق اور ان کی تعلیمات کا معائنہ کرنا، دلوں سے ہٹ دھرمی اور ضد کا اٹھ جانا، یہی امور تھے جنہوں نے قریش کو کھینچ کھینچ کر صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان بناتے ہوئے مکہ سے مدینہ پہنچادیا۔ الغرض اختلاط باعث عدم تنافر ہے اور وہ اقوام کو اسلام کی طرف لانے والا ہے اور تنافر باعث ضد اور عدم اطلاع علی المحاسن ہے۔ اور وہ اسلامی ترقی میں سدِّ راہ ہونے والا ہے۔ چونکہ اسلام تبلیغی مذہب ہے۔ اس لیے اس کا فریضہ ہے کہ جس قدر ہو سکے غیر کو اپنے میں شامل کرے نہ یہ کہ ان کو دور کرے۔ اس لیے اگر ہمسایہ قومیں ہم سے نفرت کریں تو ہم کو ان کے ساتھ نفرت نہ کرنا چاہیے۔ اگر وہ ہم کو نجس اور ملیچھ کہیں تو ہم کو انہیں یہ نہ کہنا چاہیے۔ اگر وہ ہم سے چھوت چھات کریں تو ہم کو ان سے ایسا نہ کرنا چاہیے۔ وہ ہم سے ظالمانہ برتاؤ کریں تو ہم کو ان کے ساتھ ظالمانہ اور غیر منصفانہ برتاؤ نہ کرنا چاہیے"۔ (مکتوبات شیخ الاسلام، جلد 1، مکتوب نمبر 63، مطبوعہ مکتبہ دینیہ، دیوبند، صفحہ 146-141)۔

مولانا سید حسین احمد مدنی کے اس بیان پر غور کیجیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقلدانہ نظر کس طرح چیزوں کو صرف ان کے ظاہر (face value) پر لیتی ہے، اور مجتہدانہ نظر کس طرح چھپی ہوئی حقیقتوں تک پہنچ جاتی ہے۔ مغل بادشاہ اکبر اگرچہ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھا مگر وہ بے حد ذہین تھا۔ اس نے اس راز کو سمجھا کہ اسلام اپنی فطری کشش کی بنا پر ہر انسان کو اپیل کرتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان ضد اور نفرت کی فضا نہ پائی جارہی ہو۔ اس نے مزید اس حقیقت کو سمجھا کہ برہمنوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوری پیدا کر کے اسلام کی اشاعت کو مصنوعی طور پر روک دیا ہے۔ اس دریافت کی بنا پر اکبر نے یہ کیا کہ اس نے کچھ بے ضرر ہندو رسموں کو اپنے دربار میں رائج کر دیا۔ اکبر کی یہ روش ہندو مذہب کو اپنانے کے لیے نہ تھی بلکہ وہ صرف تالیف قلب کے لیے تھی۔ اس کا اصل مقصد اسلام کی اشاعت میں پیدا ہونے والی رکاوٹوں کو دور کرنا تھا۔

لیکن اکبر کے کچھ معاصر علما اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ ان کی نگاہ صرف اکبر کے گیروے

کپڑے کو دیکھ سکی۔ اکبر نے جس گہری پالیسی کے تحت وقتی طور پر گیروے کپڑے کو اختیار کیا تھا اس حکمت کو سمجھنے سے وہ قاصر رہے۔ انہوں نے اکبر کے خلاف اتنا طوفان اٹھایا کہ اکبر کا منصوبہ اپنی تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ اس معاملے کو غلط رنگ دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستانی تاریخ کا سفر اسلام کی موافقت میں جاری ہونے کے بجائے اسلام کے خلاف جاری ہو گیا۔ مولانا سید حسین احمد مدنی نے اس معاملے پر جو تبصرہ کیا ہے وہ مجتہدانہ نظر کی ایک واضح مثال ہے۔ وہ اپنی مجتہدانہ بصیرت کی بنا پر اس راز کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ معتدل حالات میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اختلاط ہمیشہ اسلام کی اشاعت کی صورت میں ظاہر ہو گا۔ چھری اور خربوزہ کے درمیان اگر ٹکراؤ ہو تو جیت ہمیشہ چھری کی ہو گی۔ خواہ چھری کو خربوزہ کے اوپر رکھا گیا ہو یا خربوزہ کے نیچے، حتّٰی کہ اس وقت بھی جب کہ چھری نے بظاہر اپنے آپ کو خربوزہ کے رنگ میں رنگ لیا ہو۔

تنقید اور اجتہاد

تنقید اور تقلید دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جہاں تقلید ہو گی وہاں تنقید نہیں ہو گی۔ اور جہاں تنقید ہو گی وہاں تقلید نہیں ہو گی۔ اجتہاد کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اجتہاد لازمی طور پر تنقید چاہتا ہے۔ جہاں تنقید کا ماحول نہ ہو وہاں بھی اجتہاد کا عمل جاری نہیں ہو سکتا۔

تاہم تنقید کو تنقید ہونا چاہیے نہ کہ تنقیص۔ تنقید علمی اور منطقی تجزیہ کا نام ہے۔ اس کے برعکس تنقیص کا سارا انحصار عیب جوئی اور الزام تراشی پر ہوتا ہے۔ تنقید اگر تنقیص کی صورت اختیار کر لے تو وہ سب وشتم ہو گا نہ کہ حقیقی معنوں میں تنقید۔

مثال کے طور پر صلیبی جنگوں کے بعد مسیحی پادریوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کتابیں لکھیں۔ انہوں نے عربوں کی تصویر یہ بنائی کہ وہ ایک وحشی قوم ہیں۔ اس کا ایک ثبوت ان کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ دوسرے اسلامی خلیفہ عمر فاروق نے جب مصر

فتح کیا تو اس وقت وہاں کے شہر اسکندریہ میں ایک بڑا کتب خانہ تھا۔ خلیفۂ اسلام کے حکم سے یہ پورا کتب خانہ جلا دیا گیا۔ اس کی تمام قیمتی کتابیں تباہ ہوگئیں۔

اس معاملے میں مسیحی پادریوں کے جواب کی ایک صورت یہ تھی کہ یہ کہا جائے کہ یہ لوگ اسلام کے دشمن ہیں۔ وہ صلیبی جنگوں میں شکست کا بدلہ لے رہے ہیں۔ انہوں نے سازش کے تحت کتب خانہ جلانے کی یہ کہانی بنائی ہے، وغیرہ۔ اس قسم کی باتیں تنقید نہیں ہیں بلکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہ صرف سب وشتم ہیں۔ اس طرح کی باتیں مسیحی پادریوں کے الزام کا علمی جواب نہیں۔

مگر بعد کو بعض اہل علم نے اس معاملے کی تحقیق کی اور خالص تاریخی شواہد کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ یہ دعویٰ سراسر بے بنیاد ہے کہ حضرت عمر فاروق کے حکم سے اسکندریہ کا کتب خانہ جلایا گیا۔ اصل یہ ہے کہ اسلامی فتح کے وقت یہ کتب خانہ سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ عربوں نے 642ء میں مصر کو فتح کیا۔

جب کہ اس سے بہت پہلے 48ء میں رومی حاکم جولیس سیزر کے حکم سے اسکندریہ کے اس کتب خانہ کو تباہ کیا جا چکا تھا۔ جواب کا یہ دوسرا طریقہ علمی تنقید کی مثال ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے فلپ کے ہٹی کی کتاب: ہسٹری آف دی عربس، صفحہ 166)۔

تنقید کوئی برائی نہیں، تنقید ذہنی ترقی (intellectual development) کا ذریعہ ہے۔ تنقیدی ماحول کے بغیر ذہنی ترقی کا عمل جاری نہیں ہوسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں ہمارے لیے جو انتخاب (choice) ہے وہ تنقید اور بے تنقید میں نہیں ہے بلکہ تنقید اور ذہنی جمود میں ہے۔ تنقید کو ختم کرنے کے بعد جو چیز ہمارے حصے میں آئے گی وہ ذہنی ارتقاء کا خاتمہ ہوگا نہ کہ سادہ طور پر صرف تنقید کا خاتمہ۔

اجتہاد کا عمل بحث و مباحثہ (discussion) کے درمیان جاری ہوتا ہے۔ اجتہاد دراصل معلوم سے نامعلوم تک پہنچنے کا دوسرا نام ہے۔ کچھ باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

کچھ مسائل ہوتے ہیں جن کا جواب ہمیں درکار ہوتا ہے۔ اب اگر کھلے اظہار خیال کا ماحول ہوتو ہر شخص آزادانہ طور پر اپنی رائے کو بیان کرے گا۔ اب افکار کا ٹکراؤ وجود میں آئے گا۔ اس طرح آزادانہ فکری تبادلہ کے دوران معاملہ کے نئے پہلو سامنے آئیں گے۔ اس کے بعد تنقیح کا عمل شروع ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ تحقیقی رائے سامنے آجائے گی جو ہماری فکری تلاش کا اصل مقصود تھی۔ اسی فکری عمل کا نام اجتہاد ہے۔

نظری اور عملی دونوں پہلوؤں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اجتہاد زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اجتہاد کسی گروہ کے لیے ترقی کا ضامن ہے۔ جس گروہ میں اجتہاد کا عمل رک جائے اس کے درمیان ترقی کا عمل بھی رک جائے گا۔ مگر اجتہاد کے عمل کو درست طور پر جاری ہونے کے لیے تنقید لازمی طور پر ضروری ہے۔ اجتہاد کا فائدہ انھیں لوگوں کو مل سکتا ہے جو تنقید کو گوارا کریں۔ جن لوگوں کے اندر یہ مزاج نہ ہو کہ وہ تنقید کو کھلے طور پر سنیں اور کھلے دل کے ساتھ اس کو قبول کرلیں ان کے حصہ میں کبھی وہ فکری خوش قسمتی نہیں آئے گی جس کو مجتہدانہ رائے قائم کرنا کہا جاتا ہے۔ اس معاملے کی وضاحت کے لیے یہاں دو متقابل مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

میدان بدر کا انتخاب

پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے میں 2ھ میں غزوۂ بدر پیش آیا۔ اس وقت آپ مدینہ میں تھے۔ آپ کو خبر ملی کہ قریش کا ایک لشکر مدینہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آپ نے اس کے مقابلے کے لیے ایک فوج تیار کی اور اس کو لے کر اس رخ پر روانہ ہوئے جدھر سے قریش کا لشکر آرہا تھا۔ بدر سے پہلے ایک مقام پر آپ نے اپنے اصحاب کے ساتھ پڑاؤ ڈالا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر دشمن آگے بڑھتا ہے تو اس مقام پر اس سے مقابلہ کیا جائے گا۔ اس وقت ایک صحابی خباب بن منذر اٹھے اور رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر کہا کہ اے اللہ کے رسول، یہ جگہ جہاں

آپ ٹھہرے ہیں یہ اللہ کے حکم سے ہے یا یہ ایک رائے ہے اور جنگی تدبیر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، یہ ایک رائے ہے اور جنگی تدبیر ہے۔ یہ سن کر صحابی نے کہا کہ پھر یہ تو کوئی پڑاوٴ ڈالنے کی جگہ نہیں: فَإِنَّ هٰذَا لَيْسَ بِمَنْزِلٍ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 259)۔

یہ واضح طور پر ایک اعتراض کا معاملہ تھا۔ مگر آپ نے اس اعتراض کو برا نہیں مانا بلکہ صحابی سے صرف یہ کہا کہ تمہاری یہ مخالف رائے کیوں ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی رائے کی وضاحت کی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے اور دشمن کے درمیان کئی پانی کے کنویں ہیں۔ اگر ہم یہاں ٹھہریں اور دشمن کو آگے بڑھنے کا موقع دیں تو سارے کنویں دشمن کے قبضہ میں آجائیں گے۔ اس لیے ہمیں یہ کرنا چاہیے کہ ہم یہاں سے چل کر آگے کے مقام پر ٹھہریں اور ان سارے کنووٴں پر اپنا قبضہ کرلیں۔ اس کے بعد یہ ہوگا کہ ہم پانی پئیں گے اور وہ لوگ پانی نہ پی سکیں گے (فَنَشْرَبُ وَلَا يَشْرَبُونَ)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سن کر کہا کہ تم نے بہت اچھی رائے دی: لَقَدْ أَشَرْتَ بِالرَّأْيِ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 259)۔

یہ پوری گفتگو انتہائی معتدل ماحول میں ہوئی۔ آخر کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رائے دینے والے کی رائے کو پسندیدگی کے ساتھ قبول فرمایا اور اس کے مطابق عمل کیا۔ اس کے بعد جو نتیجہ ہوا وہ یہ تھا کہ اہل اسلام کو اس مقابلے میں فیصلہ کن کامیابی حاصل ہوئی۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی معاملے میں صحیح رائے تک پہنچنے کے لیے آزادانہ اظہار خیال کا ماحول کتنا زیادہ ضروری ہے، اختلافی رایوں سے کس طرح معاملے کے نئے گوشے سامنے آتے ہیں جو صحیح رائے تک پہنچنے کے لیے بے حد مددگار ہیں۔ اس معاملے کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اختلاف رائے اگر بالفرض جارحانہ انداز میں ہو تب بھی اس کو خوش دلی کے ساتھ گوارا کرنا چاہیے۔

تنقید نہ سننے کا نقصان

سید احمد شہید بریلوی نے 1831ء میں مسلمانوں کی ایک فوج کے ساتھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف جہاد کیا۔ یہ واقعہ بالاکوٹ (پنجاب) میں پیش آیا۔ اس جنگ میں سید احمد شہید بریلوی اور ان کے اکثر ساتھی رنجیت سنگھ کی فوجوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ یہ پرجوش جہاد عملی اعتبار سے مکمل ناکامی پر ختم ہوا۔

سید احمد شہید بریلوی کی فوج میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو ان سے بیعت کیے ہوئے تھے۔ انھی میں سے ایک مولانا میر محبوب علی الدہلوی (وفات 1280ھ) تھے۔ وہ اپنے وقت کے ایک مشہور عالم تھے۔ وہ سید احمد شہید بریلوی کی فوج میں شریک ہوکر روانہ ہوئے۔ چارسدہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا گیا۔ یہاں پہنچ کر مولانا میر محبوب علی صاحب کو سید صاحب سے اختلاف ہو گیا۔

مولانا میر محبوب علی صاحب نے اپنی اس اختلاف کی روداد اپنی عربی کتاب ”تاریخ الائمۃ فی خلفاء الآمۃ“ میں درج کی ہے۔ یہ کتاب دہلی میں جامعہ ہمدرد (تغلق آباد) کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ میر محبوب علی صاحب نے چارسدہ کے مقام پر سید احمد شہید بریلوی سے خلوت میں ملاقات کی۔ انھوں نے سید صاحب سے پوچھا کہ آپ نے سکھوں کے خلاف جہاد کا یہ اقدام کس بنیاد پر کیا ہے۔ سید صاحب نے بتایا کہ کشف اور خواب کی بنیاد پر۔ میر محبوب علی صاحب نے کہا کہ جہاد کا فیصلہ کشف اور خواب کی بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن میں ہے کہ — وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (42:38)۔ یعنی، وہ اپنا کام آپس کے مشورے سے کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ جہاد کا فیصلہ مشورہ کے ذریعہ کیا کرتے تھے۔ آپ کو بھی مشورہ کرنا چاہیے اور اقدام سے پہلے اس معاملے کی پوری تحقیق کرنا چاہیے۔

مگر سید احمد شہید بریلوی نے میر محبوب علی صاحب کی اس بات کو نہیں مانا۔ انھوں نے کہا کہ تم اپنی اس تنقید سے میرے کام میں خلل ڈال رہے ہو، تمہاری اطاعت خاموشی کے

ساتھ سننے کی ہونی چاہیے، ایسی خاموشی جیسی اس سامنے والے پہاڑ کی ہے۔ سید صاحب سے میر محبوب علی صاحب کی یہ گفتگو ناکام رہی چنانچہ وہ واپس ہو کر دہلی آگئے۔ سید صاحب نے اس پر سخت ردّعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا: من ذَهَبَ مِنْ عِنْدِي إِلَىٰ وَطَنِهِ مُرَاجِعاً فَقَدْ ذَهَبَ إِيمَانُهُ (بحوالہ مولانا اسماعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان، از مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقی، صفحہ 87-86)۔

اس واقعے کو بعض کتابوں میں میر محبوب علی صاحب کی گمراہی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مولانا سید عبدالحئی صاحب (سابق ناظم ندوۃ العلما لکھنؤ) نے لکھا ہے کہ مولانا میر محبوب علی صاحب اپنے وقت کے مشہور علما میں سے ایک تھے۔ انہوں نے سید احمد شہید بریلوی کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کی اور سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کے ہمراہ یاغستان کا سفر کیا۔ مگر شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا چنانچہ انہوں نے سید صاحب کا ساتھ چھوڑ دیا اور ہندستان واپس آگئے۔ وَبَايَعَ السَّيِّدَ الْمُجَاهِدَ أَحْمَدَ بْنَ عِرْفَانَ الْبِرِيلَوِيَّ بَيْعَةَ الْجِهَادِ، وَسَافَرَ إِلَى يَاغِسْتَانَ مَعَ أَصْحَابِهِ لِيَنْصُرَهُ فِي الْجِهَادِ، وَلَكِنَّ الشَّيْطَانَ وَسْوَسَ فِي صَدْرِهِ فَتَأَخَّرَ وَرَجَعَ إِلَى الْهِنْدِ (نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر، جلد 7، صفحہ 407-406)۔

سید احمد شہید بریلوی نے اپنے اقدام کے بارے میں کوئی مشورہ نہیں کیا۔ انہوں نے یہ تحقیق بھی نہیں کی کہ پنجاب میں اسلامی شعائر کی بے حرمتی کی خبریں جو انہوں نے سنی ہیں وہ کس حد تک درست ہیں۔ انہوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوجی طاقت کتنی زیادہ ہے اور ان کے اپنے مریدوں کی غیر تربیت یافتہ فوج کس حد تک اس کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ وہ محض خوش عقیدگی کے تحت مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ریاست میں داخل ہو گئے، جب کہ یہاں کے جغرافیہ کا بھی انہیں پوری طرح علم نہ تھا۔ فطری طور پر اس کا انجام یہ ہوا کہ سید صاحب اور ان کے بیشتر ساتھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی

فوج کے ہاتھوں مارے گئے۔ ان کی یہ مہم مسلمانوں کی ایک طرفہ تباہی کے ساتھ ختم ہوگئی۔

اس دوسری مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اجتماعی معاملات میں درست رائے تک پہنچنے کے لیے یہ کتنا ضروری ہے کہ اختلاف رائے کا کھلا ماحول ہو، لوگوں کی تنقیدیں خوش دلی کے ساتھ سنی جائیں اور علمی بحث ومذاکرے کے بعد درست فیصلے تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

شخصیت نہیں بلکہ اصول

ایک عالم نے ایک علمی مسئلہ میں اپنے شیخ طریقت پر تنقید کی۔ کسی نے کہا کہ آپ اپنے شیخ پر تنقید کررہے ہیں۔ عالم نے جواب دیا: نَحْنُ نُحِبُّ شَيْخَنَا وَلٰكِنَّ الْحَقَّ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِنَ الشَّيْخِ۔ یعنی، ہم اپنے شیخ سے محبت کرتے ہیں مگر حق ہم کو شیخ سے بھی زیادہ محبوب ہے۔

مذکورہ عالم کا یہ قول ایک اہم حقیقت کو بتاتا ہے۔ وہ یہ کہ جب کسی مسئلہ میں کوئی تنقیدی بات کہی جائے تو خواہ بظاہر وہ کسی متعین شخص کے حوالے سے کہی گئی ہو، مگر وہ ایک اصول پر تنقید ہوتی ہے۔ اس قسم کی تنقید میں شخصیت کا حوالہ ضروری ہے، کیوں کہ شخصی حوالے کے بغیر تنقید ایک مجہول اظہار رائے بن جائے گی اور تنقید کا اصل مقصد حاصل نہ ہوگا۔

تنقید یا اختلاف رائے کا عمل اسلام کی پوری تاریخ میں ہمیشہ جاری رہا ہے۔ صحابہ کے درمیان آپس میں بہت سے اختلافات تھے اور اکثر کھلے انداز میں اس کا اظہار ہوتا تھا۔ اسی طرح تابعین، تبع تابعین، محدثین، فقہاء، علما وغیرہ، کے درمیان ہمیشہ اختلافات رہے ہیں اور ان کا کھلا اظہار بھی ہمیشہ کیا جاتا رہا ہے۔ مگر کبھی کسی نے ان اختلافات کو برا نہیں بتایا اور نہ یہ کہا کہ اختلاف اور تنقید کا طریقہ ختم کر دینا چاہیے۔ اسلامی تاریخ کے پورے قدیم دور میں تنقید اور اختلاف کو ہمیشہ گوارا کیا جاتا رہا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ لوگ تنقید واختلاف کو اصول کی نسبت سے دیکھتے تھے نہ کہ شخصیتوں کی نسبت سے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب دین انسانیت باب ”حریت فکر“)۔

تنقید کو ٹھنڈے ذہن کے ساتھ سننا اور اس پر غور کرنا اس بات کی علامت ہے کہ آدمی شخصیتوں کی عظمت میں گم نہیں ہے۔ اس کے نزدیک اصل اہمیت اصول کی ہے نہ کہ شخصیت کی۔ ایسا آدمی کسی شخصیت کے مجروح ہونے کو گوارا کر لے گا مگر حق کا مجروح ہونا اس کو گوارا نہ ہوگا۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کہ لوگوں کے اندر حقیقی دینی روح زندہ ہو۔ مگر جب کسی قوم پر زوال کا دور آجائے تو اس وقت شخصیتیں ہی لوگوں کا مرجع بن جاتی ہیں۔ اب لوگ اصول کے بارے میں حسّاس نہیں ہوتے۔ البتہ وہ اپنی محبوب شخصیتوں کے بارے میں بے حد حسّاس ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دور زوال میں تنقید لوگوں کے لیے ایک مبغوض چیز بن جاتی ہے۔ یہ لوگ جب بھی کوئی ایسی تنقید سنتے ہیں جس کی زد ان کے مفروضہ اکابر پر پڑ رہی ہو تو وہ سخت برہم ہو جاتے ہیں، ان کی یہ برہمی بظاہر ناقد کے خلاف ہوتی ہے، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ صرف اس بات کا ثبوت ہوتی ہے کہ وہ ابھی تک معرفت حق کی لذت سے آشنا نہ ہو سکے۔ حق کے نام سے وہ صرف کچھ شخصیتوں کو جانتے ہیں نہ کہ خود حق و صداقت کو۔

تنقید کا فائدہ

تنقید کوئی برائی نہیں، تنقید ایک نعمت ہے۔ تنقید علم کے نئے گوشوں کو کھولتی ہے۔ تنقید کے ذریعہ معاملے کے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ تنقید کوئی عیب زنی نہیں۔ تنقید اپنی حقیقت کے اعتبار سے ناقد شخص اور زیر تنقید شخص کے درمیان ایک قسم کی تفکیری شرکت (intellectual sharing) ہے جو دونوں ہی کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ تنقید یکساں طور پر دونوں کے ذہنی افق کو وسیع کرتی ہے۔ سچّی تنقید ایک انسان کی طرف سے دوسرے انسان کے لیے علمی تحفہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خلیفہ دوم عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ اس شخص پر رحم

کرے جو مجھ کو میرے عیوب کا ہدیہ بھیجے: رَحِمَ اللّٰہُ امْرَأً أَھْدَی إِلَيَّ عُيُوبِي (مسند الدارمی، اثر نمبر 675)۔

تنقید کا انتہائی مفید ہونا راقم الحروف کے لیے صرف ایک نظری بات نہیں۔ وہ میرے لیے ایک عملی تجربہ ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ میں پیدائشی طور پر ایک تنقید پسند آدمی ہوں۔ اپنے اس مزاج کی بنا پر میں اپنے قریبی ساتھیوں سے ہمیشہ یہ امید کرتا ہوں کہ وہ میرے اوپر علمی تنقید کریں۔ اس معاملے میں میرا مزاج کیا ہے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔ میرے ایک رفیق کار مولانا انیس لقمان ندوی تقریباً 8 سال تک میرے ساتھ تھے۔ اب وہ ایک عرب ملک میں ہیں۔ پہلی بار جب وہ عرب گئے تو ایک شیخ نے ان سے پوچھا کہ تم ہندستان میں کیا کام کرتے ہو۔ انھوں نے جواب دیا: أَنَا نَاقِدٌ أَكْبَرُ نَاقِدٍ فِي الْهِنْدِ۔ یعنی، میں ہندستان کے سب سے بڑے ناقد کا ناقد ہوں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تنقید کے معاملے میں میرا ذوق کیا ہے۔

ایک صاحبِ علم کے لیے سب سے زیادہ لذیذ چیز علمی تبادلہ خیال ہے۔ تنقید میں بظاہر ایک شخص سامنے آتا ہے۔ مگر حقیقتا تنقید کا نشانہ شخص نہیں ہوتا بلکہ موضوع ہوتا ہے۔ سچی تنقید دو شخصوں کے درمیان ایک موضوع پر ڈسکشن ہے، خواہ بظاہر وہ کسی فرد کے حوالہ سے کیا گیا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ سچی تنقید کبھی کسی شخص کے لیے ذاتی وقار کا سوال نہیں بنتی۔ کیوں کہ سچی تنقید میں کوئی ذات سرے سے نشانے پر ہوتی ہی نہیں۔

تنقید اگر صحیح ہو تو وہ آدمی کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے ذہن کو درست کرلے۔ وہ غلط فکر کے اندھیرے سے نکل کر صحیح فکر کی روشنی میں آجائے۔ وہ اپنے آپ کو علمی اعتبار سے پہلے سے زیادہ درست انسان بنالے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ تنقید کرنے والے کی تنقید صحیح نہ ہو تب بھی اس میں یہ فائدہ

ہے کہ اس سے موضوع کے مزید گوشے واضح ہوتے ہیں۔ زیر تنقید شخص اگر تنقید کوسن کر برہم نہ ہوتو تنقید اس کی قوت فکر کو بڑھائے گی۔ وہ اس کے اندر تخلیقی فکر (creative thinking) لانے کا سبب بنے گی۔ وہ اس کو موقع دے گی کہ وہ اپنی بات کوزیادہ واضح اورزیادہ مدلل انداز میں پیش کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ تنقید ہر حال میں مفید ہے، خواہ وہ صحیح تنقید ہو یا غلط تنقید۔

1965 کا واقعہ ہے۔ اس وقت میں لکھنو میں تھا۔ میری ملاقات ایک غیر مسلم اسکالر سے ہوئی۔ وہ مذاہب یا مذہبی شخصیتوں کو نہیں مانتے تھے۔ گفتگو کے دوران انہوں نے پیغمبر اسلام پر تنقید کی۔ آپ کے خلاف بولتے ہوئے انہوں نے کہا: ''محمد ﷺ'' کو اگر تاریخ سے نکال دیا جائے تو تاریخ میں کیا کمی رہ جائے گی۔

ان کے یہ الفاظ یقیناً اشتعال انگیز تھے۔ اگر میں اس پر غصہ ہو جاتا تو میں صرف یہ کرتا کہ ان کولعن طعن کرتا اور لاحول ولاقوۃ پڑھتے ہوئے وہاں سے واپس چلا آتا۔ مگر اللہ کے فضل سے میں نے اپنے ذہنی اعتدال کو باقی رکھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میرے ذہن میں فکری عمل مثبت انداز میں جاری رہا۔ یہاں تک کہ ایک لمحہ کے بعد میری زبان پر ان کی بات کا یہ جواب آ گیا: وہی کمی جو محمد سے پہلے تاریخ میں تھی۔

مذکورہ تنقید نے مجھے پیغمبر اسلام کی سیرت کے ایک ایسے پہلو پر سوچنے پر مجبور کر دیا جو اس سے پہلے میرے ذہن میں واضح نہ تھا۔ اس طرح مذکورہ اسکالر کی تنقید میرے لیے سیرت کے ایک نئے اور بے حد اہم گوشہ کی دریافت کا سبب بن گئی۔ جب میں نے سوچا کہ موجودہ دنیا کی تمام سائنسی اور تہذیبی ترقیاں پیغمبر اسلام کی بعثت کے بعد ظہور میں آئی ہیں، آپ سے پہلے ان چیزوں کا کوئی وجود ہی نہ تھا تو یہ سوچ میرے لیے ایک نئی دریافت تک پہنچنے کا ذریعہ بن گئی۔ میں نے یہ دریافت کیا کہ دونوں واقعات میں ایک گہرا رشتہ ہے۔ اس دریافت کے بعد میں نے اس موضوع پر باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔ اس مطالعہ

کا نتیجہ راقم الحروف کی وہ کتاب تھی جو اسلام دورجدید کا خالق (Islam: The Creator of the Modern Age) کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی اگر تنقید کو سن کر برہم نہ ہو، وہ اپنے ذہنی اعتدال کو برقرار رکھے تو تنقید اس کے لیے کتنی زیادہ مفید ثابت ہوسکتی ہے۔

صحیح معیار اور غلط معیار

مقلدانہ فکر کے بہت سے نقصانات ہیں۔ ان میں شاید سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ایسے لوگ حق کو خود حق سے نہیں پہچانتے بلکہ وہ اس کو رجال کی نسبت سے پہچانتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا سب سے بڑا مرجع ان کے مفروضہ بزرگ بن جاتے ہیں۔ یہ مفروضہ بزرگ جس چیز کو حق بتائیں اس کو وہ حق مان لیتے ہیں۔ کوئی شخص جو ان کے مفروضہ بزرگوں کی فہرست میں شامل نہ ہو وہ خواہ کتنے ہی زیادہ دلائل کے ساتھ کسی بات کو پیش کرے، وہ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے، کیوں کہ ان کے اندر یہ ذاتی صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ وہ دلیل کے ذریعہ کسی چیز کو پہچانیں اور اس کو اختیار کرلیں۔

یہی واحد سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر ہر دور میں پیغمبروں کا انکار کیا گیا۔ پیغمبر اپنے معاصرین کو ایک نیا شخص دکھائی دیتا تھا جو ان کے مفروضہ بزرگوں کی فہرست سے باہر تھا، اس لیے وہ پیغمبر کو اس کی زندگی میں قابل لحاظ شخص کا درجہ نہ دے سکے۔ مزید یہ کہ پیغمبر جب ان کی محبوب شخصیتوں پر تنقید کرتا تو وہ اس سے اور بھی زیادہ بھڑک جاتے اور اس کے پیغام پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے۔

مقلدانہ ذہن اور مجتہدانہ ذہن کے درمیان سب سے زیادہ اہم فرق یہ ہے کہ مقلدانہ ذہن رکھنے والے لوگ حق کو صرف اپنی شخصیتوں کے حوالے سے پہچانتے ہیں۔ اس کے برعکس، مجتہدانہ ذہن رکھنے والے لوگوں میں یہ صفت ہوتی ہے کہ وہ حق کو خالص دلیل کے زور پر پہچانیں اور اس کو پوری آمادگی کے ساتھ اختیار کرسکیں۔

اسی فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ مقلدانہ ذہن رکھنے والے لوگ عین اسی چیز سے محروم ہو جاتے ہیں جس کو دین میں سب سے زیادہ اہم حیثیت حاصل ہے، یعنی معرفت والا ایمان۔ معرفت والے ایمان کا سرچشمہ ذاتی دریافت (self-discovery) ہے۔ مقلدانہ ذہن رکھنے والے لوگ خود اپنے ذہن کو آزادانہ طور پر استعمال ہی نہیں کرتے، اس لیے وہ معرفت والے اسلام سے آشنا نہیں ہوتے۔

مجتہدانہ ذہن رکھنے والوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ایسے لوگوں کے ذہن کی کھڑکیاں ہر وقت کھلی رہتی ہیں۔ وہ ہمیشہ آزادانہ طور پر غور وفکر کے لیے تیار رہتے ہیں۔ وہ یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ اگر کسی چیز کا حق ہونا ظاہر ہو تو وہ فوراً اس کو پہچان لیں اور کسی تردد کے بغیر اس کو مان لیں۔

موجودہ دنیا میں کسی انسان کے لیے سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ وہ حق کو دریافت کرے۔ یہ احساس کہ میں نے سچائی کو پالیا ہے، بلاشبہ اس دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ مگر عظیم ترین نعمت صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جو مجتہدانہ فکر کے حامل ہوں۔ جو لوگ مقلدانہ فکر کے اندھیروں میں گم ہوں وہ کبھی معرفت والی سچائی کا تجربہ نہیں کر سکتے۔

انقلابی ذہن کی ضرورت

شاہ ولی اللہ دہلوی (وفات 1762) نے اپنی کتاب عقد الجید (صفحہ 4) میں اجتہاد اور مجتہد کے مسئلہ پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجتہد وہ ہے، جس کے اندر پانچ قسم کے علوم موجود ہوں — کتاب اللہ کا علم، سنّت رسول کا علم، علما سلف کے اقوال یعنی ان کے اتفاقات اور اختلافات کا علم، زبان کا علم، اور قیاس واستنباط کا علم (اَلْمُجْتَهِدُ مَنْ جَمَعَ خَمْسَةَ أَنْوَاعٍ مِنَ الْعِلْمِ: عِلْمَ كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ، وَعِلْمَ سُنَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ، وَأَقَاوِيلَ عُلَمَاءِ السَّلَفِ مِنْ إِجْمَاعِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ، وَعِلْمَ اللُّغَةِ، وَعِلْمَ الْقِيَاسِ)۔

شاہ ولی اللہ دہلوی (اور دوسرے علما) نے مجتہد کی جو شرطیں لکھی ہیں وہ بجائے خود درست ہیں۔ مگر یہ شرطیں صرف مقید اجتہاد کے لیے کار آمد ہیں، غیر مقید اجتہاد کے لیے یہ شرطیں کافی نہیں۔

اصل یہ ہے کہ اجتہاد کی دو قسمیں ہیں۔ ایک عام اجتہاد اور دوسرا خاص اجتہاد۔ عام اجتہاد سے مراد وہ اجتہاد ہے جو احوال ظاہری سے تعلق رکھتا ہو۔ اور خاص اجتہاد سے مراد وہ اجتہاد ہے جس کا تعلق احوال باطنی سے ہے۔ یعنی وہ حالات جو اوپری سطح (face value) پر دکھائی نہ دیتے ہوں مگر وہ گہری سطح (under current) میں موجود ہوں۔ ان دونوں کے فرق کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ اجتہاد عام کا تعلق بصارت سے ہے، اور اجتہاد خاص کا تعلق بصیرت سے۔

مثال کے طور پر اگر مجتہد کے سامنے یہ مسئلہ ہو کہ مسح علی الخفین (چمڑے کے موزوں پر مسح) کی جو رعایت شریعت میں دی گئی ہے، کیا وہ رعایت موجودہ زمانے کے صنعتی موزوں پر بھی ہے، تو اس قسم کے اجتہاد کے لیے مذکورہ 5 علوم کی واقفیت کافی ہے۔ اسی طرح اگر یہ سوال ہو کہ انجکشن کی سوئی جسم میں داخل ہونے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں تو اس مسئلہ کا حکم معلوم کرنے کے لیے بھی مذکورہ پانچ علوم میں واقفیت کافی ہوسکتی ہے۔ ایسا آدمی اپنے اس علم کی بنیاد پر قدیم فقہی ذخیرہ میں ایک ایسا جزئیہ پا سکتا ہے جس میں فقیہ نے یہ فتویٰ دیا ہو کہ بچھو کسی کے جسم میں ڈنک داخل کر دے تو اس کی وجہ سے اس کا وضو ٹوٹے گا یا نہیں۔

مگر اجتہاد خاص کے لیے مذکورہ پانچ شرطوں کے علاوہ ایک اور شرط لازمی طور پر ضروری ہے۔ یہ مزید شرط حدیث کے الفاظ میں یہ ہے: وَعَلَى الْعَاقِلِ أَنْ يَكُونَ بَصِيرًا بِزَمَانِهِ (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 361)۔ یعنی، دانا شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنے زمانے کو جاننے والا ہو۔

حدیث میں جس مزید شرط کا ذکر ہے اس کو ایک لفظ میں حالات زمانہ سے واقفیت کہا جاسکتا ہے۔ یعنی مجتہد جس زمان و مکان میں اجتہاد کر رہا ہے، اس زمان و مکان سے وہ بھر پور واقفیت رکھتا ہو۔ وہ تقلیدی علوم میں دستگاہ کے ساتھ غیر تقلیدی علوم پر گہری نظر رکھتا ہو۔ یہ دوسری صلاحیت خارجی معلومات اور غور وفکر اور حقائق کی معرفت کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

اسلامی تاریخ میں غیر مقید اجتہاد یا تحقیقی اجتہاد کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ اس قسم کی ایک مثال مدنی دور میں کی جانے والی صلح حدیبیہ ہے۔ اس صلح کے وقت بظاہر جو حالات تھے وہ تمام تر اہل اسلام کے خلاف تھے۔ کیوں کہ یہ 10 سالہ ناجنگ معاہدہ مخالفین کی یک طرفہ شرطوں کو مان کر کیا جا رہا تھا۔ صلح کے اس ظاہری پہلو کی بنا پر اس کو قبول کرنا صحابہ پر سخت گراں گزر رہا تھا۔ حتیٰ کہ عمر فاروق نے اس معاہدہ کو دنیۃ (ذلت) قرار دیا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3182)۔

اس معاملے کی حقیقت قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتی ہے۔ قرآن میں اس معاملے پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا (48:27)۔ اس آیت کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ: پس جانا اللہ نے جو کچھ نہ جانا تم نے۔ مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ تم صرف دکھائی دینے والی باتوں کو جانتے تھے مگر اس کے ساتھ کچھ بظاہر نہ دکھائی دینے والی باتیں بھی وہاں موجود تھیں اور اللہ کی رہنمائی سے اللہ کے رسول نے ان بظاہر نہ دکھائی دینے والی باتوں کی بنیاد پر صلح کا یہ معاہدہ کیا۔

حدیبیہ کے وقت ظاہری باتیں تو یہ تھیں کہ یہ صلح مخالفین کی یکطرفہ شرطوں پر کی جا رہی تھی۔ مگر غیر ظاہری (under current) بات یہ تھی کہ اہل اسلام اور غیر اہل اسلام کے درمیان جنگی حالات کی بنا پر معتدل فضا میں اختلاط (interaction) ختم ہو گیا تھا۔ اب اگر دونوں فریقوں کے درمیان ناجنگ معاہدہ ہو جائے تو معتدل حالات میں لوگ ایک دوسرے سے ملنے لگیں گے اور دونوں فریقوں کے درمیان کھلا تبادلۂ خیال (open dialogue)

شروع ہو جائے گا۔ اس عمل کے دوران اسلام کی خوبیاں اپنے آپ لوگوں کے اوپر ظاہر ہونے لگیں گی اور وہ واقعہ پیش آئے گا جس کو قرآن میں: يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (110:2) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی، لوگ خدا کے دین میں داخل ہورہے ہیں فوج درفوج۔

چنانچہ یہی ہوا۔ صلح حدیبیہ کے وقت اہل اسلام کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے بھی کم تھی مگر اس کے بعد امن کے حالات میں اسلام کی جو اشاعت ہوئی اس کے نتیجے میں دو سال سے بھی کم مدت میں اہل اسلام کی تعداد 10 ہزار تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد یہ معجزاتی واقعہ ہوا کہ کسی جنگ کے بغیر صرف عددی طاقت کے ذریعہ اہل اسلام کو غلبہ حاصل ہو گیا۔

یہی واقعہ تیرہویں صدی میں ایک اور صورت میں پیش آیا۔ جنگجو تاتاری ہتھیار کی طاقت سے مسلم دنیا میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے سمرقند سے حلب تک مسلم بستیوں کو تباہ کیا اور عباسی خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ فتنہ اتنا شدید تھا کہ مسلمانوں میں یہ مقولہ مشہور ہو گیا کہ: مَنْ حَدَّثَكُمْ أَنَّ التَّتَرَ انْهَزَمُوا وَأُسِرُوا فَلَا تُصَدِّقُوهُ (الکامل فی التاریخ لابن الاثیر، جلد 10، صفحہ 353)۔ یعنی اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاری شکست کھا گئے اور قید کر لیے گئے تو تم اس کو نہ ماننا۔

یہ ظاہری صورت حال تھی۔ مگر اس کی تہہ میں ایک اور چیز چھپی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ تاتاری نیزہ اور تلوار کی طاقت ضرور رکھتے تھے مگر وہ نظریہ حیات (ideology) سے خالی تھے۔

مسلمانوں سے اختلاط کے دوران وہ اسلام کے نظریہ سے متعارف ہوئے۔ چونکہ ان کے پاس اس سے مقابلے کے لیے کوئی جوابی نظریہ موجود نہ تھا، وہ تیزی سے اسلامی نظریہ سے متاثر ہونے لگے۔ یہاں تک کہ وہ انقلابی واقعہ پیش آیا جس کو ایک مشہور مستشرق فلپ کے ہٹی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے— مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کر لی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو گئے تھے:

The religion of Muslims has conquered where their

arms had failed. (*History of the Arabs* by P. K. Hitti, 1989, p. 488)

اب بعد کے زمانے کو دیکھیے۔ اس سلسلے میں پہلی سبق آموز مثال شاہ ولی اللہ دہلوی کی ہے۔ ان کے زمانے میں ہندستان کی مغل سلطنت کمزور ہوگئی تھی۔ اور یہ آثار نظر آنے لگے تھے کہ جلد ہی وہ زوال کا شکار ہو کر ختم ہو جائے گی۔ اس وقت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کوشش اس پر لگادی کہ یہ مسلم سلطنت کسی نہ کسی طرح دوبارہ مستحکم ہو جائے۔ انہوں نے اس وقت کے مسلم حکمرانوں کو جوش دلایا کہ تم لوگ تلوار لے کر اٹھو اور اپنے دشمنوں سے لڑ کر ان کا خاتمہ کردو (التفہیمات الالٰہیہ، 1936، جلد 1، صفحہ 16-215)۔ دوسری طرف انہوں نے کابل کے حاکم احمد شاہ ابدالی کو ترغیب دی کہ وہ ہندستان پر حملہ کر کے سکھوں اور مرہٹوں کا زور توڑ دے تاکہ مغل سلطنت محفوظ ہو کر قائم رہ سکے۔

مگر شاہ ولی اللہ کی یہ کوششیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ اپنے صرف قریبی اور ظاہری حالات کو دیکھتے تھے۔ عالمی اعتبار سے حالات کا جو نیا سیلاب آرہا تھا اس سے وہ قطعاً بے خبر تھے۔ نئے سیلاب سے میری مراد ڈیماکریسی کا دور ہے۔ شاہ ولی اللہ کا یہ خیال تھا کہ وہ قائم الزمان ہیں (فیوض الحرمین 2007، حیدرآباد سندھ، صفحہ 111)۔ مگر ان کی ساری سوچ جانے والے دورِ بادشاہت میں کام کر رہی تھی۔ آنے والے دور جمہوریت میں کیا صورت پیش آئے گی، اس سے وہ مطلع نہ ہو سکے۔ دور بادشاہت میں ایک شخص پورے ملک کا حاکم ہوا کرتا تھا مگر دور جمہوریت میں عوامی حاکمیت کا اصول رائج ہونے والا تھا۔ اور وہ مسئلہ پیدا ہونے والا تھا جس کو اکثریت کے مقابلے میں اقلیت کا مسئلہ کہا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ اگر حالات کے رخ کو دیکھ پاتے تو وہ اپنی ساری طاقت دعوت کے محاذ پر لگا دیتے۔ جس میں گویا اقلیت کو اکثریت میں بدلنے کا راز چھپا ہوا تھا۔ دعوت کا مطلب یہ تھا کہ مغل سلطنت اگر ختم ہو جائے تب بھی اہل اسلام اپنی عددی برتری کے زور پر غالب حیثیت کے حامل ہوں گے۔ مگر شاہ ولی اللہ دہلوی دعوت کی اس انقلابی اہمیت سے بالکل بے خبر تھے۔

حتیٰ کہ ان کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغۃ میں ہر قسم کے ابواب ہیں مگر کتاب الدعوۃ یا کتاب التبلیغ اس کے اندر موجود نہیں۔

اب سید جمال الدین افغانی (وفات 1897) کی مثال لیجیے۔ ان کے زمانے میں انگریز اور فرانسیسی تقریباً پوری مسلم دنیا پر سیاسی اعتبار سے غالب آ گئے تھے۔ سید جمال الدین افغانی نے اپنی پوری زندگی اس سیاسی غلبہ کو ختم کرنے میں لگا دی۔ ان کا نعرہ تھا اَلشَّرْقُ لِلشَّرْقِيِّينَ (مشرق مشرقیوں کے لیے ہے)۔ بظاہر دیکھیے تو آج مغربی قوموں کا سیاسی تسلّط ختم ہو چکا ہے اور تقریباً ساٹھ آزاد مسلم ممالک دنیا کے نقشے پر وجود میں آ چکے ہیں۔ مگر حقیقی حالات کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوا۔ مسلم قومیں آج بھی اہل مغرب کی بالاتری کے تحت جینے پر مجبور ہیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ سید جمال الدین افغانی حالات کو صرف ظاہر کے اعتبار سے دیکھ سکے، وہ گہری حقیقتوں سے آشنا نہ ہو سکے۔ وہ انگریز اور فرانسیسیوں کے غلبے کو صرف سیاسی غلبہ کے ہم معنی سمجھتے رہے۔ مگر یہ اصل معاملے کا صرف ایک ظاہری پہلو تھا۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ مغربی قوموں نے علم میں تقدم حاصل کر لیا تھا، وہ سائنس اور ٹکنالوجی میں مسلمانوں سے آگے بڑھ گئے تھے۔ سید جمال الدین افغانی اپنے قدیم سیاسی ذہن کی بنا پر معاملے کے ان گہرے پہلوؤں کو نہ دیکھ سکے۔

سید جمال الدین افغانی اگر جدید زمانے میں علم کی اہمیت کو سمجھتے تو وہ بیرونی غلبے کو ایک وقتی چیز سمجھ کر نظر انداز کر دیتے اور اپنی ساری طاقت اس راہ پر لگا دیتے کہ مسلمان علمی اعتبار سے اس طرح آگے بڑھ سکیں جس طرح مغربی قومیں اس میدان میں آگے بڑھ گئی ہیں۔ اگر وہ بے فائدہ سیاسی جہاد کو چھوڑ کر علمی جہاد میں سرگرم ہو جاتے اور اپنے ساتھیوں کو اس راہ پر لگا دیتے تو یقینی ہے کہ مسلم ملکوں کی تاریخ اس سے مختلف ہوتی جو آج ہر طرف دکھائی دیتی ہے۔

یہ چند مثالیں بتاتی ہیں کہ مذکورہ پانچ شرطیں مقید اجتہاد کے لیے بلا شبہ کافی ہیں۔ مگر مقید اجتہاد یا مطلق اجتہاد کے لیے ایک اور شرط لازمی طور پر ضروری ہے اور وہ ہے زمانے کے حالات سے گہرائی کے ساتھ باخبر ہونا۔ اس مزید شرط کے بغیر جو اجتہاد کیا جائے گا وہ سراسر بے نتیجہ رہے گا۔ ایسا اجتہاد کبھی ملت کو نتیجہ خیز رہنمائی نہیں دے سکتا۔

اجتہادی مسائل

تفسیر بالرائے

قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرنا ایک گناہ کا فعل ہے۔ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر قرآن کی کسی آیت کا غلط مفہوم بیان کرے تو یہ تحریف ہے (2:75)۔ اور قرآن میں اس قسم کی تحریف بلاشبہ ایک ناقابل معافی جرم ہے۔

یہ معاملہ اتنا زیادہ نازک ہے کہ محض اپنی رائے کے تحت کی ہوئی تفسیر اگر بالفرض درست ہو تب بھی یہ اندیشہ ہے کہ وہ آدمی کے لیے گناہ کا سبب نہ بن جائے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ قَالَ فِي كِتَابِ اللَّهِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 3652)۔ یعنی، جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اپنی رائے سے کہا اور اس نے صحیح کہا تب بھی اس نے غلطی کی۔

ضروری تفسیری تقاضوں کو پورا کیے بغیر محض اپنی رائے سے قرآن کا مفہوم بیان کرنا ایک غیر محتاط روش ہے۔ اس لیے ایسے کسی آدمی کی تفسیر اگر اتفاقاً درست ہو تب بھی ایسا شخص اپنی غیر محتاط روش کی بنا پر غلط کار ٹھہرے گا۔ ایسے آدمی کو صحیح تفسیر کرنے کا انعام نہیں مل سکتا۔

تفسیر قرآن کے سلسلے میں کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ حدیث اور آثار میں جو تفسیریں منقول ہیں یا قدماء نے قرآنی آیات کی جو تفسیریں بیان کی ہیں، تفسیر قرآن کا کام بس اسی دائرے کے اندر ہونا چاہیے۔ گویا بعد کی مسلم نسلوں کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ابتدائی دور کے علما اور مفسرین کے اقوال کو دہراتے رہیں۔ مگر مذکورہ حدیث کا یہ مطلب درست نہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قرآن ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر تدبر کریں اور تاکہ عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں (38:29)۔ قرآن جب ایک ایسی کتاب ہے، جس پر ہر قاری تدبر اور غور وفکر کرے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوسکتا کہ صرف پچھلی بیان کردہ باتوں کو پڑھا جائے، اور بس

انھیں کو دہرایا جاتا رہے۔ تدبر کا لفظ اپنے آپ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن کے قاری سے یہ مطلوب ہے کہ وہ گہرے غور وفکر سے اس میں نئے نئے معانی دریافت کرے اوران سے اپنے ایمانی شعور میں اضافہ کرتا رہے۔ قرآن میں اگر یہ صفت نہ ہوتو وہ لوگوں کے لیے نصیحت اور اضافۂ ایمان کی کتاب نہ بن سکے گا۔ گہری نصیحت نئے نئے معانی کی دریافت کے ذریعہ ہوتی ہے نہ کہ کچھ معلوم اورمحدود باتوں کی تکرار سے۔

یہ کوئی قیاسی بات نہیں۔ حدیث سے صراحتاً بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن میں نئے معانی کی دریافت کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ نے فرمایا: وَلا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2906)۔ یعنی، قرآن کے عجائب کبھی ختم نہ ہونگے۔ ایک اور روایت میں ”لا تفنی“ کا لفظ ہے (سنن الدارمی، حدیث نمبر 3375)۔ یعنی قرآن کے عجائب کبھی فنا نہ ہوں گے۔ اس حدیث میں عجائب سے مراد معنوی عجائب ہیں۔ یعنی قرآن کے معانی اتنے زیادہ ہیں کہ ہر دور کے علما اس سے نئے نئے معانی دریافت کرتے رہیں گے۔ اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

تاریخ کے ہر دور میں قرآن کی آیتوں میں نئے نئے معانی کی دریافتوں کا سلسلہ جاری رہا ہے جس کو استنباط کہا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں تفسیر کی ہر کتاب میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ موجودہ زمانے میں بھی یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں اعداد قوت کے حکم کے تحت جنگی گھوڑوں کی فراہمی کا حکم دیا گیا ہے (8:60)۔ موجودہ زمانے میں جنگی گھوڑوں کی جگہ جنگی مشینوں نے لے لی ہے۔ چنانچہ تمام علما اب اس آیت کی تفسیر کے تحت کہتے ہیں کہ حالات کی تبدیلی کی بنا پر اس آیت میں جنگی گھوڑوں کے بجائے جنگی مشینوں کی فراہمی مراد لی جائے گی۔ کیونکہ اب جنگی گھوڑوں کے ذریعہ ارہاب کا فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ جس کو مذکورہ آیت میں اعداد قوت کا مقصود بتایا گیا ہے۔ اب ارہاب کا یہ فائدہ مشینی طاقت کے ساتھ وابستہ ہوگیا ہے۔

قرآن ہر دور میں مسلمانوں کے لیے ذہنی اور علمی ارتقاء کا ذریعہ رہا ہے۔ قرآن کی سب سے اہم صفت یہ ہے کہ وہ ذہنِ انسانی کو مہمیز کرتا ہے اور اس کو بار بار غور وفکر کے اوپر ابھارتا ہے۔ قرآن اپنے لامحدود معانی کی بنا پر اہل اسلام کے لیے فکری ارتقاء کا ضامن ہے۔ ایسی کتاب میں نئ علمی دریافتوں کا دروازہ بند کرنا خود اس کتاب کے مقصد کی نفی کے ہم معنی ہے۔ ایسا کرنے کی صورت میں اہل اسلام ذہنی جمود کا شکار ہو جائیں گے۔ وہ نہ خود علمی ترقی کریں گے اور نہ انسانی قافلوں کی علمی وفکری قیادت کا مطلوب کام انجام دے سکیں گے۔

اصل یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ تفسیر جو تدبر کے ساتھ کی جائے اور دوسری تفسیر وہ ہے جو تدبر کے بغیر کی جائے۔ اس دوسری تفسیر کا نام تفسیر بالرائے ہے۔ تدبر کے ساتھ تفسیر کا مطلب یہ ہے کہ قاری عربی زبان نیز احادیث وآثار سے بخوبی واقفیت حاصل کرے۔ وہ قرآن کی صرف ایک آیت کو لے کر اس کی تفسیر نہ کرنے لگے، بلکہ وہ مجموعی طور پر پورے قرآن کے منشا و مقصود کو سامنے رکھے۔ وہ قرآن سے متعلق دوسرے علوم سے گہری واقفیت حاصل کرے۔ اسی طرح وہ یہ کرے کہ دورِ اوّل سے لے کر بعد کے زمانے تک مسلّمہ دینی شخصیتوں نے جو تفسیریں کی ہیں ان سے وہ بھر پور واقفیت حاصل کرے۔ اس کے ساتھ وہ تقویٰ کی صفت اپنے اندر پیدا کرے جس کو قرآن میں علم کا سرچشمہ بتایا گیا ہے (2:282)۔ یہ قرآن کی تفسیر کا صحیح طریقہ ہے۔

اس کے برعکس، تفسیر بالرائے یہ ہے کہ آدمی صرف اپنی رائے پر اعتماد کرے۔ آیت کے حوالے سے اس کے ذہن میں جو بھی خیال آجائے وہ اس کو قرآن کی تفسیر سمجھ کر اسے بیان کرنے لگے۔ خواہ آیت کے سیاق وسباق سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ خواہ قرآن کے مجموعی احکام سے وہ مطابقت نہ رکھتا ہو۔ یہاں تفسیر بالرائے کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

1۔ تفسیر بالرائے کی ایک صورت وہ ہے جو اتنی قبیح ہے کہ اس کو سننے اور پڑھنے کے بعد فوراً ہی سنجیدہ آدمی کا ذہن اس کو رد کر دے۔ مثلاً قرآن کی ایک آیت یہ ہے ”وَرَبَّكَ

فَكَبِّرْ" (74:3)۔ اس آیت کا ترجمہ کچھ لوگوں نے یہ کیا کہ اور تم اپنے رب کو بڑا کرو۔ اس ترجمہ کو لے کر آیت کی تفسیر انھوں نے یہ کی کہ خدا کی (سیاسی بڑائی) دنیا میں قائم کرو، خدا کی حکومت کا جھنڈا دنیا میں بلند کرو۔

یہ ترجمہ اور تفسیر دونوں تفسیر بالرائے کی ایک بدترین صورتیں ہے، عقل سلیم ہی اس کو غلط سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ اللہ اپنے آپ میں بڑا ہے۔ وہ اس کا محتاج نہیں کہ اس کی کوئی مخلوق کسی پہلو سے اس کو بڑا کرے۔ آیت کے مطابق، انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اللہ کی عظمت کو اپنے دل اور دماغ میں اتارے۔ اللہ کی عظمت کا احساس اس کی روح کے اندر تیرنے لگے۔ اپنے چھوٹا ہونے اور اللہ کے بڑا ہونے کا عرفان اس کو انسان اصلی (man cut to size) بنادے۔ یہی تکبیرِ رب کا مطلب ہے۔

مذکورہ آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ — اور اپنے رب کی بڑائی کرو، یا اپنے رب کی بڑائی بول، یا اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔ اس ترجمہ کے مطابق، آیت میں جس تکبیرِ رب کا ذکر ہے اس کا تعلق کسی خارجی سیاست سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق آدمی کی اپنی داخلی کیفیت سے ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کا دماغ اللہ کی عظمت کو شعوری طور پر دریافت کرے۔ اس کا دل اللہ کی عظمت کے احساس سے تڑپ اٹھے۔ اللہ کی عظمت کا اعتراف اس کی زبان پر جاری ہوجائے۔ یہی وہ تکبیر رب ہے جس کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔

2۔ قرآن کے آغاز میں یہ آیت آئی ہے "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ" (2:2)۔ یعنی، یہ کتاب (الٰہی) ہے، اس میں کوئی شک نہیں، یا یہ کہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ اس آیت کی نحوی ترکیب میں کچھ اختلاف ہے۔ تاہم ہر مفسر نے یہاں کتاب کو کتاب ہی کے معنی میں لیا ہے۔ اس کے بارے میں ایک صاحب نے لکھا ہے کہ وہ تمام ترجمے غلط ہیں جن میں "ذٰلِكَ الْكِتَابُ" کا ترجمہ کتاب سے کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک قرآن تمام علوم کا خزانہ ہے۔ اس لیے ذلک الکتاب کا سب سے قریبی ترجمہ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔

یہ ترجمہ یقینی طور پر رائے کی بنیاد پر کیا گیا ہے نہ کہ حقیقی علم کی بنیاد پر اس لیے کہ انسائیکلو پیڈیا ایسی کتاب کا نام ہوتا ہے جس میں ہر قسم کی معلومات یکجا کی گئی ہوں۔ مگر قرآن انسائیکلو پیڈیائی مفہوم میں معلومات کا مجموعہ نہیں۔ اس کے بجائے وہ علم اور معرفت کا مجموعہ ہے۔ وہ خزانہ حکمت ضرور ہے مگر وہ معروف معنی میں، خزانہ معلومات نہیں۔

مثال کے طور پر اسلام کا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، مگر قرآن میں یکجائی طور پر کہیں یہ کلمہ موجود نہیں۔ اسلام میں نماز پانچ وقتوں کے لیے فرض کی گئی ہے۔ مگر پانچ کے عددی تعین کے ساتھ قرآن میں نماز کا حکم موجود نہیں۔ انسائیکلو پیڈیا میں جن اشخاص کا ذکر آتا ہے، اس میں سال پیدائش اور سال وفات کے ساتھ ان کا ذکر آتا ہے۔ مگر قرآن میں پیغمبر اسلام نیز دوسرے پیغمبروں میں سے کسی بھی پیغمبر کی سال پیدائش یا سال وفات قرآن میں مذکور نہیں۔ اس طرح کی ہزاروں معلوماتی باتیں ہیں جن سے قرآن کے صفحات خالی ہیں۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں کتاب کا ترجمہ انسائیکلو پیڈیا کے لفظ سے کرنا ایک ذاتی اپج ہے، اس کے حق میں کوئی علمی بنیاد موجود نہیں۔

3۔ قرآن میں ایک حکم وہ ہے جو "اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ" (42:13) کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ اس آیت کا سادہ ترجمہ یہ ہے کہ تم الدین کو قائم کرو۔ کچھ لوگوں نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس آیت میں الدین سے مراد قرآن وحدیث میں وارد شدہ تمام شرعی اور دینی احکام ہیں۔ اور اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام شرعی اور دینی احکام کو ایک مکمل نظام کے طور پر دنیا میں نافذ کرو۔

آیت کی تفسیر بلاشبہ تفسیر بالرائے کے حکم میں آتی ہے کیوں کہ وہ قرآن فہمی کے واضح اصولوں کے خلاف ہے۔ مثال کے طور پر، اس آیت میں صراحتاً اس حصہ دین کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے۔ جو حضرت نوح کو اور حضرت ابراہیم کو اور حضرت موسیٰ کو اور حضرت عیسیٰ کو اور حضرت محمد کو مشترک طور پر دیا گیا۔ اس مخصوص انداز بیان کی بنا پر تمام مفسرین نے اس کا

مطلب یہ لیا ہے کہ یہاں الدین سے مراد صرف دین کی اساسی تعلیمات ہیں کیوں کہ مختلف پیغمبروں کا مشترک دین یہی اساسی تعلیمات تھیں۔ جہاں تک تفصیلی شرائع کا تعلق ہے وہ نص قرآنی (5:48) کے مطابق مختلف پیغمبروں کے یہاں مختلف تھیں۔

اس آیت میں جو حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ الدین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو (42:13)۔ چونکہ دین کی مشترک پیروی صرف اساسی دینی تعلیمات ہی میں ہوسکتی ہے اس لئے یہاں صرف اساسی دینی تعلیمات کو اقامت کے تحت سمجھا جائے گا۔ تمام شرائع کو اس کے تحت لینے کی صورت میں تفرق لازم آئے گا، یعنی وہی چیز جس سے آیت میں منع کیا گیا ہے۔

تفسیر بذریعہ تدبر

عام طور پر تفسیر کی دو قسمیں سمجھی جاتی ہیں۔ تفسیر ماثور، اور تفسیر بالرائے۔ مگر تفسیر کی ایک اور قسم ہے جس کو تفسیر بذریعہ تدبر کہا جاسکتا ہے۔ احادیث و آثار اور اقوال سلف کی روشنی میں قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرنا، بلاشبہ بہت اہم اور ضروری ہے۔ مگر قرآن کے عجائب کو مزید دریافت کرنے کے لیے ہر دور میں اس پر غور و تدبر کا سلسلہ جاری رہے گا۔ جائز دائرے میں اس کا سلسلہ کبھی بند نہیں ہوگا۔ یہاں قرآن سے ایک مثال دی جاتی ہے جس سے یہ معاملہ مزید واضح ہوجاتا ہے۔

قرآن کی سورہ نمبر 12 میں حضرت یوسف کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت یوسف کو مصر کے ارضی خزائن پر حاکم مقرر کیا گیا۔ قحط کے زمانے میں ان کے خصوصی انتظام کے تحت لوگوں کو غلہ فراہم کیا جانے لگا۔ اسی زمانے میں غلہ لینے کے لیے ان کے بھائی کنعان سے مصر آئے۔ اور غلہ حاصل کرکے روانہ ہوئے۔ پھر یہ واقعہ ہوا کہ دربار کے کارکنوں نے حضرت یوسف کے چھوٹے بھائی بن یامین کے اونٹ پر لدے ہوئے غلہ سے ایک شاہی سامان برآمد کیا۔ اس کے بعد بن یامین کو چوری کے الزام میں ماخوذ کرکے حضرت یوسف کے حوالے کردیا گیا۔

یہاں قرآنی آیتوں کی تفسیر عام طور پر یہ کی جاتی ہے کہ حضرت یوسف نے اپنے بھائی بن یامین کو پہچان کر انہیں اپنے پاس روکنا چاہا مگر چونکہ وہ اپنی شخصیت کو ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے یہ تدبیر کی کہ جب بھائیوں کو غلہ دیا جانے لگا تو ان کے حکم سے ایک شاہی سامان (سقایۃ) بن یامین کے سامان میں رکھ دیا گیا پھر جب وہ لوگ اپنا غلہ لے کر جانے لگے تو نعوذ باللہ حضرت یوسف نے یہ کیا کہ قافلے کو روک کر ان کے سامان کی تلاشی کروائی۔ پھر جب منصوبے کے مطابق، شاہی سقایہ بن یامین کے سامان سے نکل آیا تو انہوں نے بن یامین کو نعوذ باللہ چور قرار دے کر اپنے پاس روک لیا اور بقیہ بھائیوں سے کہا کہ تم لوگ واپس جاؤ۔

یہ تفسیر واضح طور پر ایک پیغمبر کے اخلاق کو داغدار کرتی ہے۔مگر جب قرآن کی متعلق آیتوں کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ تفسیر کے علاوہ یہاں ایک اور زیادہ صحیح تفسیر موجود ہے۔اس دوسری تفسیر میں حضرت یوسف مکمل طور پر بری الذمہ قرار پاتے ہیں۔

یہ دوسری تفسیر سورۃ یوسف (رکوع 9 آیت 76-70) کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے۔ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ حضرت یوسف نے جب ان کا سامان سفر درست کیا تو اپنے بھائی بن یامین کے سامان میں اپنا سقایہ (پینے کا پیالہ) رکھ دیا پھر جب بھائیوں کا یہ قافلہ روانہ ہوا تو درباریوں کو کسی وجہ سے اپنا صواع (ناپنے کا پیمانہ) دکھائی نہیں دیا۔ چنانچہ انہوں نے قافلہ والوں کو پکار کر روکا اور کہا کہ ہم کو شبہ ہے کہ تم نے ہمارا (چاندی کا) صواع چرا لیا ہے۔ چنانچہ قافلہ کو روک کر ان کے سامان کی تلاشی لی گئی۔آخر کار حضرت یوسف کے بھائی بن یامین کے سامان سے وہ برآمد ہو گیا۔ پھر کنعان کے قانون کے مطابق بن یامین کو پکڑ کر حضرت یوسف کے حوالے کر دیا گیا۔اس طرح حضرت یوسف کو اپنا وہ بھائی مل گیا جس کو وہ اپنے پاس روک لینا چاہتے تھے۔

ان آیتوں کے الفاظ پر غور کیجیے تو ایک بہت با معنی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ وہ حقیقت عربی قاعدہ کے مطابق، ضمیر کے فرق میں چھپی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت یوسف نے اپنے بھائی کے سامان میں جو چیز رکھی وہ سقایہ (یوسف، 12:70) تھا۔ یعنی ایک ایسی چیز جو عربی قاعدے کے مطابق، مونث ہے مگر دربار کے کارکنوں نے قافلے والوں کی تلاشی کے بعد ان کے سامان میں سے جو چیز برآمد کی اس کو قرآن میں ضمیر مذکر کے بجائے ضمیر مؤنث (ثُمَّ اسۡتَخۡرَجَهَا) کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی ضمیر 'ہ' کی بجائے 'ھا'۔

ضمیر کے اس فرق پر غور کرنے سے معاملے کی جو صورت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف نے اپنے بھائی کے سامان میں برادرانہ محبت کے تحت زادراہ کے ساتھ اپنا پانی پینے کا پیالہ بھی رکھ دیا تھا۔ درباری کارکن اس سے باخبر تھے۔ البتہ اس دوران دربار کی ایک اور زیادہ بڑی چیز، صواع (غلہ ناپنے کا پیمانہ) سامانوں میں دب کر بظاہر گم ہو گیا۔ جلدی میں درباری کارکنوں کا دھیان قافلے والوں کی طرف گیا اور انھوں نے ان پر شبہ کرتے ہوئے انھیں روکا اور ان کے سامان کی تلاشی لی۔ اس تلاشی کے دوران ان کا مطلوب پیمانہ "صواع" تو نہیں ملا البتہ اس دربار کی ایک اور چیز پانی پینے کا پیالہ (سقایہ) بن یامین کے سامان سے برآمد ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے بن یامین کو خود برادران یوسف کی شریعت کے مطابق روک لیا۔

یہ سارا معاملہ حضرت یوسف کے کسی حکم کے بغیر درباریوں نے بطور خود کیا۔ اسی لیے اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس طرح ہم نے یوسف کے لیے تدبیر کی، وہ بادشاہ کے قانون کے رو سے اپنے بھائی کو نہیں لے سکتا تھا۔ مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں۔ اور ہر علم والے سے بالاتر ایک علم والا ہے (12:76)۔ یہ تفسیر قرآنی الفاظ کے مطابق بھی ہے اور حضرت یوسف کی پیغمبرانہ عظمت کے مطابق بھی۔

قرآن میں اہل ایمان کو حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (8:60)۔ یعنی، اور ان کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے تیار رکھو قوت اور پلے ہوئے گھوڑے کہ اس سے تمہاری ہیبت رہے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر اور ان کے علاوہ ہر دوسرے پر بھی جن کو تم نہیں جانتے۔ اللہ ان کو جانتا ہے۔

موجودہ زمانہ کے ایک عرب مفسر قرآن نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اعداد قوت کا مقصد تحریر الانسان ہے۔ اہل ایمان کو طاقت کی فراہمی کا حکم اس لیے دیا گیا تا کہ وہ ساری دنیا کے انسانوں کو ہر قسم کی غلامی سے آزاد کرائیں۔ مثلاً کمیونزم، نازی ازم، سیکولرزم اور زائنزم (صیہونیت)، وغیرہ سے نجات دلانا۔

آیت کی تفسیر بظاہر ایک انقلابی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔ مگر یقینی طور پر وہ تفسیر بالرائے ہے۔ مفسر نے قرآن کے الفاظ پر غور کیے بغیر اپنے ذہن میں موجود خیالات کو آیت کی تفسیر میں شامل کر دیا۔ آیت کے الفاظ پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے مطابق، اعداد قوت کا مقصد ارہاب عدو ہے یعنی دشمن کو ہیبت زدہ رکھنا تا کہ وہ اہل ایمان کے خلاف جارحیت کا حوصلہ نہ کر سکے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ آیت میں اعداد قوت کا حکم دفاعی مقصد کے تحت دیا گیا ہے، مگر مذکورہ مفسر نے اس کو اقدامی معنی میں لے لیا۔

سلطانی ماڈل، دعوتی ماڈل

موجودہ زمانے کے مسلمان ساری دنیا میں تباہی اور ذلت سے دو چار ہو رہے ہیں۔ تباہی کی یہ مدت پوری انیسویں صدی اور بیسویں صدی تک پھیلی ہوئی ہے۔ سلطان ٹیپو سے لے کر یاسر عرفات تک دوسو سال سے تباہی کا سلسلہ جاری ہے اور ابھی تک بظاہر اس کے خاتمہ کے کوئی آثار نہیں۔

مسلمانوں کی اس تباہی کا سبب بے عملی نہیں ہے بلکہ وہ مکمل طور پر ہنگامہ خیز عمل کے درمیان ہو رہی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان دوسالوں میں دنیا بھر کے مسلمانوں نے جان ومال کی قربانی دی ہے وہ مقدار کے اعتبار سے اسلام کی بقیہ پوری تاریخ کی قربانیوں سے بھی زیادہ ہے۔

کیا وجہ ہے کہ عمل اور قربانی کے مسلسل ہنگاموں کے باوجود مسلمان دور جدید میں عزت وغلبہ کا مقام حاصل نہ کر سکے۔ جب کہ قرآن وحدیث میں واضح یقین دہانیاں موجود ہیں کہ اہل ایمان کی کوششوں کو اللہ ضائع نہیں کرے گا، ان کے حریفوں کے مقابلے میں ضرور انہیں سرفرازی عطا فرمائے گا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں نے اپنی کوششوں کے لیے غلط منہج اختیار کیا۔ انہوں نے اپنی کوششوں کو اس مطلوب طریقے پر جاری ہی نہیں کیا جس کو اختیار کر کے خدا کی نصرت حاصل کی جاسکتی ہے۔ اور یقیناً اس دنیا میں کامیابی اس کے لیے ہے جس کو خدا اپنی نصرت سے نوازے۔ اللہ کی نصرت کے بغیر یہاں کامیابی ممکن نہیں۔

اصل یہ ہے کہ خدا نے اپنی نصرت کا وعدہ ان لوگوں سے کیا ہے جو اپنی کوششوں

کے لیے پیغمبرانہ ماڈل کو اختیار کریں۔ یہ پیغمبرانہ ماڈل وہی ہے جس کو ہم نے دعوتی ماڈل کا نام دیا ہے۔ اہل ایمان کی حقیقی کامیابی پیغمبر کے قائم کیے ہوئے اسی دعوتی ماڈل سے وابستہ ہے۔ مگر موجودہ زمانے کے مسلم رہنما بعد کے دور میں مسلم سلاطین کے قائم کیے ہوئے سلطانی ماڈل سے اتنا متاثر تھے کہ انھوں نے اپنی تمام تحریکیں اسی سلطانی ماڈل پر چلا دیں۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی تمام تباہیوں کا اصل سبب یہی انحراف ہے۔

مسلم رہنماؤں نے دیکھا کہ بعد میں مسلم سلاطین مسلح فوجوں کو لے کر مختلف علاقوں میں گھس گئے۔ وہاں انھوں نے قائم شدہ حکومت کی فوجوں کو زیر کر کے اپنی حکومت قائم کرلی۔ یہ سلطانی ماڈل اتنا زیادہ عام ہوا کہ بعد کے زمانے میں لکھی جانے والی مسلم تاریخیں تقریباً سب کی سب اسی سلطانی ماڈل پر ڈھال دی گئیں۔ موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں نے اپنی تاریخی کتابوں کو پڑھا اور یہ سمجھ لیا کہ اسلامی تحریک کا ماڈل بس یہی سلطانی ماڈل ہے۔ انھوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی سلطانی ماڈل کو معیاری ماڈل سمجھا اور مسلح جہاد کے نام پر اس کو ہر جگہ جاری کر دیا۔ یہی غلطی موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی تباہی کا اصل سبب ہے۔

اسلامی عمل کا صحیح ماڈل وہ ہے جو پیغمبر اسلام ﷺ نیز دوسرے پیغمبروں کی مثال سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ ماڈل دعوتی ماڈل ہے۔ دعوتی ماڈل سے مراد یہ ہے کہ اپنے عمل کی بنیاد اسلام کی نظریاتی اشاعت پر رکھی جائے۔ اس کو مخاطب کے معیار فہم کے مطابق مدلل کرتے ہوئے پیش کیا جائے۔ تشدّد سے مکمل پرہیز کرتے ہوئے پُرامن اشاعتی مہم کو جاری رکھا جائے۔ ہر قیمت پر یہ کوشش کی جائے کہ داعی اور مدعو کے درمیان نفرت اور کشیدگی کا ماحول ہرگز قائم نہ ہونے پائے۔ معتدل ماحول ہمیشہ اسلام کے لیے مفید ہوتا ہے اور غیر معتدل ماحول ہمیشہ اسلام کے لیے غیر مفید۔ یہی دعوتی ماڈل ہے اور اسی طریقہ کو اختیار کر کے پیغمبر اسلام ﷺ خدا کے دین کو عزت اور غلبہ کے مقام تک پہنچایا۔

پیغمبرانہ ماڈل میں اصل عمل دعوت کے اصول پر جاری ہوتا ہے۔ وہ آغاز میں بھی دعوت ہے اور آخر میں بھی دعوت۔ بعض اوقات بطور استثناء محدود طور پر کسی سے دفاعی ٹکراؤ پیش آسکتا ہے، وہ بھی اس وقت جب کہ اعراض کی تمام کوششیں ناکام ہوگئی ہوں اور یک طرفہ جارحیت کی بنا پر اہل ایمان کو وقتی طور پر اپنے دفاع میں لڑنا پڑے۔ اس وقتی دفاع کے پہلے بھی دعوت ہے اور اسکے بعد بھی دعوت۔ پیغمبرانہ ماڈل میں دعوت کی حیثیت اقدام کی ہے اور جنگ کی حیثیت محدود معنوں میں صرف وقتی دفاع کی۔

موجودہ زمانے میں ساری دنیا میں نئے انقلابات ہوئے ہیں۔ اس کے نتیجے میں عالمی صورت حال مکمل طور پر بدل گئی ہے۔ ان تبدیلیوں نے مسلح جنگ کو بالکل غیر ضروری قرار دے دیا ہے۔ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ صرف دعوتی عمل کے ذریعے وہ سب کچھ حاصل کرلیا جائے جو اسلام اور اہل اسلام کو عزت اور غلبے کے مقام تک پہنچانے کے لیے درکار ہے۔

قدیم زمانے میں اہل ایمان کو مذہبی جبر کے ماحول میں دعوتی کام کرنا پڑا تھا، اب یہ دعوتی کام پوری طرح مذہبی آزادی کے ماحول میں کیا جاسکتا ہے۔ پہلے زمانے میں حق کی پیغام رسانی کے لیے داعی کو پُرمشقت سفر کرنا پڑتا تھا، اب جدید کمیونکیشن نے اس کو ممکن بنا دیا ہے کہ خود دعوتی پیغام تیزی سے سفر کر کے دنیا بھر کے تمام لوگوں تک پہنچ سکے۔ قدیم زمانے کے داعیوں کو مختلف قسم کے توہمات کا سامنا کرتے ہوئے حق کا پیغام پھیلانا پڑتا تھا، مگر اب سائنسی انقلاب نے توہمات کا تقریباً خاتمہ کر دیا ہے، اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ کھلی ذہنی فضا میں حق کے پیغام کو عام بنایا جاسکے۔ پہلے زمانے میں معیشت کا انحصار صرف زراعت پر تھا، اس لیے داعیوں کو بہت کم وسائل کے ساتھ اپنا مشن چلانا پڑتا تھا، اب صنعتی انقلاب کے بعد معاشی فراوانی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے، جو پچھلے لوگوں کو صرف معاشی تنگی کے ساتھ کرنا پڑا تھا، وغیرہ وغیرہ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید تبدیلیوں نے دعوتی ماڈل کی افادیت اور اہمیت کو بہت

زیادہ بڑھادیا تھا۔مگر موجودہ زمانے کے مسلم رہنما صرف سلطانی ماڈل سے آشنا تھے، وہ دعوتی ماڈل کو یکسر فراموش کر چکے تھے۔انھوں نے انتہائی بے دانشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوری ملت کو سلطانی ماڈل کے طریقے پر ڈال دیا، اور پھر ملت کو بھی تباہ کیا اور خود اپنے آپ کو بھی۔

دوگونہ غلطی

جدید دور میں سلطانی ماڈل تباہ کن حد تک غیر مفید بن چکا تھا۔مگر دو سو سال کا ناکام تجربہ بھی نااہل مسلم رہنماؤں کی بے خبری کو توڑنے والا ثابت نہ ہو سکا۔انیسویں صدی اور بیسویں صدی کو مکمل طور پر کھونے کے باوجود اکیسویں صدی میں بھی وہ سلطانی دور کے اس فرسودہ ماڈل ہی کو بظاہر معیاری ماڈل سمجھ رہے ہیں۔

دورِ جدید میں ناکام سلطانی ماڈل کو دہرانے کی دو قسمیں ہیں۔اس کی پہلی قسم ہے، حکمراں کے ذریعے سلطانی ماڈل کو اپنانا اور اس کی دوسری قسم ہے، غیر حکومتی افراد یا جماعتوں کے ذریعہ اس ماڈل پر عمل کرنا۔

سلطان ٹیپو پہلی قسم کی ایک مثال ہیں جنھوں نے حکمراں کی سطح پر اسے ناکام طور پر دہرایا۔وہ قدیم سلطانی ماڈل سے باہر آکر معاملے کو سمجھ نہ سکے۔1799ء میں وہ انگریزوں کے خلاف ایک ناعاقبت اندیشانہ جنگ لڑ کر ہلاک ہو گئے۔موجودہ زمانے میں عراق کے صدر صدام حسین کی زندگی بھی اسی سلطانی ماڈل کو اختیار کرنے کی ایک ناکام مثال ہے۔

اس کے بعد اس سلطانی ماڈل کے نام پر تجربہ کی دوسری قسم شروع ہوتی ہے۔یہ دوسری قسم وہ ہے جب کہ غیر حکومتی تنظیموں نے اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف لڑائی شروع کر دی۔دوسری قسم کی اس لڑائی کا غالباً پہلا واقعہ وہ ہے جو 1831ء میں پیش آیا۔جب کہ مولانا سید احمد بریلوی اور ان کے ساتھیوں کا قافلہ مہاراجہ رنجیت سے لڑ کر بالاکوٹ میں تباہ ہو گیا۔

اس کے بعد 1857ء میں اس نوعیت کا بڑا واقعہ وہ ہوا جب کہ علما ہند کی جماعت نے انگریزوں کے خلاف مسلح جہاد شروع کیا۔ اس کے بعد غیر حکومتی تنظیموں کے ذریعہ سلطانی ماڈل کے ناکام تجربہ کا ایک طویل سلسلہ قائم ہو گیا جو تادم تحریر جاری ہے۔ فلسطین، کشمیر، بوسنیا، چیچنیا، فلپائن، اراکان اور دوسرے بہت سے مقامات پر جہاد کے نام پر جو تباہ کن مسلح ٹکراؤ ہو رہا ہے وہ سب اسی دوسرے قسم کے تجربہ کی مثالیں ہیں۔

سلطانی ماڈل کے تجربہ کی دوسری قسم جو غیر حکومتی تنظیموں کے ذریعہ گوریلا وار، پراکسی وار، وغیرہ کی صورت میں شروع ہوئی، وہ پہلی قسم سے بھی زیادہ مہلک تھی۔ اس میں بیک وقت دو غلطیاں شامل ہو گئیں۔ دعوتی دور میں سلطانی ماڈل کے طریقے کو اختیار کرنے کی خلاف زمانہ کوشش، دوسری اس سے زیادہ سنگین بات یہ کہ یہ طریقہ شرعی اعتبار سے سراسر غلط تھا۔ کیوں کہ ثابت شدہ طور پر مسلح جنگ صرف قائم شدہ حکومت کا حق ہے، غیر حکومتی تنظیموں کے لیے یہ جائز ہی نہیں کہ وہ کسی کو دشمن بتا کر اس کے خلاف مسلح ٹکراؤ شروع کر دیں۔ پہلی قسم میں سلطانی ماڈل کا تجربہ اگر صرف نادانی تھا تو دوسری قسم میں سلطانی ماڈل کا تجربہ نادانی کے ساتھ شریعت سے انحراف کے ہم معنی بن گیا۔

یہی وہ دوگونہ غلطی ہے جس نے موجودہ زمانے میں مسلم رہنماؤں کے مسلح جہاد کو سراسر ناکام بنا دیا۔ اس کا سبب کسی غیر قوم کی سازش نہیں جیسا کہ اکثر علما اور دانشور بے دلیل طور پر اعلان کرتے رہتے ہیں۔ سلطانی ماڈل ہر ایک اعتبار سے دعوتی ماڈل سے مختلف ہے۔ دعوتی ماڈل مکمل طور پر اسلام کے موافق مزاج بناتا ہے۔ اس کے برعکس، سلطانی ماڈل ایسا مزاج بناتا ہے جو ہر پہلو سے اسلامی تقاضوں کے بالکل خلاف ہو۔

اس معاملہ کی ایک مثال کشمیر اور پاکستان کا مسئلہ ہے۔ پاکستان کا تصور مکمل طور پر سلطانی طرز فکر کا نتیجہ تھا۔ پاکستانی لیڈروں کے ذہن میں اگر دعوتی ماڈل ہوتا تو وہ ہرگز جغرافی تقسیم کی بات نہ کرتے۔ ایسی صورت میں وہ اس کو خدا کی ایک رحمت سمجھتے کہ متحد

ہندستان کی صورت میں ان کو گویا ایک پورا براعظم میدان کار کے طور پر مل رہا ہے۔ ان کے ذہن میں ماضی کا سلطانی ماڈل بسا ہوا تھا۔ سلطانی ماڈل میں سارا فوکس صرف سیاسی اقتدار پر ہوتا ہے، مواقع دعوت یا مواقع کار کی سلطانی ماڈل میں کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اس بے شعوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے تقسیم کی تحریک چلا کر سارے برصغیر ہند میں نفرت (بالفاظ دیگر، مخالف دعوت) کا جنگل اگا دیا۔ سارے دعوتی امکانات مسدود ہو کر رہ گئے۔

اس غیر اسلامی اور غیر حکیمانہ سیاست کا دوسرا دور 1947ء سے شروع ہوتا ہے۔ پندرہ اگست 1947 کو جب یہ علاقہ انگریزی اقتدار سے آزاد ہوا تو یہاں دو بڑے ریاستی مسئلے تھے۔ ایک حیدرآباد کا اور دوسرا کشمیر کا۔ ریاست حیدرآباد میں ہندو اکثریت تھی مگر حکمراں مسلمان تھا۔ اس کے برعکس ریاست کشمیر میں مسلم اکثریت تھی مگر حکمراں ہندو تھا۔ اب یہ سوال تھا کہ ان دونوں ریاستوں کا سیاسی مستقبل کیا ہو۔ حیدرآباد کے نواب نے اپنا رسمی الحاق پاکستان سے کرلیا۔ اس کے برعکس، کشمیر کے راجہ نے ہندستان کے ساتھ الحاق کے کاغذات پر دستخط کر دیے۔

اس نزاع کو ختم کرنے کے لیے نئی دہلی کی لیڈر شپ نے ایک حقیقت پسندانہ پیشکش کی۔ اس نے پاکستانی لیڈروں سے کہا کہ تم حیدرآباد سے اپنا دعویٰ واپس لے لو اور ہم کشمیر سے دعویٰ واپس لے لیں۔ اس طرح یہ نزاع ختم ہو جائے گی اور دونوں ملک معتدل انداز میں ترقی کے راستے پر اپنا سفر شروع کر دیں گے۔

ہندستانی لیڈروں کی اس پیش کش کی تائید میں قرآن میں یہ واضح ہدایت موجود تھی۔ وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (8:61)۔ یعنی، اگر فریق ثانی صلح کی پیش کش کرے تو تم فوراً اس پیشکش کو قبول کرلو۔ مگر پاکستان کے لیڈر جو سلطانی ماڈل سے مسحور کن حد تک متاثر ہونے کی وجہ سے حاکمانہ نفسیات کا شکار تھے، وہ اس قیمتی پیشکش کو قبول نہ کر سکے۔ اس کے بعد جو بے پناہ تباہی آئی وہ ہر ایک کے لیے ایک معلوم واقعہ ہے۔

کشمیر کے بارے میں پاکستانی لیڈروں کی یہ ناقابل فہم نادانی تاریخی ریکارڈ سے ثابت ہے۔اس معاملے کوحسب ذیل کتابوں میں تفصیل کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے:

1. *Looking Back* by Marchand Mahajan.

2. *Witness to an Era* by Frank Morris.

3. *Emergence of Pakistan* by Chaudhary Mohali.

4. *The Nation that Lost its Soul* by Sardar Shaukat Hayat khan.

پاکستانی لیڈروں کی سلطانی نفسیات اس میں رکاوٹ بن گئی کہ وہ کشمیر کے مسئلہ کومیز کی گفت وشنید کے ذریعے حل کرسکیں۔اس کے بعدانھوں نے شدیدتر غلطی یہ کی کہ وہ فوجی طاقت کواستعمال کر کے اس مسئلہ کے حل کا خواب دیکھنے لگے۔پہلے انھوں نے براہ راست مسلح اقدام کے ذریعہ ہندستان سے فوجی ٹکراؤ کیا۔مگر اس اقدام میں انھیں مکمل ناکامی ہوئی۔ان کی سلطانی نفسیات اب بھی حقیقت پسندی کا راستہ اختیار نہیں کرسکتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے کشمیر میں ہندستان کے خلاف وہ خفیہ جنگ شروع کردی جس کو پراکسی وار(proxy war) کہا جاتا ہے۔حالانکہ یہ پراکسی وار نہ صرف پاکستان اور کشمیر دونوں کی تباہی کا ذریعہ تھی بلکہ وہ اسلامی شریعت کے اعتبار سے یقینی طور پر ناجائز بھی تھی۔کیوں کہ اسلام میں کسی کے خلاف جنگ چھیڑنے کے لیے اعلان ضروری ہے: فَانۢبِذۡ اِلَيۡهِمۡ عَلٰى سَوَآءٍ (8:58)۔

ہندستان کے خلاف اس غیر اسلامی اور غیر دانش مندانہ جنگ کو درست ٹھہرانے کے لیے پاکستان نے دوسری شدیدتر غلطیاں کیں۔مثلاً پاکستان نے اپنی خارجہ سیاست اور اپنے میڈیا کو مکمل طور پر ہندستان کو بدنام کرنے اور اس کے خلاف نفرت پھیلانے کا کارخانہ بنادیا۔کشمیر کی گوریلا وار یا پراکسی وار میں پوری طرح شامل ہونے کے باوجود وہ مسلسل طور پر اس قول زور کا سہارا لیتا رہا کہ اس جنگجوئی سے ہمارا کوئی عملی تعلق

نہیں۔ حالانکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ کشمیریوں کی جنگجوئی پوری طرح پاکستان کی مدد سے جاری ہے۔ اسی طرح ظاہری طور پر اپنے آپ کو پُرامن قوم بتانے کے لیے پاکستانی لیڈروں نے بار بار امن کے معاہدہ پر دستخط کیے— معاہدہ تاشقند (1965)، معاہدہ شملہ (1976)، معاہدہ لاہور (1998)۔

اس قسم کے تمام معاہدے اوراعلانات بھی پاکستانی لیڈروں کے غیر دعوتی ذہن کا شکار ہوتے رہے۔ کاغذ کے اوپر انہوں نے بار بار یہ لکھا کہ کشمیر کے مسئلہ کو جنگ کے بجائے پُرامن گفت وشنید کے ذریعہ حل کیا جائے۔ مگر یہ معاہدے غالباً دنیا کو دکھانے کے لیے تھے۔ کیوں کہ انہوں نے کسی بھی معاہدہ کے بعد اپنی خفیہ جنگی کارروائی کو بند نہیں کیا۔ حالانکہ قرآن کے مطابق، معاہدہ کی لفظی اور معنوی پابندی اہل اسلام کے لیے ضروری ہے: وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ‌ۚ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا (17:34)۔

پاکستان کے لیڈر اگر اپنے سلطانی ماڈل سے باہر آئیں اور دعوتی ماڈل کو بنیاد بنا کر سوچیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ ان کے لیے قرآن میں واضح رہنمائی موجود ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ دنیا میں بہر حال ہر فرد اور قوم کو مصیبت کا تجربہ ہوتا ہے۔ یہاں انسان کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کا جواب قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے— لِّكَيۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰٮكُمۡ (57:23)۔ یعنی، تاکہ تم غم نہ کرو اس پر جو تم سے کھویا گیا۔ اور نہ اس چیز پر فخر کرو جو اس نے تم کو دیا۔

قرآن کی اس آیت میں پاکستانی لیڈروں کے لیے یہ رہنمائی ہے کہ کشمیر کو وہ اسی طرح اختیارانہ طور پر کھوئے ہوئے خانے میں ڈال دیں، جس طرح وہ 1971 میں مشرقی پاکستان کو مجبورانہ طور پر کھوئے ہوئے خانے میں ڈال چکے ہیں۔ کشمیر میں اپنی موجودہ مایوسانہ سیاست کو ختم کردیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ کشمیر کے معاملے میں صورت موجودہ (status quo) کو مان کر ہندستان سے معتدل تعلقات قائم کرلیں اور منفی

سیاست کا طریقہ چھوڑ کر مثبت سیاست کا طریقہ اختیار کریں۔ اس طرح ان کی ترقی کا وہ دروازہ کھل جائے گا جو آدھی صدی سے بھی زیادہ مدت سے ان کے اوپر بند پڑا ہوا ہے۔

خلاصۂ بحث

اکیسویں صدی میں پہنچ کر اب آخری وقت آ گیا ہے کہ تمام مسلم رہنما توبہ کے شرعی اصول پر عمل کریں۔ وہ اپنی دوسوسالہ غلطی کا کھلے طور پر اعتراف کریں۔ اور دعوتی ماڈل کے اصول پر اپنے اسلامی عمل کی از سرنو منصوبہ بندی کریں۔ اس اعتراف اور تصحیح عمل سے کم کوئی چیز موجودہ تباہ کن صورت حال کو بدلنے والی نہیں۔

ربّانی تعقّل

قرآن میں بنیادی طور پر دو قسم کی تعلیمات ہیں۔ ایک وہ جن کو احکام کہا جاتا ہے۔ اور دوسرے وہ جو تفکّر اور تدبّر سے تعلق رکھتی ہیں۔ اوّل الذکر کی حیثیت اگر عملی ہے تو ثانی الذکر کی حیثیت فکری۔

قرآن میں دونوں ہی قسم کی تعلیمات اجمالی انداز میں آئی ہیں۔ یہ کام علما اسلام کا ہے کہ وہ قرآن وحدیث کی رہنمائی میں اس اجمال کی تفصیل کریں۔ جہاں تک احکام کا تعلق ہے، ان کی تفصیل اور تدوین فقہ کی صورت میں کی گئی ہے۔ یہ کام بہت بڑے پیمانے پر ہوا ہے۔ اس کو بنیادی طور پر ایک کامیاب کوشش کہا جا سکتا ہے۔ جہاں تک تفکّر اور تدبّر والے حصہ کا تعلق ہے، ان کے سلسلے میں بھی پچھلے ہزار سال کے دوران مقدار کے اعتبار سے کافی کام ہوا ہے۔ مگر وہ بڑی حد تک غیر اطمینان بخش ہے۔ یہ کہنا غالباً درست ہوگا کہ اس پہلو سے جو لٹریچر تیار ہوا ہے وہ زمانی افکار سے اتنا زیادہ متاثر ہے کہ قرآن کی حقیقی روح اس میں اوجھل ہو گئی ہے۔

اس موضوع پر کام کرنے والوں کا پہلا گروہ وہ ہے جن کو متکلمین کہا جاتا ہے۔ یہ گروہ ابتداءً عباسی خلافت کے زمانے میں پیدا ہوا۔ اس گروہ کے مشہور ناموں میں سے الفارابی (وفات 950ء)، ابن رشد (وفات 1198ء) اور الرازی (وفات 1210ء)، وغیرہ ہیں۔ متکلمین کے اس گروہ نے قرآنی تفکّر اور تدبّر کے اظہار کے لیے جس فکری ماڈل کو اپنایا، وہ یونانی فلسفے کا ماڈل تھا۔ یہ فلسفہ قیاسی منطق کے اصول پر قائم تھا۔ اس لیے وہ بذات خود ایک غیر حقیقی ماڈل تھا۔ اس ماڈل پر قرآن کے فکری اجمال کی جو تفصیل کی گئی وہ بڑی حد تک مَنْ تَمَنْطَقَ تَزَنْدَقَ (جو شخص منطق میں الجھے، وہ دین سے بھٹک جاتا ہے) کی مصداق تھی۔ اس پورے مجموعے پر فارسی شاعر کا یہ شعر صادق آتا ہے:

فلسفی سر حقیقت نتوانست کشود گشت راز دگر آں راز کہ افشا می کرد

سلسلہ کا دوسرا گروہ وہ ہے جس نے وحدت وجود کے تصور پر قرآنی عقلیت کو واضح کرنا چاہا۔ اس کا ایک لفظ میں وحدانی تعقّل کہا جاسکتا ہے۔ اس طبقے کی چند مشہور کتابیں یہ ہیں: ابن العربی کی کتاب الفتوحات المکیۃ، مولانا روم کی مثنوی، علامہ اقبال کی تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (Reconstruction of Religious Thought in Islam)۔

یہ طریقہ جس کو ہم نے وحدانی تعقّل کا نام دیا ہے، وہ اوّل الذکر یونانی تعقّل سے بھی زیادہ غلط تھا۔ اوّل الذکر کو اگر عقلی چیستاں کہا جائے تو یہ دوسرا طریقہ کھلی ہوئی ذہنی گمراہی تھا۔ اس طریقے میں توحید کے عقیدہ کو وحدت وجود (Monism) کے تصور پر ڈھال دیا گیا۔ جب کہ اسلام میں توحید کا عقیدہ وحدت خدا (monotheism) کے اصول پر قائم ہے۔ وحدت وجود کا نظریہ سراسر ضلالت ہے اور وحدت خدا کا نظریہ سراسر ہدایت۔

موجودہ زمانے میں مسلم اہل قلم کا ایک اور گروہ پیدا ہوا جس نے اسلامی عقلیت کو سیاسی تعقّل کے ہم معنی بنا دیا۔ اس گروہ نے اسلام کی تعلیمات کو سیاسی اصطلاحوں میں بیان کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے لاالہ الااللہ کو لاحاکم الااللہ کے ہم معنی قرار دیا۔ اس گروہ میں مصر کے سید قطب اور پاکستان کے سید ابوالاعلیٰ مودودی، وغیرہ شامل ہیں۔

سیاسی تعقّل کا طریقہ، اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسلامی تعقّل کی تصغیر تھا۔ اس تشریح میں عقیدہ اسلامی کی آفاقی وسعت سیاست کے محدود دائرہ میں سمٹ کر رہ گئی۔ اسلامی تعقّل کی اس سیاسی تشریح کے نتیجے میں ایک اور ہلاکت خیز انجام سامنے آیا۔ جو لوگ اس تشریح سے متاثر ہوئے انہیں کرنے کا کام صرف یہ نظر آیا کہ وہ وقت کے سیاسی ڈھانچے کو توڑیں اور اس کی جگہ اپنے مزعومہ نقشے کے مطابق، نیا نظام بنائیں۔ اس طرح اس سیاسی تشریح نے مسلم دنیا میں اس تخریبی سیاست کو مزید شدت کے ساتھ جنم دیا جس کا ایک نمونہ کمیونزم کو ماننے والوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔

قرآن کے مطابق، تفکّر اور تدبّر کی تشریح کا صحیح طریقہ وہ ہے جس کو ربّانی تعقّل کہا

جاسکتا ہے۔ یعنی قرآن کے اشارات کو رہنما بنا کر تخلیقِ خداوندی کا مطالعہ کرنا اور حقائق فطرت کی روشنی میں ان کی تشریح وتفصیل کرنا۔ مطالعے کا یہی اسلوب حقیقی اسلوب ہے۔ اس سے وہ اہل ایمان پیدا ہوتے ہیں جو معرفت الٰہی اور خشیت ربّانی کی نعمت سے سرشار ہوں۔ قرآن کی سورہ آل عمران کے آخری رکوع میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات پر بھی اس حقیقت کی طرف بار بار اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کی دو قرآنی آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر ہم نے اس سے مختلف رنگوں کے پھل پیدا کردیے۔ اور پہاڑوں میں بھی سفید اور سرخ مختلف رنگوں کے ٹکڑے ہیں اور گہرے سیاہ بھی۔ اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور چوپاؤں میں بھی مختلف رنگ ہیں۔ اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔ بے شک اللہ زبردست ہے، بخشنے والا ہے (35:27-28)۔

ربّانی تعقّل کی تشریح کے لیے موجودہ زمانے میں نئے وسیع امکانات کھل گئے ہیں۔ جدید سائنس کی تحقیقات نے موجودہ زمانے میں فطرت کی جن چھپی ہوئی حقیقتوں کو دریافت کیا ہے وہ گویا اسی ربّانی تعقّل کی تفصیل ہیں۔ ربّانی تعقّل کے ان جدید امکانات کو پیشگی طور پر قرآن میں بتا دیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں قرآن کی ایک متعلق آیت کا ترجمہ یہ ہے: ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی اور خود ان کے اندر بھی۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہوجائے گا کہ یہ قرآن حق ہے (41:53)۔

احمد اور الترمذی نے حضرت انس بن مالک کے حوالہ سے ایک حدیث نقل کی ہے۔ اس کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَثَلُ أُمَّتِي مَثَلُ الْمَطَرِ؛ لَا يُدْرَى أَوَّلُهُ خَيْرٌ أَمْ آخِرُهُ (مسند احمد، حدیث نمبر 12461)۔ یعنی، میری امت کی مثال بارش کی مانند ہے۔ نہیں معلوم کہ اس کا اوّل بہتر ہوگا یا اس کا آخر۔

بارش جب ہوتی ہے تو اس کے ابتدائی دور میں بھی انسان کو بہت سی برکتیں حاصل

ہوتی ہیں۔ مگر بعد کے مرحلے میں جب بارش سے سیراب ہو کر زمین سبزہ اور درخت اگاتی ہے تو اس دوسرے مرحلہ میں اس کی برکتیں اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ اب فصل اور پھول اور پھل، وغیرہ پیدا ہوتے ہیں جو انسان کے لیے بے پناہ خیر و برکت کا ذریعہ ہیں۔

یہی معاملہ دین محمدی کا ہے۔ دین محمدی کا ظہور ہوا تو اس وقت دنیا اپنے روایتی دور میں تھی۔ اس دور میں بھی اس دین کے پیروؤں کو اس سے بے پایاں فائدے حاصل ہوئے۔ بعد کے زمانہ میں جب کہ دنیا سائنسی دور میں داخل ہوگی تو اس وقت بھی اس دین کے پیروؤں کو نئے امکانات کے اعتبار سے عظیم فائدے حاصل ہوں گے۔ دین کی علمی وفکری عظمت ازسرنو نئی شان کے ساتھ لوگوں کے ذہنوں پر قائم ہو جائے گی۔

اس حدیث میں امت کے دور آخر میں جس عظیم خیر کی پیشین گوئی کی گئی ہے اس سے مراد غالباً وہی سائنسی حقیقتیں ہیں جنہوں نے نئے وسیع تر انداز میں اس امکان کا دروازہ کھول دیا کہ انسان ان کو استعمال کر کے یقین کے اعلیٰ درجات حاصل کرے۔ اور اسلام کی صداقت کو نئے دلائل و براہین کے ذریعہ لوگوں کے اوپر ثابت شدہ بنائے۔

ایک سادہ مثال

مذکورہ حدیث میں جس حقیقت کو بتایا گیا ہے اس کو اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو وہ یہ ہوگی کہ انسانی تاریخ دو بڑے دور ہیں۔ ایک قبل از سائنس دور (prescientific period) اور دوسرا بعد از سائنس دور (post. scientific period)، اس تقسیم کے مطابق، پہلے دور کا انسان روایتی معلومات کی روشنی میں سوچتا تھا۔ اور دوسرے دور میں وہ سائنسی معلومات کی روشنی میں سوچنے لگا۔ اس حدیث کے مطابق، امت محمدی کے افراد کے لیے روایتی دور بھی ایمانی خوراک کا ذریعہ تھا۔ اسی طرح سائنسی دور میں بھی وہ اپنے ایمانی اضافہ

کے لیے علمی خوراک حاصل کرتے رہیں گے۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے یہاں ایک سادہ مثال درج کی جاتی ہے۔

قرآن میں بار بار زمین کی نعمتوں کا ذکر آیا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک قرآنی آیت یہ ہے: اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا (40:64)۔ یعنی، وہ اللہ ہے جس نے بنایا تمہارے لیے زمین کو ٹھہراؤ۔ اس آیت میں روایتی دور کے مؤمنین کو بھی ایمان کی غذا ملی تھی۔ یہ سوچ کر ان کا سینہ شکرِ خداوندی کے جذبے سے سرشار ہو گیا تھا کہ زمین کس طرح ان کے لیے پرسکون جائے قیام بنی ہوئی ہے۔ اگر زمین ہلتی رہتی یا وہ ہچکولے کھاتی تو اس کے اوپر پرسکون زندگی گزارنا کس قدر دشوار ہو جاتا۔

جدید سائنسی دور میں نئے ذرائع سے جو مطالعہ کیا گیا اس سے معلوم ہوا کہ زمین، سابق تصور کے خلاف ساکن اور بے حرکت نہیں ہے بلکہ وہ مسلسل حرکت میں ہے۔ نئی تحقیقات بتاتی ہیں کہ زمین بیک وقت دو طریقہ سے گردش کر رہی ہے۔ ایک اپنے مدار (orbit) پر سورج کے گرد، اور دوسرے خود اپنے محور (axis) کے اوپر۔ اس نئی سائنسی تحقیق نے مذکورہ آیت کی معنویت کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ نئے حالات میں یہ آیت گویا مزید اضافے کے ساتھ یہ کہہ رہی ہے کہ — کیسا مہربان ہے وہ جس نے زمین کو تمہارے لیے جائے سکون بنایا، باوجود یہ کہ زمین مسلسل طور پر دہرا حرکت کر رہی ہے۔

It is Allah who made the earth a stable home for you, despite its continuous dual motion of rotation and revolution.

حدیث کی تمثیل کے مطابق "بارش" کے پہلے دور میں اگر انسان سادہ طور پر سمجھ کر زمین کو اپنے لیے خدا کی رحمت جانتا تھا کہ وہ اس کے لیے پرسکون جائے قیام بنی ہوئی ہے، تو اب بارش کے دوسرے دور میں وہ اس اضافے کے ساتھ اس معاملے میں خدا کا شکر کرے گا کہ دہرا طور پر مسلسل حرکت میں ہونے کے باوجود خدا نے زمین کو اس کے لیے سکون کا مقام بنا دیا ہے۔

کائنات کا ابتدائی دھماکہ

ربّانی تعقّل کی ایک مثال یہاں نقل کی جاتی ہے۔ قرآن کی سورہ نمبر 21 میں کائناتی واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین بند تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا۔ اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا۔ کیا پھر بھی وہ ایمان نہیں لاتے (21:30)۔

اس آیت میں رتق اور فتق کا لفظ ہے۔ رتق کے معنی ہیں کسی مجموعہ کا مخلوط یا منضم ہونا۔ اس سے مراد کائنات کا اصل مادہ ہے جو ابتدائی وقت میں ایک منضم الاجزاء کی صورت میں تھا۔ پھر اس ابتدائی مجموعہ میں دھماکہ ہوا جس کے بعد اس کے اجزاء وسیع خلا میں بکھر گئے اور پھر ایک لمبے عمل کے بعد موجودہ کائنات بنی۔ قرآن کی اس آیت کو قدیم مفسرین اس کے سادہ لفظی مفہوم کے اعتبار سے لیتے تھے۔ اپنے سادہ لفظی مفہوم کے اعتبار سے بھی یہ آیت اہل حق کے لیے عظیم ایمانی فائدے رکھتی ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں جو تحقیقات ہوئی ہیں ان سے قرآن کے اس مجمل بیان کی تفصیل سامنے آئی ہے جو گویا یقین اور معرفت کا نیا دروازہ کھولنے والی ہے۔

جدید فلکیاتی سائنس بتاتی ہے کہ تقریباً بیس بلین سال پہلے خلا میں ایک سپر ایٹم تھا۔ اس میں اچانک دھماکہ ہوا۔ اس کے بعد اس کے اجزاء وسیع خلا میں پھیل گئے اور آخر کار انہوں نے موجودہ کائنات کی صورت اختیار کی۔ اسی سے موجودہ تمام اجرام بنے جن میں سے ایک ہماری یہ زمین بھی ہے۔

دھماکہ (explosion) کی دو قسمیں ہیں۔ منصوبہ بند دھماکہ، اور منصوبہ کے بغیر خود بخود ہونے والا دھماکہ۔ تجربہ بتاتا ہے کہ دونوں قسم کے دھماکوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ بلا منصوبہ جو دھماکے ہوتے ہیں وہ صرف تخریب کا سبب بنتے ہیں۔ مثلاً کسی بم یا بم کے

ذخیرے کا اپنے آپ پھٹ جانا۔ اس قسم کا دھماکہ ہمیشہ تخریبی نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ دوسرا دھماکہ وہ ہے جو سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت کیا جائے۔ مثلاً پہاڑ کے درمیان سے سرنگ نکالنے کے لیے منصوبہ بند طور پر چٹانوں میں دھماکہ کرنا۔ اس دوسری قسم کا دھماکہ ہمیشہ مفید اور تعمیری نتیجہ پیدا کرتا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، کائنات کے آغاز میں سائنس کی تحقیق کے مطابق، بگ بینگ (big bang) کی صورت میں دھماکہ ہوا، اس سے انتہائی مفید اور بامعنی نتائج پیدا ہوئے۔ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ یہ دھماکہ یقینی طور پر ایک منصوبہ بند دھماکہ تھا۔ ایک منصوبہ ساز ہستی نے اپنے متعین منصوبے کے تحت اپنے نقشے کے مطابق، بالقصد یہ دھماکہ کیا۔ چنانچہ اس سے عین وہی بامعنی نتائج ظاہر ہوئے جو منصوبے کے مطابق اس سے مطلوب تھے۔

اس جدید تشریح کے مطابق، مذکورہ آیت کے یہ الفاظ کہ کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا — اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا (21:30) — نہایت بامعنی ہو جاتے ہیں۔ کائنات کا یہ ثابت شدہ آغاز خالص علم انسانی کی سطح پر اس حقیقت کو ثابت کر رہا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے۔ اس نے نہایت بامعنی منصوبے کے تحت اس کائنات کو بنایا ہے۔ اس حقیقت کے ثابت ہونے کے بعد یہ بات اپنے آپ ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان اور کائنات کی تخلیق بے مقصد نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ فرمایا: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (3:191)۔ یعنی، اے ہمارے رب، تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا۔ اس کھلی حقیقت کے باوجود جو لوگ کائنات کی معنویت کا انکار کریں ان کے لیے اپنے اس انکار کی کوئی بھی معقول وجہ موجود نہیں۔

ربّانی تعقّل کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ سائنس کے تمام مضامین قرآن میں موجود ہیں، یا یہ کہ ساری کی ساری سائنس خود قرآن سے اخذ کی گئی ہے۔ اس قسم کی

باتیں اسلام اورسائنس دونوں سے بےخبری کا نتیجہ ہیں۔اس قسم کی بات اصلاً قرآن کی تفسیر نہیں ہے بلکہ وہ قرآن کے حوالے سے اپنے قومی فخر کو ثابت کرنے کی ایک بے فائدہ کوشش ہے۔اس سے زیادہ اس کی کوئی اور حیثیت نہیں۔

ربّانی تعقّل کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے وہ بیانات جن کے بارے میں جدید سائنسی تحقیقات کے ذریعے نئ حقیقتیں دریافت ہوئی ہیں، ان کی روشنی میں قرآن کے اشارات کو تفصیلی انداز میں بیان کرنا۔ یہ وہی چیز ہے جس کی بابت حدیث میں آیا ہے کہ — لَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3130)۔یعنی، قرآن کے عجائب (wonders) کبھی ختم نہ ہوں گے۔اس حدیث میں مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کی گئی ہے۔ان میں سے ایک یقینی طور پر یہ بھی ہے کہ بعد کے زمانے میں دریافت ہونے والے سائنسی حقائق قرآن کی معنویت کو مزید نمایاں کریں گے۔اس طرح قرآن کے کمالات کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

زوجین کی مثال

قرآن کی سورہ نمبر 51 میں ارشاد ہوا ہے: وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (51:49)۔یعنی، ہم نے ہر چیز کو جوڑا بنایا تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔قرآن کی آیت میں موجودہ دنیا کے ایک ظاہرہ کا ذکر کرکے انسان کو متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ اس پر سوچے اور اس سے نصیحت حاصل کرے۔اس ظاہرے کی طرف قرآن میں زوجین کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔

اس آیت میں زوجین کی تفسیر پچھلے مفسرین نے مختلف انداز سے کی ہے۔ان تفسیروں میں بہرحال نصیحت کا سامان ہے۔مگر موجودہ زمانے میں جو تحقیقات ہوئی ہیں ان کا اضافہ کرتے ہوئے اس آیت کا مطالعہ کیا جائے تو اس سے نیا یقین حاصل ہوتا ہے۔اور یہ آیت، قرآن کے الفاظ میں، ایمان کے ساتھ ایمان میں اضافہ (48:4) کا سبب بن جاتی ہے۔

جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ زوجین کا اصول جو انسانوں میں ہے وہی دنیا کی ہر چیز میں پایا جاتا ہے۔ ہر چیز اپنے زوج کے بغیر نامکمل ہے، وہ اسی وقت مکمل ہوتی ہے جب کہ اس کے زوج کے ساتھ اس کو شامل کیا جائے۔ مادّی ایٹم میں منفی ذرّہ (negative particle) کے ساتھ مثبت ذرّہ (positive particle) کا ہونا۔ اسی طرح نباتات میں بھی زوجین یا نر اور مادہ کا اصول ہے۔ ان میں سے ایک کو میل فلاور (staminate flower) کہا جاتا ہے۔ اور دوسرے کو فیمیل فلاور (pistillate flower)۔ اسی طرح حیوانات میں بھی جوڑے ہیں۔ ان میں سے نر کو ہی میل (he-male) اور مادہ کو شی میل (she-male) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح انسانوں میں بھی جوڑے ہیں جن کو ہم عورت اور مرد کے نام سے جانتے ہیں۔

زوجین کے عمومی اصول کو لے کر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس عموم میں ایک استثناء ہے، اور وہ ہماری انسانی دنیا ہے۔ انسانی دنیا اپنے سارے ہنگاموں کے باوجود ایک نامکمل دنیا ہے۔ اس کی تکمیل کے لیے اس کا ایک جوڑا (زوج) درکار ہے۔ مگر یہ جوڑا موجودہ دنیا میں ملتا ہوا نظر نہیں آتا۔

تجربہ یہ بتاتا ہے کہ موجودہ انسانی دنیا ایک مبنی بر مفاد دنیا ہے۔ یہاں سارے انسانی تعلقات مفاد کے اصول پر قائم ہیں۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک بااصول معیاری دنیا (ideal world) چاہتا ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں وسائل کی محدودیت اور انسان کی آزادی جیسے مختلف اسباب ہیں جو فیصلہ کن طور پر اس میں رکاوٹ ہیں کہ یہاں وہ معیاری دنیا بن سکے جو انسان اپنے فطری تقاضے کے تحت چاہتا ہے۔

اس کمی کا تقاضا ہے کہ موجودہ دنیا کا ایک جوڑا (زوج) ہو جو اس کمی کو پورا کر کے اس کی تکمیل کرے۔ موجودہ دنیا مبنی بر مفاد دنیا ہے۔ اب اس کا جوڑا (زوج) ایک ایسی دنیا ہے جو مبنی بر اقدار (value based) دنیا ہے۔ ایسی ایک دنیا ہی موجودہ دنیا کی کمی کی

تلافی کر کے اس کی تکمیل کرسکتی ہے۔ اسی تکمیلی دنیا کا نام آخرت ہے۔آخرت میں خدا نے جنت کی جو دنیا بنائی ہے وہ ہر قسم کی کمیوں اور محدودیتوں سے پاک ہے۔ وہ خوف اور حزن سے مکمل طور سے خالی ہے۔ وہاں وہ تمام اسباب کامل طور پر موجود ہیں جو انسان کو یہ موقع دیں کہ وہ بھرپور آسودگی (complete fulfillment) کے ساتھ زندگی گزار سکے۔

موجودہ دنیا میں ہر چیز کا جوڑا ہونا اور صرف ایک چیز کا جوڑا نہ ہونا اس بات کا قرینہ ہے کہ یقینی طور پر اس کا بھی ایک جوڑا موجود ہے۔ بقیہ چیزوں کے جوڑے کو موجودہ دکھائی دینے والی دنیا میں رکھ دیا گیا ہے مگر امتحان کی مصلحت کی بنا پر انسانی دنیا کے اس جوڑے کو نہ دکھائی دینے والی دنیا میں رکھا گیا ہے۔ مرنے کے بعد تمام انسان اسی اگلی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور وہاں وہ جوڑے کو عملی طور پر پالیتے ہیں۔

ربّانی تعقّل کا موضوع ایک بے حد وسیع موضوع ہے۔اس کے مختلف پہلو ہیں۔ یہاں چند مثالیں صرف موضوع کی وضاحت کے طور پر درج کی گئی ہیں۔ ربّانی تعقّل کے موضوع پر راقم الحروف نے اپنی دوسری کتابوں میں اس کے دیگر پہلوؤں کی وضاحت کی کوشش کی ہے۔ وہاں اس موضوع کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔

پاکستان کے لیے انتخاب

Choice before Pakistan

دریا کا سامنا چٹان سے ہو تو وہ اپنا راستہ بدل کر آگے بڑھ جاتا ہے مگر نادان انسان چاہتا ہے کہ وہ چٹان کو توڑ کر اپنا راستہ بنائے، خواہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ اس کا سفر ہی ہمیشہ کے لیے رک جائے۔

موجودہ حالت میں پاکستان کے لیے جو انتخاب (choice) ہے، وہ جمہوری حکومت اور فوجی حکومت کے درمیان نہیں ہے، بلکہ حقیقی انتخاب جن دو حالتوں کے درمیان ہے، وہ یہ کہ پاکستان کا سفر جس بندگلی (impasse) پر آ کر رک گیا ہے، وہاں سے وہ اپنے آپ کو نکال کر اپنا سفر دوبارہ شروع کرے، یا وہ اسی بندگلی میں بدستور پڑا رہے۔ یہاں تک کہ وہ قوموں کے عالمی روڈ میپ سے غیر موجود ہو جائے۔

کسی قوم کی زندگی میں بعض اوقات ایسا لمحہ آتا ہے جب کہ قوم کا ترقیاتی سفر رک جاتا ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ ایک جرأت مندانہ فیصلہ کیا جائے تا کہ دوبارہ قوم کا سفر معتدل انداز میں جاری ہو سکے۔ اس قسم کا نازک فیصلہ اکثر اوقات عوامی جذبات کے خلاف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا جرأت مندانہ فیصلہ اکثر ایسے افراد کرتے ہیں جو فوجی حکمراں کی حیثیت رکھتے ہوں۔ جمہوری حکمراں اس قسم کا جرأت مندانہ فیصلہ نہیں لے سکتا۔ کیوں کہ وہ عوام کی رایوں سے چن کر حکومت تک پہنچتا ہے، اس بنا پر اس کے لیے ایسا کوئی انقلابی فیصلہ لینا ناممکن ہو جاتا ہے جو عوامی احساسات سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔

یہاں میں اس نوعیت کی دو مثالیں پیش کروں گا۔ مسلم تاریخ میں اس کی ایک مثال صلاح الدین ایوبی (وفات 1193ء) کی ہے۔ صلاح الدین کا یہ عظیم کارنامہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے صلیبی قوموں کی فوجی یلغار سے مسلم دنیا کو بچایا۔ مگر صلاح الدین کو یہ طاقتور حاکمانہ

حیثیت کیسے ملی جبکہ وہ اپنا عظیم رول ادا کر سکے۔ جیسا کہ معلوم ہے، صلاح الدین ایوبی مصر کے سلطان نورالدین زنگی کا ایک فوجی افسر تھا۔ سلطان نورالدین کی موت کے بعد اگرچہ اس کے بیٹے موجود تھے، لیکن صلاح الدین نے حکومت پر قبضہ کر کے سلطان کا منصب حاصل کرلیا۔ مسلم مؤرخین نے عام طور پر صلاح الدین کے قبضے کی کارروائی کو جائز قرار دیا ہے۔ کیوں کہ یہ قبضہ اگرچہ بظاہر غیر آئینی تھا لیکن اپنے نتیجے کے اعتبار سے وہ ایک عظیم سیاسی فائدے کا سبب بنا۔ اسی نے صلاح الدین ایوبی کے لیے اس امر کو ممکن بنایا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے اپنا وہ عظیم کردار ادا کر سکے جو کہ اس نے اس کے بعد ادا کیا۔

دوسری مثال فرانس کے چارلس ڈیگال (وفات 1970) کی ہے۔ وہ فرانس کی فوج میں ایک جنرل تھا۔ اس کے بعد اس نے حالات سے فائدہ اٹھا کر فرانس کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

کیونکہ جو حکمران عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر آئے وہ عوامی جذبات کو نظر انداز کر کے کوئی جرأت مندانہ فیصلہ نہیں لے سکتا۔ جبکہ بعض حالات میں کسی قوم کی نجات کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ عوامی جذبات کو نظر انداز کر کے ایک جرأت مندانہ فیصلہ لیا جائے۔

جیسا کہ معلوم ہے، اس وقت فرانس نے افریقہ کے کئی ملکوں مثلاً الجزائر پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اور ان کو فرانس کے صوبے (province) کہتا تھا۔ یہ غیر حقیقت پسندانہ پالیسی فرانس کے لیے اتنی زیادہ مہلک ثابت ہوئی کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد جاری ہونے والی ترقیاتی دوڑ میں وہ یورپ کا ایک "مرد بیمار" بن گیا۔ ڈیگال نے قومی جذبات سے الگ ہو کر اس مسئلہ پر غور کیا۔ اس کی سمجھ میں آیا کہ اس مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ افریقہ کی فرانسیسی کالونیوں کو یک طرفہ طور پر آزاد کر دیا جائے۔ یہ اقدام فرانس کے عوام کے جذبات کے سراسر خلاف تھا مگر یہی غیر مقبول فیصلہ ہے جس نے فرانس کو جدید ترقیاتی دوڑ میں ایک بڑی طاقت کی حیثیت دے دی۔

پاکستان کی موجودہ صورت حال بھی عین یہی ہے۔ کشمیر کے سوال پر انڈیا کے خلاف پاکستان کی بلا اعلان جنگ (undeclared war) نے پاکستان کو اتنا زیادہ نقصان پہنچایا ہے کہ اپنی تباہی کے آخری کنارے پر پہنچ چکا ہے۔ دنیا اس کو سب سے زیادہ غیر محفوظ ملک (unsafest country) کے طور پر دیکھتی ہے۔ عالمی مالیاتی ادارے پاکستان میں سرمایہ کاری (investment) کے لیے تیار نہیں۔ پاکستانی عوام کی بے چینی (unrest) نے ملک میں خانہ جنگی (civil war) جیسی صورتحال پیدا کر دی ہے۔ ملک کے مذہبی اور تعلیمی اور ثقافتی ادارے تخریبی سرگرمیوں کے مرکز بن گئے ہیں۔

ان خرابیوں کا سب سے زیادہ اندوہناک انجام وہ ہے جس کو برین ڈرین (brain drain) کہا جاتا ہے۔ انسان فطری طور پر ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ اس لیے کسی ملک کی ترقی کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ وہاں کے لوگوں کو عمل کے کھلے مواقع دکھائی دیتے ہوں۔ مثلاً وہاں امن ہو، بہترین انفراسٹرکچر (infrastructure) ہو۔ آدمی کو اپنی محنت کا پورا صلہ ملتا ہوا نظر آئے۔ اگر کسی ملک میں یہ مواقع پوری طرح موجود ہوں تو اس ملک میں ہر آدمی اپنے آپ سرگرم ہو جائے گا اور ملک خود بخود ترقی کرنے لگے گا۔ مگر بدقسمتی سے پاکستان میں ایسا نہ ہو سکا۔ پاکستان میں ”پہلے صورت موجودہ (statuesque) کو بدلو“ کے نظریے کے نتیجے میں مسلسل طور پر ہنگامی صورتحال باقی ہے۔ وہاں عملی طور پر افراد کے لیے حسب حوصلہ کام کے مواقع تقریباً ختم ہو گئے ہیں۔ چنانچہ بیشتر حوصلہ منداور باصلاحیت افراد پاکستان چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ امریکہ کے سفروں کے دوران میں نے امریکہ میں مقیم بہت سے پاکستانیوں سے پوچھا کہ آپ اپنے ملک کو چھوڑ کر یہاں کیوں آ گئے۔ تقریباً سب کا ایک ہی جواب تھا کہ امریکا میں کام کے مواقع ہیں جب کہ پاکستان میں کام کے مواقع نہیں۔

کشمیر کے بارے میں پاکستان کی غیر حقیقت پسندانہ پالیسی پاکستان کے ترقیاتی سیلاب کے لیے ٹریپ ڈور (trap door) بنی ہوئی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ پاکستان موجودہ زمانے میں ترقیاتی دوڑ میں بچھڑ گیا ہے۔ پاکستان کو اس پچھڑے پن سے نکالنے کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ پاکستان مسائل سے ٹکرانے کی بجائے مواقع کو استعمال (avail) کرنے کی پالیسی اختیار کرے۔ موجودہ حالات میں اسکی عملی صورت یہ ہے کہ پاکستانی لیڈر کشمیر کے معاملہ میں صورت موجودہ (status quo) کو علی حالہ ماننے پر راضی ہوجائیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ کشمیر میں قبضہ کی لائن (LoC) کو ضروری ایڈجسٹمنٹ کے ساتھ دونوں ملکوں کے درمیان تسلیم شدہ سرحد قرار دیا جائے۔ اس معاملہ میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جو جغرافی اور سیاسی اسٹیٹس کو (political status quo) بن گیا ہے اس کو مان کر اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ مزید یہ کہ اس طرح کا انقلابی فیصلہ صرف ایک غیر جمہوری حکمران ہی کر سکتا ہے۔ کسی جمہوری حکمران کے لیے ایسا غیر جذباتی فیصلہ لینا ممکن نہیں۔

میرے نزدیک صدر پرویز مشرف کے لیے یہی تاریخی کام مقدر ہے۔ اس معاملہ میں جو لوگ صدر مشرف کے حق اقتدار پر سوال اٹھا رہے ہیں ان کا جواب سابق فوجی صدر محمد ضیاء الحق کی مثال میں موجود ہے۔ اس سے پہلے جنرل محمد ضیاء الحق نے یہی کیا تھا کہ پاکستان کے اقتدار پر فوجی قبضہ کیا۔ اور پھر خود ساختہ کارروائی کے ذریعہ اپنے صدرِ مملکت ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس وقت پاکستان کے اسلام پسندوں سے لے کر امریکہ کے محکمہ خارجہ تک ہر ایک نے اس کو قبول کر لیا اور قانونِ ضرورت (law of necessity) کے تحت اس کو جائز قرار دیا۔ یہ نظیر کافی ہے کہ صدر پرویز مشرف کو بھی اسی دلیل کے ساتھ قبول کر لیا جائے۔ یہ ایک منافقانہ کردار ہے کہ جہاں ذاتی انٹرسٹ دکھائی دے وہاں آدمی پریکٹیکل بن جائے اور جہاں ذاتی انٹرسٹ کا معاملہ نہ ہو وہاں وہ آئیڈیلزم کی بات کرنے لگے۔

پاکستان میں جنرل پرویز مشرف کا اقتدار سنبھالنا اور پھر 20 جون 2001 کو ملک کے صدر کی حیثیت سے حلف لینا بظاہر ایک غیر آئینی واقعہ ہے مگر میرے نزدیک وہ ایک بالکل بر وقت واقعہ ہے۔ موجودہ صورتحال میں پاکستان کو جو جرأت مندانہ فیصلہ لینا ہے وہ صدر پرویز مشرف جیسا فوجی حکمران ہی لے سکتا ہے۔ انتخابات کے ذریعہ بننے والے کسی جمہوری حکمران کے لیے ایسا غیر جذباتی فیصلہ لینا ممکن ہی نہیں۔

اس مسئلہ کا واحد علاج یہ ہے کہ پاکستان اپنی جذباتی پالیسی کو چھوڑ کر حقیقت پسندانہ پالیسی اختیار کرے۔ وہ کشمیر کے سوال پر ہندوستان سے سمجھوتہ کر لے تاکہ ملک میں امن کی فضا پیدا ہو اور ملکی ذرائع کو تعمیری سرگرمیوں کی طرف موڑا جا سکے۔

پچھلے 55 سال سے پاکستان کی سیاست ایک ہی سوال پر مرتکز رہی ہے۔ اور وہ ہے کشمیر میں قائم شدہ سیاسی حالت (political status quo) کو بدلنا۔ اب آخری طور پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ پالیسی ایک تباہ کن پالیسی ہے۔ وہ سرے سے کوئی مثبت نتیجہ پیدا کرنے والی ہی نہیں، نہ ماضی اور نہ حال میں اور نہ ہی مستقبل میں۔

مذکورہ قسم کا انقلابی فیصلہ لینا یقینی طور پر ایک مشکل کام ہے۔ لیکن اگر ایک بار ہمت کر کے پاکستان ایسا فیصلہ لے لے تو اس کے معجزاتی نتیجے برآمد ہونگے۔ انڈیا کے خلاف بلا اعلان جنگ کی حالت ختم ہو کر امن قائم ہو جائے گا۔ پاکستانی قوم کی منفی سوچ مثبت سوچ میں تبدیل ہو جائے گی۔ باہمی تجارت کے دروازے کھل جائیں گے۔ تعلیم اور ثقافت اور سیاحت کے میدان میں دونوں ملکوں کے درمیان لین دین شروع ہو جائے گا۔ لٹریچر کی دوطرفہ آمدورفت کے نتیجہ میں دونوں ملکوں کے درمیان غلط فہمیاں ختم ہو جائیں گی اور برادرانہ ماحول قائم ہو جائے گا۔ انڈیا اور پاکستان کی زبان اور کلچر بڑی حد تک ایک ہے۔ اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے لیے دور کے پڑوسی (distant neighbors)

بنے ہوئے ہیں۔اس کے بعد یہ ہوگا کہ دونوں قریب کے پڑوسی بن جائیں گے جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جب بھی کوئی فرد یا قوم کام کرنا چاہے تو اس وقت پیشگی حالات کے نتیجے میں ایک عملی صورتحال (status quo) موجود رہتی ہے۔اب سوچنے کے دو طریقے ہیں۔ایک یہ کہ پہلے موجودہ صورتحال (status quo) کو بدلا جائے تا کہ عمل کرنے کے راستے پیدا ہوں۔دوسرے یہ کہ موجود صورت کو اپنے حال پر چھوڑتے ہوئے دوسرے ممکن میدانوں میں اپنا عمل جاری کرنا۔

یہ طریقہ جس کو میں مثبت اسٹیٹس کوازم (positive status quoism) کہتا ہوں، یہی عقل کے مطابق ہے۔ہر دانش مند آدمی کا یہ کہنا ہے کہ جب آئیڈیل کا حصول ممکن نہ ہو تو پریکٹیکل پر راضی ہو جاؤ۔خود اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے۔ چنانچہ قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ: الصُّلْحُ خَيْرٌ (4:128)۔یعنی نزاعی معاملات میں سب سے زیادہ بہتر اور مفید پالیسی سمجھوتہ کی پالیسی ہے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہ اختلافی مواقع پر ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر مصالحت کا طریقہ اختیار کرنا۔

اسٹیٹس کو (status quo) کو مانتے ہوئے تعلقات کو مستقل بنیاد پر استوار کرنے کی یہ تجویز کوئی نئی نہیں۔جواہر لال نہرو کے زمانے میں دونوں طرف کی حکومتیں مبینہ طور پر اس تجویز پر راضی ہو چکی تھیں۔حتیٰ کہ شیخ محمد عبداللہ دونوں کے بیچ میں ایک درمیانی آدمی (middle man) کے طور پر پاکستان پہنچ چکے تھے۔مگر نہرو کی اچانک موت سے اس تاریخ ساز منصوبہ پر عمل درآمد نہ ہو سکا:

By 1956 Nehru had publicly offered a settlement of Kashmir with Pakistan overthe ceasefire line (now convertedinto the LoC). On May 23, 1964, Nehru

asked Sheikh Abdullah to meet Ayyub Khan in Rawalpindi in an effort to resolve the Kashmir imbroglio. The Pakistani leader agreed to a summit with Nehru. To be held in June 1964.This message was urgently telegraphed to Nehru on May 26. But just as Nehru's consent reached Karachi, the word also learnt that Nehru had died in his sleep.And with that a major opportunity for a peaceful solution over Kashmir was also lost. (*The Hindustan Times*, June 18, 2001)

پاکستان اگر ایسا کرے کہ کشمیر کے بارے میں صورت موجودہ (status quo) پر رضامند ہو کر اس کو مستقل بندوبست کے طور پر قبول کرلے تو اس میں پاکستان کا یا وسیع تر معنوں میں ملت مسلمہ کا کوئی نقصان نہیں۔ کشمیر کا علاقہ پاکستان سے جدا ہونے کے بعد بھی بدستور ایک مسلم خطے کے طور پر اپنی جگہ باقی رہے گا۔ پھر اس میں آخر نقصان کی کیا بات۔ مزید یہ کہ تجربہ بتاتا ہے کہ برصغیر ہند کے جو مسلمان انڈیا سے جڑے انہوں نے پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں سے بہت زیادہ ترقی کی حتیٰ کہ آج نہ صرف برصغیر ہند بلکہ پوری مسلم دنیا کا سب سے زیادہ دولت مند تاجر ہندستان کا ایک مسلمان ہے جو بنگلور میں رہتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ پاکستان کا ہندستان سے مصالحت کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ اپنے طاقتور پڑوسی سے نزاع کو ختم کرنا ہے۔ اور اپنے پڑوسی سے نزاع کو ختم کرنا گویا اپنے اوپر ہر قسم کی ترقی کے دروازے کھولنا ہے۔ اپنے حریف سے نزاع کو ختم کرنا کس طرح ترقی کا زینہ بنتا ہے، اس کی ایک مثال موجودہ جاپان ہے۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے جاپان اور امریکہ ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ جنگ کے بعد جاپان نے امریکہ سے مکمل مصالحت کرلی۔ اس مصالحت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان عالمی نقشہ میں اقتصادی سپر پاور بن کر ابھر آیا۔

پاکستان اپنی موجودہ پالیسی سے اسلام کی بدنامی کا سبب بن رہا ہے۔ اپنی موجودہ پالیسی کی بنا پر پاکستان کو یہ کرنا پڑا کہ اس نے انڈیا سے نفرت کو اپنے لیے اتحاد کا ذریعہ بنایا۔ اس غلط پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان (بشمول مشرقی پاکستان) کے لوگ اسلام کے نام پر تو متحد نہ ہو سکے مگر انڈیا سے نفرت کے نام پر وہ مکمل طور پر متحد نظر آتے ہیں۔ اس مثال کی بنا پر دنیا کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ اسلام کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ مسلمانوں کو باہم متحد کر سکے۔ اسی ذہن کی ترجمانی دہلی کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (18 جون 2001ء) کے ایک مضمون میں اس طرح کی گئی ہے کہ اسلام پاکستان کو متحد نہ کر سکا، مگر ہندستان دشمنی نے اس کو متحد کر دیا:

> Islam does not hold Pakistan together anymore, but anti-Indianism does.

پاکستان کی مصالحانہ پالیسی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اہل پاکستان کے اندر نیا مثبت ذہن فروغ پائے گا۔ اس کے بعد اہل پاکستان ایک نئے دور میں داخل ہو جائیں گے جب کہ ان کے قومی اتحاد کی بنیاد اینٹی انڈیا ذہن نہ ہو بلکہ ان کے قومی اتحاد کی بنیاد پرو اسلام (pro-Islam) ذہن ہو جائے۔ یہ فائدہ اتنا عظیم ہے کہ عجب نہیں کہ اس کے بعد پاکستان کے اوپر اللہ کی رحمت کے تمام دروازے کھل جائیں اور اس کی رحمت کا کوئی دروازہ ان کے اوپر بند نہ رہے۔

فراست مومن

پیغمبر اسلام کی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ آپ صاحب حکمت تھے اور لوگوں کو حکیمانہ روش اختیار کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں آپ کے بہت سے اقوال حدیث کی کتابوں میں آئے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ نے فرمایا: لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ: رَجُلٍ آتَاهُ اللَّهُ مَالًا، فَسَلَّطَهُ عَلَى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ، وَرَجُلٍ آتَاهُ اللَّهُ حِكْمَةً، فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1343)۔ یعنی، حسد نہیں سوا دو قسم کے آدمیوں پر۔ ایک وہ آدمی جس کو اللہ نے مال دیا تو وہ اس کو حق کے راستے میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرتا ہے۔ اور دوسرا آدمی وہ جس کو اللہ نے حکمت دی تو وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور اس کی تعلیم دیتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور کہا کہ اے اللہ اس کو حکمت عطا فرما: ضَمَّنِي النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم إِلَى صَدْرِهِ وَقَالَ: اللَّهُمَّ عَلِّمْهُ الْحِكْمَةَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3546)۔

اسی طرح اور بہت سی روایتیں ہیں جن سے حکمت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نِعْمَ الْمَجْلِسُ مَجْلِسٌ تُنْشَرُ فِيهِ الْحِكْمَةُ (مسند الدارمی حدیث نمبر 295)۔ مقدمہ یعنی، کیا ہی اچھی ہے وہ مجلس جس میں حکمت کی بات کی جائے۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ: لَيْسَ هَدِيَّةٌ أَفْضَلَ مِنْ كَلِمَةِ حِكْمَةٍ تُهْدِيهَا (مسند الدارمی حدیث نمبر 363)۔ یعنی، حکمت کی بات سے زیادہ افضل کوئی تحفہ نہیں۔

حکمت کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کی بابت یہ تعلیم دی گئی کہ دوسری قوموں میں اگر کوئی حکمت کی چیز ملے تو اس کو لینے سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: الكَلِمَةُ الحِكْمَةُ ضَالَّةُ المُؤْمِنِ، فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا (سنن الترمذی،

حدیث نمبر 2687)۔ یعنی، حکمت کی بات مومن کا گم شدہ سرمایہ ہے وہ جہاں اس کو پائے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔

بعض روایت کے مطابق، حکمت اور تفقہ کی اہمیت عبادت سے بھی زیادہ ہے۔ ہے۔ چنانچہ الترمذی اور ابن ماجہ میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فَقِيهٌ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 222)۔ یعنی، ایک فقیہ، شیطان کے اوپر ہزار عابدوں سے بھی زیادہ بھاری ہے۔

پیغمبر اسلام کی پوری زندگی حکمت کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ نبوت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے آپ نے ہر موقع پر اور ہر مرحلہ میں حکمت کا طریقہ اختیار فرمایا۔ یہاں اس سلسلہ میں آپ کی زندگی سے چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

نزاع کے موقع پر

پیغمبر اسلام کی عمر جب 35 سال تھی اس وقت مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا۔ کعبہ کی عمارت بعض اسباب سے منہدم ہوگئی۔ اس کے بعد قریش کے لوگوں نے اس کی نئی تعمیر کی۔ اس دوران یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ حجر اسود کو کون اٹھائے اور اس کو دوبارہ اس کی جگہ پر کعبہ کی دیوار میں نصب کرے۔ یہ چونکہ فضیلت کا ایک معاملہ تھا، ہر ایک یہ چاہنے لگا کہ وہی اس کو اٹھا کر نصب کرے اور اس شرف کا مالک بنے۔

اس سوال پر قریش کے لوگوں میں کئی دن تک جھگڑا جاری رہا اور کوئی اتفاقی فارمولا طے نہ ہو سکا آخر کار قریش کے ایک بزرگ کی تجویز کے مطابق وہ اس پر راضی ہوئے کہ کل صبح کو جو آدمی سب سے پہلے کعبہ میں داخل ہو، وہی اس مسئلہ کا فیصلہ کرے اور تمام لوگ اس کے فیصلہ کو مان لیں۔ اگلی صبح کو جب لوگ دوبارہ کعبہ میں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ کعبہ میں داخل ہونے والے سب سے پہلے شخص رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ہر ایک نے

بیک زبان کہا: هٰذَا الْأَمِينُ رَضِينَا هٰذَا مُحَمَّدٌ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 214)۔ یعنی، یہ تو محمد الامین ہیں، ہم ان کے فیصلہ پر راضی ہیں۔

رسول اللہ نے لوگوں سے کہا کہ ایک چادر لے آؤ۔ وہ لوگ چادر لائے تو آپ نے اس کو زمین پر پھیلایا اور حجر اسود کو اٹھا کر اس کے اوپر رکھ دیا۔ پھر آپ نے لوگوں سے کہا کہ تم سب لوگ چادر کے کناروں کو پکڑو اور اس کو اٹھا کر کعبہ کی دیوار کے پاس لے چلو۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر آپ نے حجر اسود کو چادر سے اٹھایا اور اس کو کعبہ کی دیوار میں نصب کر دیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ عمل ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نزاعی معاملہ کو کس طرح خوش اسلوبی کے ساتھ طے کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ حکیمانہ انداز اختیار کرتے ہوئے ہر ایک کو اس میں شریک کرلیا جائے۔ اس طرح کا معاملہ لوگوں کے لیے اکثر وقار کا سوال بن جاتا ہے۔ اگر حسن تدبیر سے لوگوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ ان کا وقار محفوظ ہے تو مسئلہ کو حل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔

آغازِ کار

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب مکہ میں نبوت ملی تو آپ نے اپنے عمل کا یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ آپ لوگوں کے پاس جاتے اور ان سے کہتے کہ اے لوگو، کہو کہ ایک اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں، تم فلاح پاؤ گے — يَا أَيُّهَا النَّاسُ قُولُوا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوا (مسند احمد، حدیث نمبر 16603)۔ یعنی تم لوگ شرک کو چھوڑ دو اور ایک خدا کی پرستش کا طریقہ اختیار کرو، تم فلاح پاؤ گے۔

اس وقت کعبہ میں 360 بت رکھے ہوئے تھے۔ اب ایک صورت یہ تھی کہ کعبہ کو بتوں سے پاک کر کے اس کو توحید کے مرکز کے طور پر بنایا جاتا۔ مگر اس وقت وہ عملاً شرک و بت پرستی کا مرکز بن گیا تھا۔ ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے دو مختلف راستے

تھے۔ ایک یہ کہ کعبہ سے بتوں کو نکال کر وہاں دوبارہ توحید کا ماحول قائم کریں اور اس کو مرکز بنا کر اپنی موحدانہ تحریک چلائیں۔

ایک صورت قولی دعوت سے آغاز کرنے کی تھی۔ اور دوسری صورت عملی اقدام سے آغاز کرنے کی۔ جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے، آپ نے عملی اقدام سے مکمل طور پر پرہیز کیا، اور صرف قولی دعوت کے نہج پر مکہ میں اپنا پیغمبرانہ مشن جاری فرمایا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت یا اسلامی تحریک کا صحیح پیغمبرانہ طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلے پرامن فکری مہم کے ذریعہ لوگوں کی سوچ اور کردار میں تبدیلی لائی جائے۔ یہ ابتدائی کام جب قابل لحاظ حد تک انجام پا جائے، اس کے بعد حسب حالات عملی اقدام کا آغاز کیا جائے۔

توہین کو برداشت کرنا

مشہور سیرت نگار ابن اسحق بتاتے ہیں کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ کا نام مذمم رکھا تھا۔ پھر وہ آپ کا سب وشتم کرتے تھے۔ اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھیوں سے فرماتے تھے کہ کیا تم کو اس پر تعجب نہیں کہ اللہ نے کس طرح مجھ کو قریش کی ایذا رسانی سے بچالیا۔ وہ سب وشتم کرتے ہیں اور ایک مذمم شخص کی ہجو کرتے ہیں اور میں محمد ہوں:

وَكَانَتْ قُرَيْشٌ إِنَّمَا تُسَمِّي رَسُولَ اللّٰهِ صلى اللّٰه عليه وسلم مُذَمَّمًا، يَسُبُّونَهُ، وَكَانَ يَقُولُ: أَلَا تَعْجَبُونَ لِمَا صَرَفَ اللّٰهُ عَنِّي مِنْ أَذَى قُرَيْشٍ، يَسُبُّونَ وَيَهْجُونَ مُذَمَّمًا وَأَنَا مُحَمَّدٌ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 6)۔

پیغمبر اسلام ﷺ کا اصل نام محمد تھا جس کا مطلب ہے تعریف کیا ہوا۔ مکی دور میں جب قریش کو آپ کے ساتھ عناد پیدا ہوا تو انھیں پسند نہیں آیا کہ وہ آپ کو محمد (تعریف کیا ہوا) جیسے نام سے پکاریں۔ انھوں نے اپنے جذبۂ عناد کی تسکین کے لیے بطور خود آپ کا نام مذمم رکھ دیا جس کے معنی ہیں مذمت کیا ہوا۔ قریش جب آپ کو برا بھلا کہتے تو وہ آپ

کے لیے محمد کا لفظ استعمال نہ کرتے بلکہ وہ مذمم کا لفظ بول کر آپ کو برا بتاتے۔ حتیٰ کہ ابولہب کی بیوی ام جمیل نے خود آپ کے سامنے آ کر کہا: مُذَمَّمًا عَصَيْنَا (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 356)۔ یعنی، یہ مذمم ہیں اور ہم ان کو نہیں مانتے۔

یہ بلا شبہ ایک اشتعال انگیزی تھی اور آپ کی توہین بھی۔ لیکن پیغمبر اسلام نے ایک خوبصورت جواب دے کر اس کو نظر انداز کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ مذمم کی سب وشتم کرتے ہیں۔ مگر ان کی سب وشتم میرے اوپر پڑنے والی نہیں کیوں کہ میرا نام محمد ہے نہ کہ مذمم۔

پیغمبر اسلام ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو یہاں عبداللہ بن ابی آپ کا شدید مخالف بن گیا۔ اس نے اگر چہ اسلام قبول کر لیا تھا مگر حسد کے جذبے کے تحت وہ آپ کا شدید مخالف بن گیا۔ آپ کی توہین کرنا، آپ کا سب وشتم کرنا اور آپ کے خلاف بری باتیں پھیلانا اس کا سب سے بڑا مشغلہ بن گیا۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ سب سے بڑا شاتم رسول تھا۔ حضرت عمر فاروق نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس کو قتل کر دوں۔ آپ نے فرمایا: دَعْهُ، لَا يَتَحَدَّثُ النَّاسُ أَنَّ مُحَمَّدًا يَقْتُلُ أَصْحَابَهُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4905)۔ یعنی، اس کو چھوڑ دو۔ لوگ یہ نہ کہیں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔

اس واقعہ سے پیغمبر اسلام ﷺ کا ایک خاص اسوہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ — توہین کو برداشت کرلو۔ کیونکہ اگر تم نے توہین کو برداشت نہ کیا تو اس سے بھی زیادہ بڑی برائی سامنے آئے گی، اور وہ خدا کے دین کی بدنامی ہے۔

قبل از وقت اقدام نہیں

پیغمبر اسلام ﷺ تقریباً 13 سال تک مکہ میں رہے یہاں کی اکثریت آپ کی مخالف بنی رہی۔ انھوں نے ہر طرح آپ کو ستایا۔ تاہم آپ کے دعوتی جدو جہد کے نتیجے میں وہاں کے تقریباً دو سو مرد اور عورت اسلام میں داخل ہو گئے۔ یہ لوگ بار بار آپ سے یہ کہتے کہ ہم ظلم

کے خلاف جہاد کریں گے۔ مگر آپ ہمیشہ انھیں صبر کی تلقین کرتے رہے۔ مثلاً حضرت عمر فاروق نے قریش کے مظالم کے خلاف جہاد کی اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا: یَا عُمَرُ إِنَّا قَلِیلٌ (سیرت ابن کثیر، جلد 1، صفحہ 441)۔ یعنی، اے عمر ہم تھوڑے ہیں۔

مکی دور کے آخر میں مدینہ کے تقریباً دوسو آدمی اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ مکہ کے لوگ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو ظلم و زیادتی کا نشانہ بنا رہے ہیں تو انھوں نے بھی کہا کہ ہم کو ان ظالموں کے خلاف لڑنے کی اجازت دیجیے مگر ان سے بھی آپ نے یہی فرمایا کہ صبر کرو کیوں کہ مجھے قتال کی اجازت نہیں دی گئی (اِصْبِرُوا فَإِنِّي لَمْ أُؤْمَرْ بِالْقِتَالِ)۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے ہر قسم کے ظلم و زیادتی کے باوجود تقریباً 15 سال تک یکطرفہ طور پر صبر و برداشت کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کے بعد پہلی بار آپ غزوہ بدر کے موقعہ پر اپنے اصحاب کو لیکر دشمنوں سے مقابلے کے لیے نکلے۔ یہ بھی آپ نے اس وقت کیا جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ کھلا وعدہ آ گیا کہ آسمان سے فرشتے تمہاری مدد کے لیے آئیں گے (8:9)۔

پیغمبر اسلام ﷺ کا طریقہ یہ نہیں کہ جب بھی کوئی ظلم کرے تو فوراً اس کے خلاف کارروائی شروع کر دی جائے۔ آپ کی سنت یہ ہے کہ ظلم کے باوجود صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ عملی اقدام صرف اس وقت کیا جائے جب کہ اس کا نتیجہ خیز ہونا یقینی بن گیا ہو۔

مقام نزاع سے ہٹ جانا

پیغمبر اسلام ﷺ نبوت کے بعد تقریباً 13 سال تک مکہ میں رہے۔ کچھ لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا مگر مکہ کی اکثریت آپ کی شدید مخالف بنی رہی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ صرف مخالفت آپ کے مشن کو ختم کرنے کے لیے کافی نہیں تو وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے قتل کے درپے ہو گئے۔ انھوں نے طے کیا کہ مکہ کے تمام سردار بیک وقت حملہ کر کے آپ کو قتل کر دیں۔ تا کہ آپ کی تحریک توحید کا خاتمہ ہو جائے۔

یہ ایک نازک موقع تھا۔ بظاہر ایک صورت یہ تھی کہ آپ اپنے ساتھیوں کو لیکر ان سے مقابلہ کریں۔ مگر آپ نے اس معاملہ کو نتیجے کے اعتبار سے دیکھا چونکہ اس وقت کے حالات میں مسلح مقابلہ غیر مفید ہوتا اس لیے آپ نے اعراض کے اصول پر عمل فرمایا اور مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ چلے گئے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی سنت نزاع سے ٹکرانا نہیں ہے بلکہ نزاع کے مقام سے ہٹ جانا ہے۔ اس طرح آدمی کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو بچا کر انھیں زیادہ مفید طور پر استعمال کر سکے۔

اغیار کی رعایت

اسلام میں ایک مستقل اصول وہ ہے جس کو قرآن میں تالیف قلب کہا گیا ہے (9:60)۔ تالیف قلب کا مطلب ہے دلوں کو جوڑنا، لوگوں کو اپنے سے مانوس کرنا۔ یہ مقصد صرف اس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے کہ دوسروں کی رعایت کی جائے۔ دوسروں کے جذبات اور مفادات کا احترام کیا جائے۔ تالیف کا یہ اصول اسلامی دعوت کا ایک اہم اصول ہے۔ وہ ابدی طور پر ہر انسانی سماج میں مطلوب ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں تالیف قلب کے اس اصول پر عمل فرمایا۔ مثلاً جب آپ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو اس وقت وہاں اہل ایمان کے ساتھ مشرکین اور یہود بھی آباد تھے۔ اس وقت آپ نے اپنی طرف سے ایک منشور جاری فرمایا جس کو عام طور پر صحیفۂ مدینہ کہا جاتا ہے۔ اس میں آپ نے اعلان فرمایا کہ ہر گروہ کو اپنے مذہب اور کلچر کی آزادی ہوگی۔ ہر قبیلہ کے نزاعی معاملات اس کی اپنی قبائلی روایات کے تحت طے کئے جائیں گے۔ عقیدہ اور کلچر کے معاملہ میں کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔

یہود کے ساتھ آپ نے خصوصی رعایت کا معاملہ فرمایا، رمضان کے روزہ کی فرضیت سے پہلے آپ بھی انھیں دنوں میں روزہ رکھتے رہے جب کہ یہود روزہ رکھتے تھے۔ تحویل قبلہ کا حکم آنے سے پہلے تقریبا سترہ مہینہ تک آپ نے یہود کے قبلہ (بیت المقدس) کو اپنا قبلہ بنائے رکھا۔ یہود کے قبلۂ عبادت کو اپنا قبلہ بنانا اس لیے تھا کہ آپ امید رکھتے تھے کہ اس طرح وہاں کے یہود آپ سے مانوس ہوں گے اور آپ کے قریب آجائیں گے (تفسیر القرطبی، جلد 2، صفحہ 150)۔

پیغمبر اسلام ﷺ کا طریقہ مخالفت کے جواب میں مخالفت نہ تھا۔ بلکہ مخالفت کے جواب میں رعایت تھا۔ آپ کی سوچ یہ نہیں تھی کہ لوگوں کو دبا کر انھیں اپنا تابع بنائیں۔ اس کے برعکس، آپ کا طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کے ساتھ شفقت اور رعایت کا معاملہ کیا جائے، ان کے دل کو نرم کر کے انھیں اپنا ساتھی بنایا جائے۔

رازداری

فتح مکہ کے واقعات کے ذیل میں آیا ہے کہ مدینہ میں آپ نے سفر کے لیے تیاری کا حکم دیا۔ عام مسلمان ضروری تیاری میں مصروف ہو گئے۔ اس زمانے میں حضرت ابو بکر صدیق اپنی صاحبزادی عائشہ کے گھر میں آئے جو پیغمبر اسلام ﷺ کی اہلیہ تھیں۔ وہ اس وقت ضروری تیاری کر رہی تھیں۔ حضرت ابو بکر صدیق نے اپنی صاحبزادی سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے تم کو اس کا حکم دیا ہے۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ ہاں۔ حضرت ابو بکر صدیق نے دوبارہ پوچھا کہ یہ تیاری کہاں کے سفر کے لیے ہے۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم مجھ کو نہیں معلوم — وَاللهِ مَا أَدْرِي (سیرت ابن ہشام، جلد 3، صفحہ 14)۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی سنتوں میں سے ایک سنت یہ تھی کہ آپ نازک معاملات میں ہمیشہ رازداری کا طریقہ اختیار فرماتے تھے۔ یہی آپ نے فتح مکہ کی مہم میں کیا۔ مدینہ سے

آپ اپنے دس ہزار اصحاب کے ساتھ نکلے مگر آپ نے لوگوں کو یہ نہیں بتایا کہ ہم کہاں جارہے ہیں۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم چلتے ہوئے اس مقام پر پہنچے جہاں سے راستہ سیدھا مکہ کی طرف جاتا تھا، اس وقت ہم نے جانا کہ یہ سفر مکہ کے لیے ہے۔ نازک اجتماعی معاملات میں رازداری بے حد اہم ہے اکثر اوقات کامیابی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ فریق ثانی کو آپ کے منصوبہ کا پیشگی علم نہ ہو سکے۔ پیغمبر اسلام نے اس حکمت کو نہایت اہتمام کے ساتھ اپنی زندگی میں اختیار فرمایا۔

صورت موجودہ کو مان لینا

جب بھی دو آدمیوں یا دو گروہوں میں نزاع پیدا ہو تو بالآخر دونوں کے درمیان ایک عملی حالت قائم ہو جاتی ہے۔ جس کو اسٹیٹس کو (status quo) کہا جاتا ہے۔ اس اسٹیٹس کو کو بدلنے کی کوشش اکثر حالات میں بے نتیجہ ہوتی ہے۔ کیونکہ فریق ثانی اپنی پوری طاقت کے ساتھ جوابی کارروائی کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صورت موجودہ (status quo) بدستور باقی رہتی ہے۔ مزید نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس بے نتیجہ کوشش میں طرفین کے حاصل شدہ مواقع بھی بے فائدہ طور پر ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے نزاعی معاملہ میں پیغمبر اسلام کی سنت یہ ہے کہ موجودہ حالت (status quo) کو مان لو۔ اس اسٹیٹس کو ازم کا یہ عظیم فائدہ ہوتا ہے کہ آپ کو یہ فرصت مل جاتی ہے کہ اپنی قوتوں کو مزید استحکام میں لگا دیں۔ مقام نزاع سے ہٹ کر اپنے آپ کو اتنا مضبوط بنائیں کہ آخر کار طاقت کا توازن بدل جائے اور کسی بڑے ٹکراؤ کے بغیر معاملہ کا فیصلہ کیا جا سکے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے حدیبیہ کے موقع پر یہی حکمت اختیار فرمائی۔ آپ مدینہ سے روانہ ہو کر حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو مکہ کے لوگ بھی چل کر وہاں آ گئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم

آپ کو آگے جانے نہیں دیں گے۔ اس طرح حدیبیہ کے مقام پر ایک تعطل کی حالت پیدا ہوگئی۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسا نہیں کیا کہ اس تعطل کو توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں بلکہ آپ حدیبیہ ہی سے دوبارہ مدینہ واپس آ گئے۔

یہ گویا اپنے اور فریق ثانی کے درمیان قائم شدہ اسٹیٹس کو کو مان لینا تھا۔ اس حکمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیغمبر اسلام کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے آپ کو مزید مستحکم کرسکیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور صرف دو سال کے اندر آپ کے لیے مکہ میں فاتحانہ داخلہ ممکن ہو گیا۔

مشکل میں آسانی

پیغمبر اسلام ﷺ نے 8ھ میں مکہ فتح کیا۔ اس کے بعد آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ سے طائف کے لیے روانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں عرب میں ہموار سڑکیں نہیں تھیں۔ چلتے ہوئے ایک جگہ ایک تنگ راستہ آیا جو دو پہاڑیوں کے درمیان سے گذرتا تھا۔ چنانچہ یہ راستہ اپنی اسی صفت کے ساتھ مشہور ہو گیا تھا۔

پیغمبر اسلام ﷺ جب اس جگہ پہنچے تو آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ اس راستہ کا نام کیا ہے (مَا اسْمُ هَذِهِ الطَّرِيقِ) لوگوں نے جواب دیا کہ اس کا نام تنگ راستہ ہے (فَقِيلَ لَهُ: الضَّيِّقَةُ)۔ آپ نے جواب دیا کہ نہیں، یہ ایک آسان راستہ ہے — فَقَالَ: بَلْ هِيَ الْيُسْرَى (سیرت ابن ہشام، جلد 4، صفحہ 127)۔

اس وقت پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ دس ہزار سے زیادہ آدمی تھے۔ یہ لوگ اگر افقی انداز میں پھیل کر چلتے تو یقیناً ان کے لیے اس راستہ سے گزرنا مشکل ہوتا، ایسی حالت میں وہ ان کے لیے تنگ بن جاتا۔ لیکن یہی لوگ اگر قطار بنا کر چلیں تو ان کے لیے راستہ سے گذرنا مشکل نہ رہے گا، اور وہ بظاہر تنگی کے باوجود ان کے لیے عملی طور پر آسان ہوجائے گا۔ پیغمبر

اسلام ﷺ نے اپنے جواب میں اسی عملی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا: پیغمبر اسلام ﷺ کے اس واقعہ سے زندگی کا ایک اہم راز معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ حسب حالت تدبیر ہے۔ اس حکیمانہ تدبیر کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ اس تدبیر کو استعمال کر کے زندگی کی ہر مشکل کو آسان بنایا جا سکتا ہے۔

تدبیری پسپائی

پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے میں 8ھ میں ایک جنگ ہوئی۔ یہ شام کی سرحد پر موتہ کے مقام پر ہوئی اسی نسبت سے اس کو جنگ موتہ کہا جاتا ہے۔ اس جنگ کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔ اس کے مقابلے میں فریق ثانی کی فوجی تعداد غیر متناسب طور پر بہت زیادہ تھی۔ آخری مرحلہ میں خالد بن الولید اس کے سردار مقرر ہوئے۔ انھوں نے لڑائی کو غیر مفید سمجھ کر واپسی کا فیصلہ کیا۔ وہ تدبیری پسپائی (tactical retreat) کے اصول پر موتہ سے واپس ہو کر مدینہ چلے گئے۔

عربوں کا مزاج لڑنے مرنے کا مزاج تھا۔ وہ اس پسپائی کی حکمت کو سمجھ نہ سکے۔ چنانچہ جب وہ مدینہ پہنچے تو وہاں کے نوجوانوں نے یا فرار کہہ کر ان کا استقبال کیا۔ یعنی اے بھاگنے والو۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس کو سنا تو آپ نے اس کی تردید فرمائی۔ آپ نے کہا کہ یہ لوگ بھاگنے والے نہیں ہیں بلکہ خدا نے چاہا تو وہ اقدام کرنے والے ہیں: لَيْسُوا بِالْفِرَارِ، وَلَكِنَّهُمُ الْكَرَّارُ، إِنْ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى (سیرت ابن ہشام، جلد 3، صفحہ 438)۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک صحیح اقدام وہ ہے جو نتیجہ خیز ثابت ہو سکے۔ محض جوش اور وقار کے لیے لڑ کر مر جانا کوئی مطلوب اسلامی کام نہیں۔ اگر اہل ایمان کے مقابلے میں فریق ثانی کی طاقت فیصلہ کن حد تک زیادہ ہو تو ایسی حالت میں مقابلہ کے لیے اقدام نہیں کیا جائے گا۔ حتیٰ کہ اگر مقابلہ پیش آ جائے تو

تدبیری پسپائی اختیار کی جائے گی۔ تاکہ مزید تیاری کر کے اپنے آپ کو نتیجہ خیز اقدام کے قابل بنایا جا سکے۔

اصلاح میں تدریج

ایک روایت کے مطابق، حضرت عائشہ نے فرمایا کہ قرآن میں سب سے پہلے وہ آیتیں اور سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت کا اور جہنم کا ذکر تھا۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہو گئے تو اس کے بعد حلال وحرام کے احکام اترے۔ اور اگر ایسا ہوتا کہ شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ تم لوگ شراب نہ پیو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اسی طرح اگر شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4993)۔

اس روایت سے ایک عظیم حکمت نبوی معلوم ہوتی ہے۔ یہ وہی عملی حکمت ہے جس کو تدریج (gradual approach) کہا جاتا ہے۔ انسان کی اصلاح ایک مشکل اور پیچیدہ کام ہے۔ انسان عام طور پر کچھ خیالات اور عادات سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ وہ اسی کو درست سمجھنے لگتے ہیں۔ اس بنا پر وہ کسی نئی چیز کو فوری طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ایسی حالت میں انسانوں کی اصلاح کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کام کو حکمت اور تدریج کے ساتھ کیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں پہلے لوگوں کی سوچ کو بدلا۔ لوگوں کے اندر قبولیت کا مزاج پیدا کیا۔ یہاں تک کہ جب ان کے اندر اصلاح کو قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو گئی تو اس کے بعد آپ نے شرعی احکام کا نفاذ فرمایا۔ اگر آپ فکری تطہیر اور مزاج سازی کے بغیر شریعت کے قوانین نافذ کرتے تو یہ انسانی فطرت کے خلاف ہوتا، اور وہ انقلابی نتیجہ برآمد نہ ہوتا جو عرب کے سماج میں برآمد ہوا۔

عملی حالات کی رعایت

پیغمبر اسلام ﷺ نے ذی الحجہ 9ھ میں حج کا فریضہ ادا فرمایا۔ اس کو عام طور پر حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان اکٹھا تھے۔ آپ نے اپنے خطبہ میں جو باتیں فرمائیں ان میں سے ایک وہ تھی جس کو انسانی مساوات کا اعلان کہا جا سکتا ہے۔ آپ نے اس موقع پر یہ تاریخی الفاظ فرمائے کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں، کسی سفید فام کو کسی سیاہ فام پر فضیلت نہیں۔ فضیلت کا تعلق صرف دین اور تقوی سے ہے۔

اس خطبہ کے تقریباً ڈھائی ماہ بعد مدینہ میں آپ کی وفات ہوگئی۔ آپ کی وفات کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ کس کو خلیفہ بنایا جائے۔ مذکورہ اعلان کے مطابق بظاہر صرف یہ ہونا چاہیے تھا کہ دین اور تقوی کی بنیاد پر خلافت کا فیصلہ کیا جائے، نہ کہ نسل اور قبیلہ کی بنیاد پر۔ مگر عملاً ایسا نہیں ہوا۔

آپ کی وفات کے بعد مدینہ کی ایک چوپال (ثقیفہ بنی ساعدہ) میں مسلمانوں کا اجتماع ہوا۔ لوگوں کا پہلا رجحان یہ تھا کہ سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنایا جائے جو مدینہ کے ایک قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس وقت حضرت ابو بکر صدیق نے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث پیش کی کہ الأَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ (انساب الاشراف للبلاذری، جلد 2، صفحہ 263)۔ یعنی خلیفہ یا امام قریش سے ہوگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سعد بن عبادہ چونکہ قبیلہ قریش سے نہیں ہیں اس لیے ان کو خلیفہ نہیں بنایا جا سکتا۔ کسی قدر بحث کے بعد آخر کار لوگوں کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ قبیلہ قریش ہی کے کسی شخص کو خلیفہ بنایا جائے۔ اس کے مطابق حضرت ابو بکر صدیق خلیفہ اول مقرر ہوئے جو کہ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔

بظاہر یہ ایک متضاد بات ہے۔ پھر پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسا کیوں فرمایا۔ اس کے پیچھے ایک عظیم حکمت تھی۔ وہ یہ کہ خلیفہ یا حکمراں کو ایک وسیع انسانی سماج پر احکام کا نفاذ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ لوگ خلیفہ کی اطاعت کے ذریعہ وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جو اسلامی خلافت کا مقصود ہے۔

قدیم عرب میں سیکڑوں سال کی تاریخ کے نتیجہ میں قریش کے لوگوں کو سرداری کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ عوامی نفسیات کسی ایسے شخص کی سیادت کو آسانی کے ساتھ قبول کر لیتی تھی جس کا تعلق قریش کے قبیلے سے ہو۔ اسی سماجی صورت حال کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ الأَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ (مسند احمد، حدیث نمبر 12307)۔ یہ کوئی ابدی حکم نہیں تھا۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کسی قوم میں جس گروہ کو قریش جیسی سیاسی حیثیت حاصل ہو جائے، اسی گروہ کے کسی فرد کو قوم کے اوپر حاکم بنایا جائے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عملیت (pragmatism) بھی رسول اللہ ﷺ کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ انفرادی معاملہ میں ایک شخص کو ہمیشہ نظری معیار سامنے رکھنا چاہیے۔ مگر اجتماعی معاملات میں بعض اوقات نظری معیار قابل عمل نہیں ہوتا، اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ ایسے معاملہ میں نظری معیار کو چھوڑ کر عملی تقاضے کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو زندگی کا نظام ہموار طور پر نہیں چل سکتا۔

مستقبل بینی

فتح مکہ کے بعد عرب میں وہ دور آیا جس کو تاریخ میں عام الوفود کہا جاتا ہے۔ عرب کے قبائل مدینہ آ کر اسلام قبول کرنے لگے۔ ان میں سے ایک قبیلہ ثقیف بھی تھا جو طائف سے آیا تھا۔ یہ لوگ مدینہ آئے تو انھوں نے ایک انوکھی شرط پیش کر دی۔ انھوں نے کہا کہ ہم اسلام تو قبول کر لیں گے لیکن ہم نہ زکوٰۃ دیں گے اور نہ جہاد کریں گے۔

یہ ایک نازک مسئلہ تھا۔ عام لوگ اس قسم کے اسلام کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے حال سے اوپر اٹھ کر مستقبل کو دیکھا۔ آپ نے اپنی بصیرت کے تحت یہ سمجھا کہ یہ لوگ جب اسلام میں داخل ہو کر مسلم معاشرے کا جزء بن جائیں گے تو وہ اپنے آپ سب کچھ کرنے لگیں گے۔ چنانچہ آپ نے ان کی شرطوں کو مانتے ہوئے

انہیں اسلام میں داخل کرلیا۔لوگوں کے اشکال کو رفع کرنے کے لیے آپ نے فرمایا کہ جب وہ اسلام قبول کرلیں گے تو اس کے بعد وہ زکوٰۃ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے: سَيَتَصَدَّقُونَ، وَيُجَاهِدُونَ إِذَا أَسْلَمُوا (سیرت ابن کثیر، جلد 4، صفحہ 56)۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اسوہ سے ایک عظیم حکمت معلوم ہوتی ہے۔ یہ حکمت ایک لفظ میں مستقبل بینی ہے۔ انسان کوئی پتھر نہیں ہے جو تاثر کو قبول نہ کرے۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ انسان کے حال پر اس کے مستقبل کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ آدمی سے معاملہ کرتے ہوئے ہمیشہ اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیے۔ بوقت معاملہ فوری تبدیلی پر اصرار سے ضد پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، اگر وسعت ظرف کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اپنے آپ ایسا ہوگا کہ آدمی مستقبل میں عین وہی بن جائے گا جیسا کہ حال میں ہم دیکھنا چاہتے تھے۔

تفکیر و تدبّر

فنِ تفکیر

Art of Thinking

تفکیر (thinking) انسان کے تمام اعمال میں سب سے بڑا عمل ہے۔ سچی تفکیر ایک اعلیٰ عبادت کی حیثیت رکھتی ہے۔ ابو الدرداء صحابی کی وفات کے بعد اُن کی اہلیہ سے پوچھا گیا کہ ابوالدرداء کا افضل عمل کیا تھا۔ انہوں نے جواب دیا: التَّفَكُّرُ وَالِاعْتِبَارُ (الطبقات الکبری لابن سعد، جلد 4، صفحہ 353)۔ یعنی، سوچنا اور عبرت پکڑنا۔ اسی طرح ایک اور صحابی ابوذر کی وفات کے بعد ان کی اہلیہ سے پوچھا گیا کہ ابوذر کی خاص عبادت کیا تھی۔ اُنہوں نے جواب دیا: كَانَ النَّهَارُ أَجْمَعُ خَالِيًا يَتَفَكَّرُ (حلیۃ الاولیاء لابی نعیم الاصفہانی، جلد 1، صفحہ 164)۔ یعنی، وہ پورے دن تنہا سوچتے رہتے تھے۔

سوچنے کا عمل ذہن (mind) کی سطح پر ہوتا ہے، اور انسانی وجود میں سب سے بڑی چیز یہی ذہن ہے۔ سوچنے کا عمل ذہنی ارتقاء کا ذریعہ ہے۔ تمام بڑی بڑی باتیں سوچنے کے ذریعہ ہی دریافت ہوئی ہیں۔ سوچنا آدمی کو حیوانی سطح سے اٹھا کر انسانیت کی اعلیٰ سطح تک پہنچاتا ہے۔ سوچنے کے عمل کے ذریعہ ایک چیز اور دوسری چیز کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ سوچنے کے ذریعہ مشکلات کا حل دریافت ہوتا ہے۔ سوچنے کے ذریعہ چھپی ہوئی حقیقتیں انسان کے علم میں آتی ہیں۔ سوچنے کے ذریعہ آدمی یہ معلوم کرتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے مائنس پوائنٹ کو پلس پوائنٹ میں تبدیل کر سکے۔ سوچنا آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے عمل کی مؤثر منصوبہ بندی کرے، اور جو آدمی منصوبہ بند عمل کی صلاحیت رکھتا ہو وہ اس دنیا میں کبھی ناکام ہونے والا نہیں۔

سوچنا ہر آدمی کی پیدائشی صفت ہے۔ مگر صحیح طرز فکر (right thinking) صرف اُس شخص کے اندر ہوتی ہے جو اپنے آپ کو شعوری طور پر اس کے لیے تیار کرے۔ صحیح طرز فکر

کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنی پسند اور ناپسند سے اوپر اٹھ کر سوچنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ وہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھے جیسا کہ وہ ہیں، نہ کہ ویسا جیسا کہ وہ خود انہیں دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ جانبدارانہ سوچ سے مکمل طور پر پاک ہو۔ وہ سوچنے کے نتیجہ کو ہر حال میں قبول کرنے کے لیے تیار ہو خواہ وہ اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف۔

علم بغیر معرفت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰہُ (2:282)۔ اس آیت میں علم سے مراد فہم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس آدمی کے اندر اللہ کا تقویٰ ہوگا، اس کا تقویٰ اس کے اندر فہم دین پیدا کرے گا (تفسیر القرطبی، جلد 3، صفحہ 406)۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کے اندر معلومات ہو مگر اس کے اندر حقیقی فہم نہ ہو، کیونکہ فہم و بصیرت کا سرچشمہ تقویٰ ہے، نہ کہ صرف معلومات۔ اسی لیے حدیث میں دعا آئی ہے کہ — اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ (مسند احمد، حدیث نمبر 13674)۔ یعنی، اے اللہ، میں تیری پناہ مانگتا ہوں ایسے علم جو سے نفع نہ دے۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجیے۔ موجودہ زمانے میں پرجوش مسلمانوں نے مختلف مقامات پر جہاد کے نام سے جو لڑائیاں چھیڑ رکھی ہیں ان میں انہیں یک طرفہ طور پر تباہی سے دو چار ہونا پڑا ہے۔ اب وہ شکست خوردہ نفسیات کے تحت خود کش بمباری (suicide bombing) کا طریقہ اختیار کر رہے ہیں۔ وہ اپنے جسم کے ساتھ بم باندھ کر مفروضہ دشمن کے علاقوں میں داخل ہوتے ہیں اور بم دھماکہ کر کے جان بوجھ کر خود ہلاک ہوتے ہیں اور کچھ دوسرے لوگوں کو بھی ہلاک کرتے ہیں۔ یہ واقعہ واضح طور پر خودکشی کا واقعہ ہے اور خودکشی کو اسلام میں حرام موت قرار دیا گیا ہے۔ مگر کچھ علما نے اس کو استشہاد (طلب شہادت) کا نام دیتے ہوئے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں دور صحابہ کے

بعض واقعات سے استدلال کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ لوگ خلافت صدیقی کے ایک واقعہ کا حوالہ دیتے ہیں اوراس کو اپنے نظریے کے حق میں ایک قطعی دلیل بتاتے ہیں۔ یہ واقعہ ایک صحابی البراء بن مالک خزرجی (وفات 20ھ) کا ہے۔ ان کا یہ واقعہ مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ کے زمانے میں پیش آیا۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کے زمانے میں مسیلمہ کذاب اوراس کے حامی اہل یمامہ کے ساتھ جنگ میں آئی۔ یہ جنگ حضرت خالد کی سرداری میں ہوئی تھی۔ اس جنگ کے آخری مرحلہ میں ایسا ہوا کہ باغیوں کی یہ جماعت ایک فصیل بند باغ کے اندر داخل ہوگئی اوراس کے مضبوط دروازہ کو اندر سے بند کرلیا۔ اس وقت صحابہ کی جماعت میں البراء بن مالک بھی تھے جو اپنی بہادری کے لیے مشہور تھے۔ انہوں نے صحابہ سے کہا کہ تم لوگ مجھ کو ایک ڈھال پر بٹھاؤ اور ڈھال کو نیزوں کے ذریعہ اوپر اٹھاؤ۔ اس طرح اٹھا کر مجھے دیوار کے اوپر تک پہنچا دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب وہ دیوار کے اوپر پہنچے تو وہ وہاں سے کود کر نیچے اتر گئے۔ اندر کے لوگوں نے ان پر حملہ کیا مگر وہ مقابلہ کرتے ہوئے باغ کے دروازہ تک پہنچ گئے اوراس کو کھولنے میں کامیاب ہوگئے۔ دروازہ کھلتے ہی صحابہ کی جماعت اندر داخل ہوگئی اور مسیلمہ کے ساتھیوں سے لڑ کر انہیں مغلوب کرلیا۔ البراء بن مالک کا یہ اقدام ایک جوکھم کا اقدام تھا۔ اس میں جان کا خطرہ تھا۔ مگر البراء بن مالک کو باغی گروہ مارنے میں کامیاب نہ ہوسکا، وہ زندہ بچ کر باہر آگئے۔ اس واقعہ کے بعد وہ مزید آٹھ سال تک زندہ رہے اور پھر 20ھ میں ان کی طبعی وفات ہوئی۔ (الکامل فی التاریخ لابن الاثیر، جلد 2، صفحہ 364، البدایۃ النہایۃ لابن کثیر، جلد 6، صفحہ 268، الاعلام للزرکلی، جلد 2، صفحہ 47)۔

ان دونوں میں شَتَّانَ مَا بَيْنَهُمَا (there is a great difference between the two) کا معاملہ ہے۔ البراء بن مالک نے جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ انہوں

نے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر ایک اقدام کیا جس میں ان کے لیے بیک وقت دونوں امکان تھا۔زندہ بچنے کا بھی اور مارے جانے کا بھی۔ اس کے برعکس، موجودہ زمانہ میں اپنے جسم کے ساتھ بم باندھ کر بم دھما کہ کیا جاتا ہے وہ یقیناً جان بوجھ کر خودکشی کرنے کا معاملہ ہے۔اس عمل کی تکمیل خود عامل کی موت پر منحصر ہے۔ان دونوں کے درمیان واضح طور پر نوعی فرق پایا جاتا ہے۔مگر اس فرق کو نہ جاننے کی وجہ سے دونوں کو ایک سمجھ لیا گیا اور واقعہ جو واضح طور پر خودکشی کا فعل تھا، اس کو شہادت کا درجہ دے دیا گیا۔

یہ معرفت کے بغیر علم کی ایک مثال ہے۔اگر آدمی کے پاس علم (بمعنی معلومات) ہو، مگر اس کے پاس معرفت والی بصیرت نہ ہو تو وہ ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو نہیں سمجھے گا۔ وہ ایسی بات کہے گا جو اس کے اپنے نزدیک علم پر مبنی ہوگی، حالانکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ صرف جہالت پر مبنی ہوگی، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

معرفت کے لیے بھی علم ضروری ہے مگر صاحب معرفت آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ ظاہری علم سے گزر کر باطنی حقیقتوں کو دیکھے۔ وہ معلومات کا تجزیہ وتحلیل کر سکے۔ وہ سطور (line) کے ساتھ بین السطور (between the lines) کو پڑھے۔ وہ واقعات کو صحیح زاویہ نظر کے ساتھ دیکھ سکے۔ ایسا ہی آدمی صاحب معرفت ہے۔اور جو آدمی صاحب معرفت ہو اسی کے لیے علم نفع بخش بن سکتا ہے۔معرفت کے بغیر علم ایک گمراہی ہے، بلکہ شاید سب سے بڑی گمراہی۔

زاویۂ نظر کا فرق

پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے میں پیش آنے والی ایک جنگ وہ ہے جس کو غزوۂ احد کہا جاتا ہے۔اس جنگ میں مسلمانوں کو ابتداءً جیت ہوئی تھی مگر اس کے بعد ان کی جیت شکست میں تبدیل ہوگئی۔ اس واقعہ پر قرآن میں اس طرح تبصرہ کیا گیا: اور اللہ نے تم

سے اپنے وعدے کو سچا کر دکھایا یا جب کہ تم ان کو اللہ کے حکم سے قتل کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب تم کمزور پڑ گئے اور تم نے کام میں جھگڑا کیا اور تم نے نافرمانی کی جب کہ اللہ نے تم کو وہ چیز دکھادی جو کہ تم چاہتے تھے۔ تم میں سے بعض دنیا چاہتے تھے اور تم میں سے بعض آخرت چاہتے تھے۔ پھر اللہ نے تمہارا رخ ان سے پھیر دیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے اور اللہ نے تم کو معاف کر دیا اور اللہ ایمان والوں کے حق میں بڑا افضل والا ہے (3:152)۔

یہاں یہ سوال ہے کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی، وہ زخم خوردہ تھے۔ مزید یہ کہ احد کی جنگ تمام تر مخالفین اسلام کی زیادتیوں کے نتیجے میں پیش آئی تھی۔ وہ مخالفین کی جانب سے سراسر یک طرفہ حملے کا معاملہ تھا۔ اس جنگ میں مسلمان مکمل طور پر بے قصور تھے اور مخالفین مکمل طور پر باقصور۔ اس کے باوجود ایسا کیوں ہوا کہ قرآن میں مخالفین کو برا بھلا کہنے کے بجائے صرف مسلمانوں کی اپنی کمزوریوں کی نشاندہی کا انداز اختیار کیا گیا۔

اس کا سبب زاویۂ نظر کا فرق ہے۔ اس طرح کے معاملے میں کلام کا ایک طریقہ ہے کہ اس کا منطقی تجزیہ کیا جائے۔ منطقی انصاف کی روشنی میں دیکھا جائے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، کون ظالم ہے اور کون مظلوم۔ یہ طریقہ بظاہر منصفانہ معلوم ہوتا ہے مگر وہ سراسر بے فائدہ ہے۔ اس طرح کے معاملہ میں اصل اہمیت منطقی انصاف کو بیان کرنے کی نہیں ہے بلکہ مسئلہ کے حل کی عملی تدبیر ڈھونڈھنے کی ہے۔ اس طرح کے معاملہ میں ہونے والی نقصان کی تلافی عملی تدبیر سے ہوسکتی ہے، نہ کہ منطقی تجزیہ سے۔

قرآن نے احد کی جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے یہی عملی طریقہ اختیار کیا ہے۔ آخرت کی عدالت میں بلاشبہ ظالموں کو ان کا ظلم بتایا جائے گا اور اس پر انہیں سزا دی جائے گی۔ مگر دنیا میں اس طرح کے موقع پر کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ معاملہ کا عملی حل دریافت کیا جائے تا کہ اس کے ذریعہ اپنی شکست کو دوبارہ فتح میں تبدیل کیا جاسکے۔

دو قسمی سوچ

سوچ کی ایک قسم وہ ہے جس کو نفسیات کی اصطلاح میں ثنائی یا دو قسمی سوچ (dichotomous thinking) کہا جاتا ہے۔ یعنی چیزوں کو بلیک اینڈ وہائٹ میں تقسیم کر کے سوچنا۔ یہ طریقہ اکثر اوقات ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔ آدمی کے پاس صرف دو معیار ہوتے ہیں، جب کہ وہاں تیسرا معیار بھی موجود ہوتا ہے۔ مگر آدمی اپنے مخصوص ذہن کی بنا پر دو صورتوں میں بندھا رہتا ہے۔ وہ تیسری صورت سے بے خبری کی بنا پر اس کو استعمال نہیں کر پاتا، جب کہ اسی تیسری صورت میں اس کی نجات چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک فرقہ کی طرف سے اس کا مذہبی جلوس نکلتا ہے۔ وہ نعرہ لگاتا ہوا دوسرے فرقہ کے محلے سے گزرتا ہے۔ محلے کے لوگ نعرہ کو اپنے خلاف سمجھ کر اس پر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں دونوں فرقوں کے درمیان ٹکراؤ ہو جاتا ہے جو جان اور مال کے بھیانک نقصان پر ختم ہوتا ہے۔

اس مثال پر غور کیجیے۔ محلہ کے لوگ اپنے مخصوص ذہن کی بنا پر معاملہ کو صرف دو رخ سے دیکھ پاتے ہیں۔ قابل اعتراض نعرہ کو گوارا کرنا یا اس کو بند کرنا۔ چونکہ نعرہ کو گوارا کرنا انھیں بزدلی اور بے عزتی معلوم ہوتی ہے اور نعرہ کو بند کرنا انھیں ایک بہادرانہ فعل نظر آتا ہے۔ اس لیے وہ نعرہ کو بند کرنے کے لیے اقدام کرتے ہیں تا کہ اپنی مطلوب پسندیدہ چیز کو حاصل کر سکیں۔ مگر نعرہ کو برداشت نہ کرنے کا نتیجہ عملاً یہ نکلتا ہے کہ انھیں خونی فساد کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اس تباہی کا سبب دو قسمی طرز فکر ہے۔ اگر محلے والے یہ جانیں کہ ان کے لیے ایک تیسری ممکن صورت بھی ہے، اور وہ ہے نعرہ کو نظر انداز کرنا۔ اگر یہ لوگ اس تیسری صورت پر عمل کریں تو صرف پانچ منٹ کے بعد وہ دیکھیں گے کہ نعرہ لگانے والے اپنے راستے پر

آگے جا چکے ہیں اور ان کے اشتعال انگیز نعرے فضا میں اس طرح گم ہو چکے ہیں جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

دانش مند کی پہچان

ایک مغربی رائٹر ولیم رالف انگ (William Ralph Inge, 1860-1954) نے لکھا ہے کہ دانش مند آدمی وہ ہے جو چیزوں کی اضافی حیثیت کو جانے:

A wise man is he who knows the relative value of things.

چیزوں کی اضافی حیثیت کا مطلب سادہ طور پر یہ ہے کہ آدمی اپنے عمل کے نتیجے کو جانے۔ عمل کے نتیجہ سے بے خبری اگر نادانی کا ثبوت ہے تو عمل کے نتیجہ سے باخبر ہونا دانش مندی کا ثبوت۔

ایک شخص کے دوست نے اس کو دھوکہ دے کر ایک لاکھ روپیہ غصب کرلیا۔ اب اس آدمی کے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے اس سابق دوست کو قتل کر ڈالے۔ اس آدمی کی ملاقات مجھ سے ہوئی تو میں نے کہا کہ انتقام لینے سے پہلے سوچ لیجیے کہ انتقام کا بھی انتقام لیا جائے گا۔ آپ اپنے سابق دوست کو قتل کریں گے تو اس کے بیٹے دوبارہ آپ کو قتل کریں گے۔ اس طرح دونوں خاندانوں میں دشمنی اور انتقام کا ایک سلسلہ قائم ہو جائے گا۔

میں نے کہا کہ آپ کی ایک غلطی نے آپ کے دوست کو یہ موقع دیا کہ وہ آپ کے مال پر قبضہ کرلے۔ اب آپ کے لیے صحیح بات یہ ہے کہ آپ اپنی غلطی کو مانیں اور آئندہ کے لیے اس کی اصلاح کرلیں۔ انتقام لینا اپنی ایک غلطی کو مسلسل تباہی کی صورت دینا ہے۔ اور انتقام نہ لینا غلطی کو ابتدائی درجہ ہی میں روک دینا ہے۔ نادان آدمی صرف اپنے اقدام کو جانتا ہے اور دانش مند آدمی اسی کے ساتھ اپنے اقدام کے اضافی نتیجے کو بھی۔

سیکنڈ چانس

ایک شخص ایک کمپنی میں منیجر تھا۔ کمپنی کے مالک سے اس منیجر کا جھگڑا ہو گیا۔ یہ جھگڑا بڑھتا رہا۔ اس جھگڑے نے مینیجر کو سخت ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ سوچنے لگا کہ وہ خودکشی کر لے۔ مسئلہ کو ختم کرنے کے بجائے اس نے یہ طے کیا کہ وہ خود اپنا خاتمہ کر لے اور اس طرح وہ اس مسئلہ سے نجات حاصل کرے۔

مجھ سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس سے کہا کہ آپ خودکشی کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کے لیے زندگی کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ پھر موت کا راستہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے بظاہر صرف فرسٹ چانس کو کھویا ہے، سیکنڈ چانس پھر بھی آپ کے لیے موجود ہے۔ آپ ایسا کیجیے کہ اپنی جگہ بدل لیجیے آپ کسی دوسرے شہر میں چلے جائیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنی صلاحیت کی بنا پر دوسرے شہر میں اپنے لیے اچھے مواقع پالیں گے۔ یہ مشورہ دینے کے بعد میں نے ان کی ڈائری میں یہ الفاظ لکھے۔ ”باغ کا مالی کبھی باغ کے ایک پودے کو اپنی جگہ سے اکھاڑتا ہے، صرف اس لیے تا کہ وہ اس کو دوسری زیادہ بہتر جگہ پر نصب کرے“۔

انہوں نے میرا مشورہ مان لیا اور کمپنی سے استعفا دے کر ایک اور شہر میں چلے گئے۔ اب وہاں وہ کاروبار کر رہے ہیں پہلے کے مقابلے میں اب وہ معاشی اعتبار سے بہت زیادہ بہتر ہیں۔

ہر آدمی کی زندگی میں وہ وقت آتا ہے جب کہ وہ کسی محرومی کا تجربہ کرتا ہے۔ جو لوگ محرومی کو صرف ایک محرومی سمجھیں وہ نئ کوشش کے ذریعہ اپنے آپ کو دوبارہ کامیاب کر لیتے ہیں۔ اور جو لوگ محرومی کو مستقل ناکامی سمجھ لیں وہ پست ہمت ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کے اندر دوبارہ کوئی نیا عمل کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ یہ دونوں حالتیں آدمی کی اپنی سوچ پر منحصر ہیں۔ ایک قسم کی سوچ آدمی کو ناکام بنا دیتی ہے اور دوسری قسم کی سوچ اس کو کامیابی کی طرف لے جاتی ہے۔

مشکل آسان ہوگئی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دس ہزار سے زیادہ اصحاب کے ساتھ مکہ سے طائف جارہے تھے۔ درمیان میں ایک پہاڑی راستہ آیا جو بظاہر کشادہ نہ تھا۔آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ راستہ کیسا ہے۔لوگوں نے راستہ کو اس کی حیثیت ظاہری (face value) پر لیتے ہوئے کہا کہ یہ ایک تنگ راستہ ہے۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دس ہزار سے زیادہ آدمیوں کا یہ قافلہ اس تنگ راستہ سے گزر نہیں سکے گا۔

آپ نے فرمایا کہ نہیں، یہ ہمارے لیے ایک کشادہ راستہ ہے۔ اور پھر آپ نے یہ تدبیر بتائی کہ تم لوگ مجمع کی صورت میں اس راستے سے گزرنا چاہتے ہو اس لیے تم کو یہ راستہ تنگ دکھائی دیتا ہے۔کیوں کہ بیک وقت پورے مجمع کو اس سے گزارنا ہو تو وہ ہمارے لیے تنگ ہی ثابت ہوگا۔ اب تم ایسا کرو آگے پیچھے ہو کر قطار بنا لو۔ چنانچہ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔اب وہ آسانی کے ساتھ چلتے ہوئے اس راستہ سے گزر گئے۔مجمع کی صورت میں جو راستہ تنگ دکھائی دے رہا تھا قطار کی صورت میں وہ ایک کشادہ راستہ بن گیا۔

یہ سوچ کا فرق ہے۔اس دنیا میں سب کچھ سوچ پر منحصر ہے۔غلط سوچ آسان کو مشکل بنا دیتی ہے اور صحیح سوچ مشکل کو آسان کر دیتی ہے سوچ کے اس فرق کا تعلق زندگی کے چھوٹے معاملات سے بھی ہے اور بڑے معاملات سے بھی۔ اس کا تعلق گھریلو مسائل سے بھی ہے اور قومی اور بین الاقوامی مسائل سے بھی۔

غلط سوچ کا نقصان

1930 میں الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا۔علامہ اقبال اس وقت لاہور میں رہتے تھے۔ وہ الہ آباد آئے اور اس اجلاس کی صدارت کی۔اقبال نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ غیر منقسم ہندوستان میں مسلمان اپنی شناخت کو محفوظ نہ رکھ سکیں گے

اس لیے ہندستان جب آزاد ہوتو یہاں کے مسلم اکثریتی علاقہ میں ان کا علٰیحدہ مسلم لینڈ بنایا جائے۔ یہ تجویز بعد کو پاکستان کے نام سے مسلمانوں میں مقبول ہوئی۔ یہاں تک کہ 1947 میں برصغیر ہند سے الگ ایک مسلم علاقہ پاکستان کے نام سے وجود میں آ گیا۔

علٰیحدہ مسلم خطہ کا یہ تصور دوسرے مسلم مفکرین نے بھی اختیار کرلیا۔ اور اس تصور پر مبنی بہت سی تحریکیں دنیا کے مختلف حصوں میں وجود میں آ گئیں۔ ان تحریکوں کو ایک لفظ میں پاکستانائزیشن (Pakistanization) کہا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ جس ملک میں بھی کوئی ایسا سرحدی خطہ تھا جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں پاکستانائزیشن کی یہ تحریک شدت کے ساتھ ابھر آئی۔ ہر جگہ ایسے لیڈر پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی پرجوش تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ مسلمانوں میں علیحدگی پر مبنی جذباتی سیاست کو فروغ دیا۔ اس سلسلہ میں مثال کے طور پر برما، فلپائن، بوسینیا، چیچن، یوگو سلاویا، وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

یہ علاقائی مسلم لیڈر اپنے پاکستانائزیشن کے خیالی تصور میں دیوانگی کی حد تک پر جوش تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تفریقی سیاست کی تحریک کو پُرامن طریقہ کار تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کو مسلح جدوجہد (armed struggle) کے دائرہ کی خونین حد تک پہنچا دیا۔ پاکستانائزیشن کی یہ پرتشدّد تحریکیں ہر جگہ ناکامی سے دوچار ہوئیں۔ اس میں مسلمانوں کے مسائل میں اضافہ کے سوا کچھ اور کارنامہ انجام نہیں دیا۔

پاکستانائزیشن کی یہ تباہ کن تحریک کیوں کر ساری مسلم دنیا میں مقبول ہوگئی۔ اس کا سبب اس دور کے مسلم رہنماؤں کی ایک خلاف زمانہ سوچ (anachronistic thinking) تھی۔ وہ زمانہ کی نئی تبدیلیوں کو سمجھ نہ سکے۔ ایک ایسے دور میں جب کہ ساری دنیا ایک ہو کر گلوبلائزیشن (Globalization) کے دور میں داخل ہو رہی تھی، عین اسی زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے زمانہ سے اپنی بے خبری کے نتیجہ میں پاکستانائزیشن کی صورت

میں برعکس تحریکیں چلا دیں۔ یہ تحریکیں زمانی چٹان سے ٹکرانے کے ہم معنی تھیں۔ اس لیے اس قسم کی تحریکوں کا وہی منفی انجام ہوا جو اوّل دن سے ان کے لیے مقدر تھا۔

جدید زمانی تبدیلیوں نے پچھلے ہر دور سے زیادہ باہمی اختلاط (interaction) کی اہمیت بڑھا دی تھی۔ مگر مسلم لیڈر انتہائی نادانی کے ساتھ اس کے سراسر برعکس اپنی تحریکیں چلا رہے تھے۔ تاریخی تجربات آخری طور پر ثابت کر چکے تھے کہ ترقی کا لازمی ذریعہ چیلنج اور مسابقت (competition) ہے۔ مگر یہ مسلم لیڈر نہایت سرگرمی کے ساتھ مسلمانوں کے لیے ایک ایسی دنیا بنانے میں مشغول تھے جہاں ان کے لیے نہ چیلنج ہو اور نہ مسابقت کا ماحول۔ جدید تبدیلیوں نے ترقی کے جو اعلیٰ مواقع کھولے تھے ان سے یہ ثابت ہو رہا تھا کہ وسیع مشترک عمل سے ہی بڑی ترقیاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ مگر یہ مسلم لیڈر مسلمانوں کے لیے ایسا سیاسی جزیرہ بنانے کو اپنا کارنامہ سمجھ رہے تھے جہاں وہ مشترک کثیر بین الاقوامی تعاون سے محروم ہو گئے ہوں۔

جدید کمیونیکیشن نے جغرافی علیٰحدگی کے تصور کو سراسر غیر ضروری قرار دے دیا تھا۔ مگر یہ مسلم لیڈر اس تبدیلی سے بے خبر ہو کر مضحکہ خیز حد تک بے فائدہ تحریکوں میں اپنا وقت اور مال ضائع کرتے رہے۔ زمانہ نے آزادی اور جمہوریت کی صورت میں ایک عظیم امکان کھولا تھا جو شخصی حکومت کے بجائے عمومی اشتراک طاقت (power sharing) کے اصول پر قائم تھا۔ مگر ان مسلم لیڈروں نے نہ اس امکان کو سمجھا اور نہ وہ اس کو استعمال کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

جدید تبدیلیوں نے ایک نیا موافق امکان کھولا تھا جس کو اداراتی دور (age of institution) کہا جا سکتا ہے۔ قدیم شاہی زمانہ کے برعکس، اب حکومت صرف ایک منتظمہ (administration) کے محدود سیاسی دائرہ میں سمٹ آئی تھی۔ اس کے سوا ہزاروں نئے شعبے ایسے پیدا ہو گئے تھے جن میں ادارے (institution) قائم کر کے حکومتی رتبہ سے بھی

بڑا رتبہ حاصل کیا جا سکتا تھا، مثلاً تعلیم، اقتصادیات، میڈیا وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ مسلم لیڈر شعوری طور پر اس جدید امکان سے باخبر ہی نہ تھے پھر وہ اس کو استعمال کس طرح کرتے۔

مثالوں سے استدلال

اکثر لوگ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے فرضی مثال دیا کرتے ہیں۔ مگر اس قسم کا طریقہ ادب ہے، نہ کہ استدلال۔ کسی نے درست طور پر کہا ہے کہ — تمثیل کا طریقہ استدلال کا سب سے کمزور طریقہ ہے:

Analogy is the weakest form of argument.

مثلاً جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ہر مذہب نجات کا ذریعہ ہے، ہر مذہب یکساں طور پر خدا تک پہنچانے والا ہے۔ اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے یہ تمثیل دی جاتی ہے کہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایک بلڈنگ ہو تو پہاڑ کے جس طرف سے بھی آدمی چڑھ کر اوپر جائے وہ آخر کار بلڈنگ تک پہنچ جائے گا۔ اسی طرح جس مذہبی طریقہ کی پیروی کی جائے وہ آخر کار آدمی کو ایک خدا تک پہنچا دے گا۔

علمی تجزیہ اس تمثیل کو بالکل غلط ثابت کرتا ہے۔ مثلاً کلکتہ جانے والا ایک مسافر دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر ہو تو وہ دیکھے گا کہ وہاں درجنوں گاڑیاں مختلف پٹریوں پر کھڑی ہوئی ہیں۔ اب اگر وہ ایسا کرے کہ وہ مذکورہ فارمولے پر عمل کرتے ہوئے کسی بھی گاڑی پر بیٹھ جائے تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ لازماً اس کو کلکتہ پہنچا دے۔

تمثیلی استدلال کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ ایک صورت حال میں بظاہر درست نظر آتا ہے، لیکن اگر صورت حال کو بدل دیا جائے تو اس کا سارا استدلال بے معنی ہو جائے گا۔ چنانچہ مذکورہ تمثیلی استدلال پہاڑ کی چوٹی کے معاملہ میں بظاہر درست نظر آتا ہے۔ مگر یہی تمثیلی استدلال ریلوے اسٹیشن کے معاملہ کی صورت میں غیر متعلق اور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

چھوٹا شر

حضرت عمر فاروق کا ایک قول ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: لَيْسَ الْعَاقِلُ الَّذِي يَعْرِفُ الْخَيْرَ مِنَ الشَّرِّ، وَلَكِنِ الْعَاقِلُ الَّذِي يَعْرِفُ خَيْرَ الشَّرَّيْنِ (ذم الھویٰ لابن الجوزی، صفحہ 8)۔ یعنی، عقل مند وہ نہیں ہے جو یہ جانے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے، بلکہ عقل مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے کون سا شر بہتر ہے۔

حضرت عمر فاروق کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی آدمی کے پاس صرف دو فہرست ہو۔ ایک ان چیزوں کی فہرست جو خیر ہیں، اور دوسری ان چیزوں کی فہرست جو شر ہیں، ایسا آدمی عالم تو ہوسکتا ہے مگر وہ عاقل نہیں ہوسکتا۔ عاقل یا دانش مند ہونے کے لیے آدمی کو ایک اور چیز سے واقفیت ہونی چاہیے، اور وہ خیر الشرین ہے، یعنی دو شر میں سے بہتر شر۔ یہ جاننا کہ دو شر میں سے کون سا شر نسبتاً کم نقصان والا ہے یا چھوٹی برائی (lesser evil) کی حیثیت رکھتا ہے۔

مثلاً آپ کے گھر کے سامنے کچھ لوگ قابل اعتراض نعرے لگا رہے ہوں تو ایک شر ان کی یہ نعرہ بازی ہے۔ دوسرا امکانی شر یہ ہے کہ اگر آپ انہیں روکیں یا ان سے نزاع کریں تو وہ مزید مشتعل ہوکر فساد برپا کریں گے اور جان و مال کا نقصان پہنچائیں گے۔ اب عقلمند آدمی وہ ہے جو ٹھنڈے ذہن سے سوچ کر یہ سمجھے کہ دونوں قسم کے شر میں سے کون سا شر بڑا ہے اور کون سا شر چھوٹا۔ اور پھر وہ چھوٹے شر کو برداشت کر لے تاکہ اس کو بڑا شر برداشت نہ کرنا پڑے۔

عام آدمی معاملات میں صرف دو چیزوں کو جانتا ہے — خیر کے پہلو کو اور شر کے پہلو کو۔ مگر دانش مند آدمی وہ ہے جو شر کو دو قسموں میں تقسیم کر سکے، اور پھر دونوں میں سے جو شر مقابلتاً خیر یا بالفاظ دیگر، کم ضرر رساں ہو اس کو گوارا کر لے تاکہ وہ زیادہ بڑے شر سے بچ سکے۔

تحمل کی طاقت

ایک شہر کے دو آدمیوں میں ان بن تھی۔ایک دن ایسا ہوا کہ دونوں کی ملاقات ایک سڑک پر ہوئی۔مسٹر الف دیکھتے ہی مسٹر ب پر برس اٹھے۔ان کے پاس جتنے سخت الفاظ تھے وہ سب انہوں نے مسٹر ب پر خرچ کر ڈالے۔مسٹر ب خاموش ہو کر ان کی بات سنتے رہے۔مسٹر الف دیر تک بولنے کے بعد جب چپ ہوئے تو مسٹر ب نے کسی ردعمل کے بغیر بالکل نارمل انداز میں مسٹر الف سے کہا۔میرا خیال ہے کہ آپ تھک گئے ہیں، آئیے ریستوران میں چل کر چائے پئیں۔اس کے بعد دونوں قریب کے چائے خانہ میں گئے۔چائے پیتے پیتے مسٹر الف کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔آخر میں مسٹر الف نے مسٹر ب سے معافی مانگی اور یہ وعدہ کیا کہ آئندہ وہ کبھی کسی کے ساتھ ایسا نہیں کریں گے۔

جب کوئی شخص اشتعال انگیز بات کرے تو عام طور پر سننے والا غصہ ہو جاتا ہے۔وہ جوابی اشتعال کے ذریعے اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔مگر یہ طریقہ آگ کو آگ کے ذریعہ بجھانے کے ہم معنی ہے۔صحیح طریقہ یہ ہے کہ آگ کو پانی کے ذریعے بجھایا جائے۔غصہ کا جواب ضبط و تحمل کے ذریعہ دینے کی کوشش کی جائے۔تحمل صرف ایک اخلاقی صفت نہیں، اس سے بڑھ کر تحمل ایک طاقتور تدبیر ہے۔اشتعال کے جواب میں جب آپ غصہ ہو جائیں تو آپ اپنی سب سے بڑی صلاحیت، یعنی عقل کو کھو دیتے ہیں۔آپ اس قابل نہیں رہتے کہ آپ اپنی عقل کو استعمال کر کے گہرائی کے ساتھ معاملہ کو سمجھیں اور زیادہ کارگر انداز میں اپنا دفاع کریں۔غضب ناک آدمی صرف منفی ردعمل کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔اس کے برعکس جو آدمی غصہ دلانے کے باوجود غصہ نہ ہو وہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ غصہ کے جواب میں مثبت عمل کا ثبوت دے سکے، اور مثبت عمل بلاشبہ منفی عمل کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ مؤثر اور کامیاب ہے۔

ذہنی سکون

موجودہ زمانہ کا شاید سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ آج کسی بھی انسان کو ذہنی سکون حاصل نہیں۔ تقریباً ہر آدمی ذہنی تناؤ اور فکری الجھن میں مبتلا ہے۔ خواہ وہ امیر ہو یا غریب، خواہ وہ سامان والا ہو یا بے سروسامان والا۔ پچھلے سال بنگلور کے ایک کمپیوٹر انجینئر کو اس کی ایک ایجاد پر امریکہ کی طرف سے سات سو پچاس ملین ڈالر اچانک مل گئے۔ مگر اس غیر معمولی دولت نے اس کو ذہنی پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ یہاں تک کہ صرف ایک سال کے اندر اس کا یہ حال ہوا کہ اس کی نیند ختم ہوگئی اور رات کے وقت وہ نیند کی گولیاں کھا کر سونے لگا۔ موجودہ دنیا کے بیشتر لوگوں کا حال کم وبیش یہی ہے، خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے۔

اس مسئلے کا عام طور پر دو حل بتایا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ زیادہ سے زیادہ دولت کماؤ تا کہ زیادہ سے زیادہ راحت کے سامان حاصل کرسکو۔ مگر تجربہ واضح طور پر اس کی تردید کرتا ہے۔ موجودہ زمانے میں بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے بے شمار دولت کمائی اور راحت اور آرام کے تمام سامان اپنے پاس اکٹھے کر لیے۔ مگر ان سب کے باوجود وہ سکون اور چین سے محروم رہے یہاں تک کہ وہ مر کر اس دنیا سے چلے گئے۔

اصل یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے معیار پسند (perfectionist) ہے۔ جبکہ موجودہ دنیا ہر اعتبار سے غیر معیاری (imperfect) ہے۔ اس صورتحال نے انسان اور موجودہ دنیا کے درمیان ایک تضاد پیدا کر دیا ہے۔ اسی تضاد کا یہ نتیجہ ہے کہ کوئی انسان ہر قسم کی دنیاوی سامان کو حاصل کرنے کے باوجود مطمئن نہیں ہوتا۔ دنیا کی ہر چیز اس کو اپنے ذہنی معیار سے کم تر معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ان کو پا کر بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ بظاہر راحت کے سامان کے درمیان بھی وہ ہمیشہ ایک قسم کے غیر شعوری عدم اطمینان میں مبتلا رہتا ہے۔ فطرت کا یہ قانون ثابت کرتا ہے کہ دنیاوی راحت کے سامانوں میں ذہنی سکون تلاش کرنا ایک ایسا بے سود عمل ہے جو کبھی کارآمد بننے والا ہی نہیں۔

دوسرا حل وہ ہے جو خاص طور سے یوگا کے مبلغین کی طرف سے بتایا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے ملک کے اندر اور ملک کے باہر بہت سے میڈیٹیشن سینٹر قائم کیے ہیں۔ جہاں دھیان اور میڈیٹیشن کے ذریعہ لوگوں کو ذہنی سکون کی تربیت دی جاتی ہے۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ مخصوص مراقبہ کے ذریعہ انسانی ذہن میں سوچ کے عمل کو معطل کر دیا جائے تا کہ وہ پریشانی کو شعوری طور پر محسوس کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔ مگر اس قسم کا ذہنی سکون حقیقتاً ذہنی تخدیر (mental anaesthesia) کے ہم معنی ہے۔ یہ انسان کی اعلیٰ فکری صلاحیت کو کند کر کے بےحس حیوان کی سطح پر پہنچا دینا ہے۔ اس قسم کا ذہنی سکون، اگر بالفرض حاصل بھی ہو جائے تب بھی وہ یقینی طور پر غیر مطلوب چیز ہے۔ کیوں کہ جو چیز انسان کے اعلیٰ فکری صلاحیت کو دبا دے، وہ گویا انسان کو کوما (coma) کی حالت میں پہنچانا ہے۔ ایسا ذہنی سکون انسانی موت ہے، نہ کہ انسانی زندگی۔

میڈیٹیشن (mediation) کا یہ طریقہ فطرت کے نظام کی تردید ہے۔ فطرت نے انسان کو جو سب سے اعلیٰ چیز دی ہے وہ اس کا دماغ (mind) ہے۔ فطرت کے نقشے کے مطابق، دماغ کے لیے پریشانیوں کا پیش آنا کوئی برائی کی بات نہیں۔ یہ دراصل زحمت میں رحمت (blessing in disguise) ہے۔ فطرت نے انسان کی ذہنی ترقی کے لیے شاک ٹریٹمیٹ کا طریقہ رکھا ہے۔ ایسی حالت میں شاک ٹریٹمنٹ کے عمل کو ختم کرنا انسان کے لیے اس کی ذہنی ترقی کے دروازے کو بند کرنا ہے۔ اس اعتبار سے یہ طریقہ فطرت کے نظام کے خلاف ہے اور جو چیز فطرت کے نظام کے خلاف ہو وہ اپنے آپ قابل رد ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ذہنی پریشانی (mental tension) کے مسئلہ کا حل ذہنی پریشانی کو ختم کرنا نہیں ہے بلکہ اس کو مینیج (manage) کرنا ہے۔ فکری تدبیر کے ذریعہ اس کو اس طرح غیر مؤثر کر دینا ہے کہ وہ عمل تو انسان کے لیے پیش آئے مگر وہ انسان کے ذہنی سکون کو برہم (disturb) نہ کر سکے۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجیے۔ دہلی میں ایک تیس سالہ نوجوان ہیں جو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں منیجر ہیں۔ ان کو وہاں 75 ہزار روپیہ مہینہ ملتا ہے اور دوسری سہولتیں حاصل ہیں۔ مگر چونکہ ان کمپنیوں میں ہائر اینڈ فائر کا اصول ہے، اس لیے وہ ہمیشہ ذہنی پریشانی میں مبتلا رہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ مجھ کو ہمیشہ سروس سے محرومی کا اندیشہ (fear of loosing job) ستاتا رہتا ہے، نہ دن کو سکون رہتا ہے اور نہ رات کو۔ میں نے انہیں سمجھایا اور کہا کہ میں آپ کو ایک فارمولا دیتا ہوں، اگر آپ اس کو پکڑ لیں تو آپ کا ذہنی سکون کبھی برہم ہونے والا نہیں — ایک شخص آپ کا روزگار چھین سکتا ہے مگر وہ کبھی آپ کی قسمت کو آپ سے چھین نہیں سکتا۔

One can take away your job but no one has the power to take away your destiny.

مذکورہ نوجوان نے اس فارمولا کو پکڑ لیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ دوبارہ ملے اور انہوں نے کہا کہ اب مجھے پوری طرح ذہنی سکون حاصل ہو گیا ہے۔ اب میں اطمینان کے ساتھ سوتا ہوں اور اطمینان کے ساتھ دن گزارتا ہوں۔ اسی طرح ہر آدمی اپنی ذہنی پریشانی کو مینیج کر کے اس کو ڈیفیوز کر سکتا ہے۔ وہ ذہنی پریشانیوں کے باوجود ذہنی سکون کی زندگی حاصل کر سکتا ہے، بغیر اس کے کہ وہ اپنی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں سے محروم ہوا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کا دماغ اتھاہ صلاحیتوں کا خزانہ ہے۔ تمام ذہنی پریشانیوں کا سبب صرف ایک ہے، اور وہ ہے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو استعمال نہ کرسکنا۔ اسی طرح تمام ذہنی پریشانیوں کا حل بھی صرف ایک ہے اور وہ ہے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروقت استعمال کر لینا۔

ایک بڑے شہر کے ایک تاجر ہیں۔ انہوں نے ایک سامان (production) تیار کیا۔ اس میں انہوں نے 50 لاکھ روپیے لگا دیے۔ سامان جب تیار ہوا تو اس کے بعد اچانک مارکیٹ میں اس کی مانگ ختم ہو گئی۔ مجبوراً انہیں اپنے سامان کو گودام میں رکھ

دینا پڑا۔اس حادثہ کا ان پر اتنا زیادہ اثر ہوا کہ وہ بیمار پڑ گئے۔ان کا بلڈ پریشر بڑھ گیا۔راتوں کی نیند غائب ہوگئی۔وہ اعصابی کمزوری کا شکار ہو گئے۔

اُن سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں سمجھایا میں نے کہا آپ اس معاملہ کو صرف حال (present) کے اعتبار سے دیکھتے ہیں۔آپ اپنی اس سوچ کو بدلیے اور معاملہ کو مستقبل (future) کے اعتبار سے دیکھنا شروع کر دیجیے۔آپ سادہ طور پر صرف اتنا کیجیے کہ اس معاملہ کو انتظار (wait and see) کے خانہ میں ڈال دیجیے۔انہوں نے میری نصیحت پکڑ لی۔اس کے تقریباً دو سال بعد ان کا خط آیا جس میں انہوں نے خوشی کے ساتھ لکھا تھا کہ میرا تمام سامان نفع کے ساتھ فروخت ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز کا انحصار سوچنے کے طریقہ پر ہے۔اگر آپ ایک طریقہ سے سوچیں تو آپ کا ذہن ایک ڈھنگ کا بنے گا اور اگر آپ دوسرے طریقہ سے سوچیں تو آپ کا ذہن دوسرے ڈھنگ پر کام کرنے لگے گا۔اسی طرح ہر مایوسی کو اعتماد میں بدلا جا سکتا ہے اور ہر پست ہمتی کو بلند ہمتی میں۔

آئیڈیل یا پریکٹیکل

اکثر لوگ صرف اس لیے نقصان اٹھاتے ہیں کہ وہ آئیڈیل اور پریکٹیکل میں فرق نہیں کرتے۔وہ چیزوں کو آئیڈیل کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور جب وہ ان کے آئیڈیل پر پورا نہیں اترتا تو وہ ان کو رد کر دیتے ہیں۔مگر یہ سراسر نادانی کی بات ہے۔موجودہ دنیا میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو آئیڈیل ملے۔بیشتر حالات میں اس دنیا میں پریکٹیکل پر راضی ہونا پڑتا ہے۔یہ کوئی کم ہمتی کی بات نہیں، یہ فطرت کا قانون ہے اور اس دنیا میں فطرت کے قانون کو قبول کرنا پڑتا ہے، نہ کہ اس سے ٹکرانا۔یہ اصول انفرادی زندگی کے لیے بھی کارآمد ہے اور اجتماعی زندگی کے لیے بھی۔

اس معاملہ کی ایک مثال یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جو نئے انقلابی تصورات دنیا میں رائج ہوئے ان میں سے ایک وہ تھا جس کو سیکولرزم (secularism) کہا جاتا ہے۔ یہ نیا سیاسی نظریہ جب دنیا میں آیا تو موجودہ زمانے کے اسلام پسند رہنماؤں نے اس کو رد کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ سیکولرزم اسلام کے خلاف ہے، بلکہ وہ اسلام سے اصولی بغاوت ہے۔ اپنے اس ذہن کی بنا پر انھوں نے سیکولرزم کا ترجمہ لادینیت کا کیا۔ حالانکہ یہ ترجمہ ہرگز درست نہیں۔

موجودہ زمانے میں مسلم ملکوں میں ہر جگہ مغربی طرز پر تعلیم پائے ہوئے لوگ حکومت کر رہے تھے۔ وہ سیکولر نظام حکومت کے حامی تھے۔ اس بنا پر تمام اسلام پسندوں نے ان کے خلاف نظری اور عملی جنگ چھیڑ دی۔ ہر مسلم ملک کے مسلمان سیکولر طبقہ اور اسلام پسند طبقہ میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے کے خلاف لڑنے لگے۔ اس بے فائدہ جنگ میں مسلمان کو اتنا زیادہ نقصان پہنچا جو پوری مسلم تاریخ میں شاید مسلمانوں کو نہیں پہنچا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ سیکولرزم کوئی مذہبی عقیدہ نہیں۔ سیکولرزم کا مطلب لا مذہبیت نہیں بلکہ مذہب کے بارے میں غیر جانبدارانہ پالیسی اختیار کرنا ہے۔ یہ ایک عملی تدبیر ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مذہبی نزاع سے بچتے ہوئے سیاسی اور اقتصادی امور میں مشترک بنیاد پر ملک کا نظام چلایا جائے۔

یہ سیکولرزم اسلام اور اہل اسلام کے حق میں انتہائی مفید تھا۔ وہ لوگوں کو یہ موقع دے رہا تھا کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں قسم کے ملکوں میں یکساں طور پر اسلام کے مقاصد کے لیے عمل کیا جا سکے۔ مدارس و مساجد کی تنظیم، تعمیری اداروں کا قیام، تعلیم و تربیت، دعوت و تبلیغ، اس قسم کے تمام شعبے مکمل طور پر اہل اسلام کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ وہ ان کو استعمال کر کے ہر ملک میں اسلام کا ایمپائر بنا سکتے تھے۔ یہ ایمپائر اگرچہ غیر سیاسی ہوتا مگر وہ بالواسطہ انداز میں سیاسی نظام پر بھی اثر انداز ہو سکتا تھا۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما سیکولرزم کو آئیڈیل کے معیار پر جانچ کر اس کے دشمن بنے رہے۔ حالانکہ اگر وہ عملی (پریکٹیکل) بنیاد پر اس کو دیکھتے تو وہ اس کو خدا کی ایک نعمت سمجھتے اور ایک عظیم موقع کی حیثیت سے اس کو استعمال کرتے۔

اس معاملہ کا ایک اور اس سے بھی زیادہ بڑا نقصان ہے۔ سیکولرزم کو لادینی اور طاغوتی نظریہ قرار دے کر اس سے لڑنا سراسر غیر حقیقت پسندانہ تھا۔ وہ فطرت کے نظام کے خلاف تھا۔ وہ پریکٹیکل بنیاد پر چلنے والی دنیا میں آئیڈیل بنیاد پر زندگی گزارنے کا غیر عملی پروگرام تھا۔ اس لیے وہ فطری طور پر ناکام ہو گیا۔ اب یہی لوگ عملاً ساری دنیا میں عین اسی سیکولر نظام کے تحت پرسکون زندگی گزار رہے ہیں جس کو انھوں نے اس سے پہلے غیر اسلامی قرار دے کر رد کر دیا تھا اور اس کے تحت زندگی گزارنے کو ناجائز بتایا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جس سیکولرزم کو وہ اصولی طور پر اختیار نہ کر سکے تھے اس کو انھوں نے منافقانہ طور پر اختیار کر لیا۔ دوعملی کی یہ روش بلاشبہ تمام برائیوں میں سب سے زیادہ بڑی برائی ہے۔

مقصد کی حفاظت

قرآن کی سورہ نمبر 22 میں ارشاد ہوا ہے: اور ہم نے ہر امت کے لیے ایک طریقہ مقرر کیا کہ وہ اس کی پیروی کرتے تھے۔ پس اس معاملہ میں تم سے نزاع نہ کریں۔ اور تم اپنے رب کی طرف بلاؤ۔ یقیناً تم سیدھے راستہ پر ہو (22:67)۔

وہ تم سے نزاع نہ کریں، کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کو نزاع کا موقع نہ دو۔ فریق ثانی سے نزاع میں پڑنے کی قیمت یہ ہے کہ دعوت کا موضوع بدل جائے۔ اس کے برعکس، نزاع سے اعراض کا یہ فائدہ ہے کہ دعوت کا اصل نکتہ دونوں کے درمیان زیر بحث رہے۔ داعی کے مفاد میں یہ ہے کہ امر رب دونوں فریقوں کے درمیان مکالمہ (dialogue) کا موضوع ہو، نہ کہ امر غیر رب۔ باہمی مکالمہ کو اصل نکتہ سے ہٹنے نہ دینا داعی کے مفاد میں ہے، اس لیے داعی کو یہ قیمت دینا ہے کہ وہ یک طرفہ اعراض کے ذریعہ اس موافق صورت حال کو برقرار رکھے۔

مولانا محمد الیاس صاحب (بانی تبلیغی جماعت) اپنی تحریک کے ابتدائی زمانے میں میوات گئے۔ ایک دیہاتی اپنے کھیت کے کنارے کھڑا ہوا تھا۔ مولانا نے اس سے کلمہ پڑھنے کے لیے کہا۔ یہ دیہاتی اس قسم کی بات سے مانوس نہ تھا۔ وہ غصہ ہو گیا اور مولانا کو ڈھکیل دیا۔ مولانا زمین پر گر پڑے۔ اس کے بعد مولانا خاموشی کے ساتھ دوبارہ اٹھے اور کسی بھی شکایت کے بغیر انہوں نے دیہاتی سے کہا کہ میں بھی کلمہ پڑھتا ہوں اور تم بھی اس کو دہراؤ۔

مولانا محمد الیاس صاحب کی یہ مثال مذکورہ معاملہ کو اچھی طرح واضح کرتی ہے۔ مولانا الیاس صاحب اگر مذکورہ دیہاتی کی غلط روش کی شکایت کرتے تو موضوع گفتگو بدل جاتا۔ انہوں نے اس کی اس روش کو یکسر نظر انداز کیا تاکہ دونوں کے درمیان صرف دین ہی موضوع بحث رہے، کوئی غیر متعلق چیز اس میں حائل نہ ہو سکے۔

اس طرح کے معاملے میں سوچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ فریق ثانی کی زیادتیوں کو اہمیت دینا اور اس کے خلاف شکایت و احتجاج کرنا۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ فریق ثانی کی زیادتی کو نظر انداز کیا جائے اور اس کو صبر و اعراض کے خانے میں ڈال دیا جائے۔ پہلی روش کا نقصان یہ ہے کہ دونوں فریقوں کے درمیان موضوع بحث بدل جاتا ہے۔ جب کہ دوسرے طریقہ کا فائدہ یہ ہے کہ موضوع بحث کا سلسلہ نہیں ٹوٹتا۔ اصل قابل بحث نکتہ ہی دونوں کے درمیان بلا انقطاع بحث کا موضوع بنا رہتا ہے۔

معاملہ برابر ہو گیا

دوسری عالمی جنگ میں امریکہ اور جاپان ایک دوسرے کے حریف تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو نقصان پہنچا رہے تھے۔ اس کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ امریکہ نے 1945ء میں جاپان کے اوپر دو ایٹم بم گرا دیے۔ اس کے نتیجہ میں جاپان کے دو صنعتی شہر تباہ ہو گئے۔ اس واقعہ نے عام جاپانیوں کو سخت غصہ کر دیا، وہ امریکہ سے انتقام کی باتیں کرنے لگے۔

یہ ایک بے حد نازک موقع تھا۔ جاپان اگر انتقام کے راستے پر چلتا تو وہ اس کے لیے صرف مزید تباہی کا سبب بنتا۔ مگر اس وقت جاپان کے رہنماؤں اور دانشوروں نے ایسی باتیں کیں جنہوں نے جاپانیوں کے ذہن کو منفی رخ سے ہٹا کر مثبت رخ پر ڈال دیا۔ انہوں نے کہا کہ 1945 میں اگر امریکہ نے ہمارے دو شہروں، ہیروشیما اور ناگاساکی کو تباہ کیا ہے تو ہم بھی اس سے پہلے 1941ء میں ان کے بحری مرکز پرل ہاربر کو تباہ کر چکے ہیں۔ اس طرح دونوں کے درمیان معاملہ برابر ہو گیا۔ اب تم اس کو بھلا دو اور جاپان کی نئی تعمیر میں لگ جاؤ۔ اس متوازن سوچ کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان چالیس سال کے اندر پہلے سے بھی زیادہ طاقتور ملک بن گیا۔

جب بھی دو فریقوں کے درمیان نزاع کی صورت پیدا ہوتی ہے تو ہر فریق کی سوچ یک طرفہ رخ پر چلنے لگتی ہے۔ ہر فریق یک طرفہ طور پر صرف دوسرے فریق کی زیادتیوں کو یاد رکھتا ہے اور اس کو بیان کرتا ہے۔ اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی سوچ غیر متوازن ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے حصہ کی زیادتی کو بھلا کر صرف دوسرے کے حصہ کی زیادتی کو یاد رکھتے ہیں۔ سوچنے کا یہ طریقہ ہمیشہ تباہ کن ثابت ہوتا ہے، افراد کے لیے بھی اور قوموں کے لیے بھی۔ اس غیر متوازن طرزِ فکر کو قرآن میں تطفیف کہا گیا ہے اور اُس پر ویل کی خبر دی گئی ہے (المطففین، 83:1-6)۔ نزاعی معاملات میں غیر متوازن طرزِ فکر ہمیشہ تباہی کا سبب بنتا ہے، اور متوازن طرزِ فکر ہمیشہ ترقی کی طرف لے جاتا ہے۔

سیاق وسباق کی اہمیت

کسی بات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے سیاق (context) کو سامنے رکھا جائے۔ اس معاملہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اگر سیاق کو بدل دیا جائے تو سارا مفہوم ہی بدل جائے گا۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجیے۔ راقم الحروف کی کتاب

تذکیر القرآن پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک صاحب نے لکھا ہے:

”مولانا وحید الدین کے نظریات سے اختلاف الگ بات ہے۔ اور مولانا کے اس نظریہ کو کہ ہندوستانی مسلمان ہندوستان میں بے مسائل (بے حقوق) ہو کر رہیں گے تو انہیں اس ملک میں امن نصیب ہوگا، ورنہ نہیں ہوگا۔ اس نظریہ کو آنے والا مؤرخ پسپائی، ہزیمت اور بزدلی کے کون سے درجہ میں رکھے گا، یہ وہی جانیں۔“ (علماء دیوبند کی تفسیری خدمات، مولانا اخلاق حسین قاسمی صفحہ 49)۔

اس تنقیدی ریمارک میں میری عبارت نقل نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ بطور خود کچھ الفاظ لکھ کر ان کو میرا نظریہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ طریقہ سراسر غیر علمی ہے۔ اس اقتباس میں میرا جو نظریہ بتایا گیا ہے وہ میرا نظریہ ہی نہیں۔ میرا یہ کہنا ہے کہ مسلمان اس ملک میں داعی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان کے مقابلہ میں برادران وطن کی حیثیت مدعو کی ہے۔ یعنی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جو رشتہ ہے وہ قومی حریف کا رشتہ نہیں ہے بلکہ وہ داعی اور مدعو کا رشتہ ہے۔

دو قوموں کے درمیان اگر حریف اور رقیب کا رشتہ ہو تو اسی کے مطابق ان کے تعلقات قائم ہوں گے۔ ایسی حالت میں اگر ایک قوم دوسری قوم کے خلاف اپنے دنیوی حقوق کے لیے احتجاج اور مطالبے کی مہم چلائے تو وہ بالکل درست ہوگی۔ مثلاً پسماندہ طبقہ کی طرف سے اونچی ذات کے لوگوں کے خلاف یا محنت کش طبقہ کی طرف سے سرمایہ دار طبقہ کے خلاف حقوق طلبی کی مہم۔ ایسے کسی گروہ کے لیے اس قسم کی مہم چلانے کا معیار ان کے لیے صرف ملکی قانون اور ملکی دستور ہے اب چوں کہ ملکی قانون اور ملکی دستور اس قسم کی مہم کی اجازت دیتا ہے اس لیے وہ ان گروہوں کے لیے جائز مہم قرار پائے گی۔

مگر اہل اسلام کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اہل اسلام کے لیے صرف وہ مسلک درست ہے جو قرآن وسنت کے مطابق درست ہو اور وہ مسلک غلط ہے جو قران وسنت

سے غلط قرار پائے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن وسنت کے معیار کے مطابق، اہل اسلام کی حیثیت داعی کی ہے اور بقیہ قوموں کی حیثیت مدعو کی۔ یہ تعلق بے حد نازک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل اسلام کی حیثیت دینے والے گروہ (giver group) کی ہے اور دوسری قوموں کی حیثیت لینے والے گروہ (taker group) کی۔

داعی اور مدعو کے اس رشتہ کا تقاضا ہے کہ اہل اسلام اپنے مسائل کے لیے احتجاج اور مطالبات کا طریقہ نہ اختیار کریں، کیوں کہ اس سے داعی اور مدعو کے درمیان دعوت کی معتدل فضا باقی نہیں رہتی۔ اس نازک رشتہ کا تقاضا ہے کہ اہل اسلام اپنے مسائل کو خود اپنی کوشش سے حل کریں۔

اس وضاحت سے اندازہ ہوتا ہے کہ راقم الحروف نے جو بات دعوت کے سیاق میں کہی تھی اس کو اس کے سیاق سے ہٹا کر دوسرے غیر متعلق سیاق سے جوڑ دیا گیا۔ اس طرح کلام کا اصل منشاء بالکل بدل کر رہ گیا۔

حافظہ کا مسئلہ

ایک صاحب ہیں جو اپنے ماضی کی بعض تلخ یادوں کی وجہ سے سخت پریشان رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہوگئی ہے۔ ان کے سامنے میں نے ایک اردو شاعر کا ایک شعر پڑھا۔ وہ شعر یہ تھا:

یاد ماضی عذاب ہے یارب　　　چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

انہوں نے اس شعر کو سنتے ہی کہا کہ بہت خوبصورت شعر ہے۔ ان کا تبصرہ سن کر میں نے کہا کہ میرے نزدیک تو یہ بہت بدصورت شعر ہے۔ پھر میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ حافظہ ایک عظیم نعمت ہے۔ حافظہ ہی کی وجہ سے ہم چیزوں کو جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں۔ اگر یہ دعاء قبول ہوجائے اور آدمی کا حافظہ ختم ہوجائے تو وہ بظاہر ایک انسان ہوگا مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ بھیڑ بکری سے بھی بدتر ہوجائے گا۔ میں کئی ایسے آدمیوں

کو جانتا ہوں جن کا حافظہ بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے ختم ہو گیا تھا۔ ان کا حال یہ ہوا کہ وہ نہ کچھ بول سکتے تھے اور نہ کسی کو پہچانتے تھے۔ وہ بے بسی کی حالت میں چند سال اسی طرح زندہ رہے اور پھر مر گئے۔

اس معاملہ میں سوچنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی حافظہ کو ختم کرنے کے بجائے حافظہ کی ناخوش گوار باتوں کو خوش گوار بنانے کی کوشش کرے۔ وہ ان کا تجزیہ کرکے انہیں اپنے لیے غیر مؤثر بنا دے۔

مثلاً ایک شخص کے اوپر کسی آدمی کا قرض ہے۔ وہ قرض نہیں دے پا رہا ہے اور اس بنا پر وہ غم میں گھل رہا ہے۔ ایسے آدمی کے لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرض کو اپنا غم نہ بنائے۔ وہ اپنے آپ کو اس سے بچائے کہ قرض کے مسئلہ کے ساتھ ایک اور مسئلہ اس کی زندگی میں شامل ہو جائے اور وہ ذہنی ٹینشن (mental tension) ہے۔ جب کہ ٹینشن کا مسئلہ بلا شبہ قرض کے مسئلہ سے زیادہ شدید ہے۔ قرض کا مسئلہ اگر صرف مسئلہ ہے تو ٹینشن ایک قسم کی ذہنی خودکشی۔ کامیاب زندگی کا راز یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اس نادانی سے بچائے کہ وہ ایک چھوٹے مسئلہ کو اپنے لیے زیادہ بڑا مسئلہ بنا لے۔

قناعت، ترقی

اکثر خبریں آتی ہیں کہ فلاں بڑی کمپنی دیوالیہ ہو گئی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بڑی بڑی کمپنیاں دیوالیہ پن (bankruptcy) کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس کا سبب صرف ایک ہے، اور وہ ہے اپنی طاقت سے زیادہ بڑی چھلانگ لگانا۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ایک کمپنی کے پاس ذاتی سرمایہ صرف چند ملین ڈالر ہے۔ مگر وہ ایک ایسے صنعتی کاروبار کا منصوبہ بناتی ہے جس کو قائم کرنے کے لیے کئی بلین ڈالر درکار ہیں۔ اب وہ بینک سے سودی قرض لیتی ہے۔ یہ قرض سود کے ساتھ قسطوں میں ادا کیا جاتا ہے۔ اب اگر کمپنی کی آمدنی حسب اندازہ

جاری رہے تو قرض کی قسطیں بھی ادا ہوتی رہیں گی۔لیکن اگر کسی وجہ سے آمدنی میں خلل پڑ جائے تو کمپنی اس قابل نہ رہے گی کہ وہ قرض کی قسطوں کو ادا کر سکے۔اسی توازن کے ٹوٹنے کا نام دیوالیہ پن ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہر مادہ پرست انسان کو کسی نہ کسی صورت میں پیش آتا ہے۔

یہ مسئلہ کیوں پیدا ہوتا ہے۔اس کا ایک نہایت گہرا سبب ہے۔ہر آدمی پیدائشی طور پر زیادہ کی طلب رکھتا ہے۔اپنی طلب میں کسی حد پر رکنا انسانی مزاج کے خلاف ہے۔یہی وہ فطری مزاج ہے جو مذکورہ مسئلہ پیدا کرتا ہے۔مادّی طرزِ فکر میں اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔جو آدمی مادّی کامیابی کی اصطلاحوں میں سوچتا ہو وہ کبھی اس کی کمزوری سے بچ نہیں سکتا۔اس سے یہ کہنا کہ تم ایک مادّی حد پر رک جاؤ، اس کے مزاج کے خلاف ہے۔اس لیے وہ قابلِ عمل بھی نہیں۔

اس معاملہ میں قابلِ عمل فارمولہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے آخرت پسندانہ سوچ۔ آخرت پسندی کے مطابق، اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ آدمی دنیا میں بقدرِ ضرورت پر راضی ہو جائے اور آخرت میں بقدرِ شوق کا طلب گار ہو۔یعنی دنیا میں ضرورت کو کافی سمجھنا، اور زیادہ کی طلب کا رخ آخرت کی طرف کر دینا۔مختصر الفاظ میں، اس کا فارمولا یہ ہے۔دنیا میں محدود پر راضی ہونا اور لامحدود کو آخرت میں چاہنا۔

یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ

جب بھی دو آدمیوں یا گروہوں کے درمیان کوئی نزاع پیدا ہو تو ہر فریق کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے فریق سے اپنی بات منوائے، وہ دوسرے فریق سے اپنے مزعومہ حق کو وصول کرے۔مگر یہ طریقہ سراسر غیر فطری ہے۔اس طریقہ کا واحد انجام یہ ہے کہ وقتی مسئلہ ایک لامتناہی مسئلہ بن جائے۔مزید یہ کہ اصل مسئلہ تو ختم نہ ہو اور نئے مسئلے پیدا ہو کر معاملہ کو پیچیدہ تر بنا دیں۔

نزاعی مسئلہ کا کامیاب حل صرف ایک ہے۔ اور وہ یک طرفہ مفاہمت (unilateral adjustment) ہے۔ دونوں میں سے جو فریق پہلے یک طرفہ مفاہمت پر راضی ہوجائے وہی ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے۔ اور جو فریق راضی نہ ہو اس کو ہمیشہ یہ قیمت دینی پڑتی ہے کہ وہ معاملہ کے اس خاتمہ پر ذلت کے ساتھ راضی ہو جس پر ابتدائی مرحلہ میں عزت کے ساتھ سمجھوتہ ہوسکتا تھا مگر اس وقت اس نے سمجھوتہ نہیں کیا۔

قرآن میں اس اصول کو دو لفظ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: وَالصُّلۡحُ خَيۡرٌ (4:128)۔ یعنی، صلح بہتر ہے:

Reconciliation is the best.

قرآن میں یہ آیت ازدواجی نزاع کے ذیل میں آئی ہے۔ مگر یہ ایک عمومی اصول ہے، اور اس کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔

صلح (reconciliation) کا الٹا لفظ جنگ ہے۔ جنگ کی نفسیات یہ ہے کہ ہر آدمی دوسرے کو زیر کر کے اپنا حق وصول کرنا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس، صلح کا طریقہ دو اور لو (give and take) کے اصول پر قائم ہے۔ اس دوسرے طریقہ میں ہر فریق یہ کوشش کرتا ہے کہ ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے اور پُرامن بات چیت کے ذریعہ دوطرفہ رضامندی سے مسئلہ حل ہوجائے۔

جنگ کے طریقہ میں ہر فریق کی نظر موجود پر ہوتی ہے۔ یعنی جو چیز سامنے موجود ہے اس پر قبضہ کرنا۔ جو لوگ جنگ کی نفسیات کا شکار ہوں وہ موجود پر قبضہ کو جیت اور موجود کے کھونے کو ہار سمجھتے ہیں۔ مگر صلح کی نفسیات والا انسان حال کے بجائے مستقبل کو دیکھتا ہے۔ اس کی بصیرت اس کو بتاتی ہے کہ جو کچھ بروقت سامنے نظر آتا ہے، اس سے بہت زیادہ وہ ہے جو اگرچہ بروقت نظر نہیں آتا مگر دانشمندانہ عمل کے ذریعہ اس کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔

جنگ پسند آدمی کی نظر حال میں اٹکی ہوئی ہوتی ہے اور صلح پسند آدمی کی نظر مستقبل کی طرف متوجہ رہتی ہے۔ یہی مستقبل بینی تمام بڑی بڑی کامیابیوں کا واحد راز ہے۔

مشکل میں آسانی

قرآن کی سورہ نمبر 94 میں فطرت کے ایک عالمگیر اصول کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (94:5-6)۔ یعنی، بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے، بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

With every hardship there is ease,
With every hardship there is ease.

اس قرآنی آیت میں ایک ایسی سوچ کی تعلیم دی گئی ہے، جس کو برتر اندازِ فکر (high thinking) کہا جاسکتا ہے۔ یعنی مشکلات سے اوپر اٹھ کر سوچنا۔ اس کا مقصد آدمی کے اندر ایک ایسے طرز فکر کو پیدا کرنا ہے جو دشواریوں میں گھر کر نہ رہ جائے بلکہ دشواریوں سے باہر آکر سوچے۔ جو آدمی اس برتر سوچ کا ثبوت دے وہ بہت جلد دریافت کرے گا کہ جہاں بظاہر صرف مسائل دکھائی دے رہے تھے وہاں ایسے مواقع بھی موجود تھے جنسے نہ صرف مسائل کو حل کیا جائے بلکہ اپنی ناکامی کو دوبارہ کامیابی میں بدل لیا جائے۔

اس معاملہ کی بہت سی مثالیں ماضی اور حال میں موجود ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی میں وسط ایشیا کے وحشی قبائل جن کو منگول کہا جاتا ہے، اپنی کوہستانی بستیوں سے نکلے اور عباسی سلطنت کو ختم کرکے سمرقند سے حلب تک تمام مسلم شہروں میں چھا گئے۔ اس واقعہ کو مؤرخ ابن اثیر نے ایک ایسی آفت بتایا ہے جو تاریخ میں کبھی پیش نہیں آئی اور نہ شاید دوبارہ پیش آئے۔

گویا اپنے ظاہر کے اعتبار سے یہ ایک عظیم عسر (بہت بڑی مشکل) کا معاملہ تھا۔ مگر

اس مشکل میں ایک آسان پہلو نکل آیا۔ وہ یہ کہ اس فوجی دراندازی کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ مدعو داعی کی آبادیوں میں داخل ہوگیا۔ اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ روزانہ مختلف صورتوں میں داعی اور مدعو کے درمیان اختلاط (enter action) اور بحث وگفتگو (dialogue) ہونے لگا۔ یہ جنگ ابتداء میں قتل وخون دکھائی دیتی تھی مگر بعد کے مرحلہ میں وہ اسلام کو موضوع بحث بنانے کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ اس طرح ایک فطری نتیجے کے طور پر مسلمانوں کی طرف سے منگولوں کے اوپر اسلامی دعوت کا عمل (process) جاری ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچاس سال کے اندر منگولوں کی اکثریت اسلام میں داخل ہو گئی۔ منگولوں کے ساتھ جنگ میں بظاہر مسلمان ہارے تھے مگر عین اسی وقت اسلام نے شاندار کامیابی حاصل کرلی۔

اسی تاریخی حقیقت کو ایک مغربی مؤرخ نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔ مسلمانوں کے مذہب نے وہاں کامیابی حاصل کرلی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو چکے تھے۔

The religion of Muslim have conquered where their arms had failed.

تعمیم کی غلطی

سوچ کی غلطی کی ایک صورت وہ ہے جس کو تعمیم (generalization) کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک استثنائی مثال کو لے کر اس کو عمومی شکل دینا اور اس سے کلی رائے بنانا۔ تعمیم کی غلطی اتنی زیادہ عام ہے کہ بہت کم لوگ اس سے بچتے ہوئے نظر آئیں گے۔ مثلاً بائبل (نیا عہدنامہ) میں ہے کہ حضرت مسیح نے فرمایا کہ: یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔

"Do not think that I came to bring peace on earth. I did not come to bring peace but a sword." (Matthew, 10:29)

حضرت مسیح کا قول ان کے پورے کلام میں ایک استثنا کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے زیادہ تر اقوال محبت اور اخلاق جیسی تعلیمات پر مبنی ہیں۔ ایسی حالت میں مذکورہ قول کو لے کر یہ کہنا حضرت مسیح کا مشن تلوار چلوانا تھا، ایک استثنا کو عموم کا درجہ دینا ہوگا۔ یہ ایک غلط تعمیم ہوگی جو علمی اعتبار سے قابل قبول نہیں۔

اسی قسم کی غلط تعمیم قرآن کے بارے میں بھی کی گئی ہے۔ قرآن سے قتال کی بعض آیتوں کو لے کر کچھ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن جنگ وقتال کی کتاب ہے۔ حالانکہ یہ ایک کھلی ہوئی غلط تعمیم ہے۔ قرآن کی ننانوے فیصد سے زیادہ آیتیں وہ ہیں جو امن اور انسانیت جیسے مثبت موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک فیصد سے بھی کم آیتیں وہ ہیں جو کھلی ہوئی جارحیت کی صورت میں دفاع کے احکام بتاتی ہیں۔ ایسی حالت میں چند آیتوں کو لے کر یہ کہنا کہ یہی قرآن کی عمومی تعلیم ہے، سراسر غلط ہے اور علمی اعتبار سے ناقابل قبول ہے۔

تعمیم کی یہ فکری برائی ہمارے معاشرہ میں پھیلتی جارہی ہے۔ لوگوں کا عام مزاج یہ ہے کہ جس آدمی سے وہ خوش ہوں گے اس کی کچھ خوبیوں کو لے کر اس کو مبالغہ آمیز انداز میں بیان کریں گے۔ وہ انہی چند خوبیوں کی بنیاد پر اپنے محبوب کی مکمل تصویر بنائیں گے۔ اس کے برعکس، جس آدمی سے وہ ناخوش ہوں اس کی خوبیوں کو وہ نظر انداز کریں گے۔ وہ ڈھونڈ کر اس کی کچھ برائیاں نکالیں گے اور ان برائیوں کو مبالغہ آمیز انداز میں بیان کرکے یہ تاثر دیں گے کہ یہی ان کے مبغوض آدمی کی مکمل تصویر ہے۔

تعمیم کی یہ دونوں ہی صورتیں سراسر غلط ہیں۔ یہ طریقہ غیر علمی بھی ہے اور اخلاق اور انصاف کے خلاف بھی۔ جس معاشرہ میں تعمیم کا یہ طریقہ رائج ہوجائے وہاں ہر آدمی کی تصویر مصنوعی بن جائے گی۔ لوگ ایک دوسرے کے بارے میں ایسی رائیں قائم کریں گے جن کا حقیقت واقعہ سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

راقم الحروف کو بھی اپنے دعوتی مشن میں اس قسم کی غلط تعمیم کا تجربہ ہوا ہے۔ مثلاً کچھ لوگ میرے بارے میں یہ مشہور کرتے ہیں کہ ان کو تو بس ایک بات اسلام میں ملی ہے، صلح حدیبیہ۔ حالانکہ یہ سراسر بے بنیاد بات ہے۔ میری دو سو سے زیادہ کتابیں ہیں اور ہزاروں سے زیادہ مقالات ومضامین چھپ چکے ہیں۔ کوئی شخص ان میں دیکھ سکتا ہے کہ میری ان تحریروں میں صلح حدیبیہ کی بات ایک فیصد سے بھی کم ہے۔ اسلام کی دوسری تعلیمات اور وقت کے مسائل کا اسلامی جواب جیسے مضامین سے میری تحریریں بھری ہوئی ہیں۔ مگر خود ساختہ تعمیم کے ذریعہ یہ غلط تاثر دیا جاتا ہے کہ مجھے تو سارے قرآن وحدیث میں صرف ایک چیز ملی، صلح۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں ان کا معاملہ بلاشبہ غیر علمی بھی ہے اور دیانت کے خلاف بھی۔

سبق لینا، نہ کہ سبق سکھانا

1947 سے 1971 تک بنگلہ دیش کا نام مشرقی پاکستان تھا۔ اس وقت وہ پاکستان کا مشرقی حصہ تھا۔ 1971 میں بنگلہ دیش کے لوگوں نے پاکستان کے خلاف مسلح بغاوت کردی۔ اس جنگ میں انڈیا نے بنگلہ دیشیوں کا ساتھ دیا۔ اس طرح انڈیا کی فوجی مدد کے ذریعہ مشرقی پاکستان الگ ہو کر بنگلہ دیش کے نام سے مستقل ملک بن گیا۔ اس واقعے کے بعد پاکستان کے لیڈروں نے کہا کہ ہم انڈیا سے انتقام لیں گے۔ وہ انڈیا پر براہ راست حملہ نہیں کرسکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کشمیر اور پنجاب میں اپنی خفیہ مدد کے ذریعہ پراکسی وار چھیڑ دی۔ یہ پراکسی وار صرف پاکستان کی مزید تباہی کا ذریعہ بنی۔

اس معاملہ میں پاکستان کے لیے سبق سکھانے کی پالیسی درست نہ تھی۔ اس کے لیے زیادہ صحیح پالیسی سبق لینے کی تھی۔ پاکستان کو 1971 کے واقعہ سے یہ سبق لینا چاہیے تھا کہ بنگلہ دیش کا نام مشرقی پاکستان رکھ کر اس کو ایک ملک کی حیثیت سے پاکستان کا حصہ قرار دینا ایک غیر حقیقت پسندانہ سیاست تھی جو عملاً چلنے والی نہ تھی۔ 1971 میں بنگلہ دیش کی علیحدگی اپنی

حقیقت کے اعتبار سے انڈیا کی مداخلت کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ ایک غیر حقیقت پسندانہ سیاست کا فطری انجام تھا جو اپنے وقت پر پیش آیا۔مگر پاکستانی لیڈروں کے ذہن میں سبق سکھانے کا تصور اتنا زیادہ چھایا ہوا تھا کہ اس واقعہ سے وہ اصل مطلوب سبق نہ لے سکے۔ چنانچہ اس کے بعد بھی وہ بار بار نہایت سنگین قسم کی غیر حقیقت پسندانہ سیاست میں مبتلا ہوئے اور اس کے بھیانک انجام سے دوچار ہوتے رہے۔اس کی ایک مثال پاکستان میں جنگجوؤں کی پرورش ہے جو انھوں نے "عظیم تر پاکستان" کے خیالی تصور کو واقعہ بنانے کے لیے کی۔ اگرچہ اس کا بھی فطری انجام یہی ہوا کہ پاکستان ہر اعتبار سے ایک دیوالیہ ملک بن کر رہ گیا۔

عملی طریقہ

ایک مسلمان طالب علم سے ملاقات ہوئی۔ان کے سر کے بال منڈے ہوئے تھے۔ گفتگو کے دوران انہوں نے بتایا کہ وہ جس مدرسے میں پڑھتے ہیں ان کے ناظم نے ان کے اور دوسرے طالب علموں کے سر کے بال منڈوا دیے ہیں۔ ناظم صاحب نے وجہ یہ بتائی کہ مجھ کو بڑے بڑے بال اچھے نہیں لگتے۔میں نے پوچھا کہ جن طلبہ کے سر کے بال منڈوائے گئے انہوں نے کچھ احتجاج، وغیرہ کیا۔مذکورہ طالب علم نے بتایا کہ نہیں۔طلبہ نے اس کو بہت زیادہ برا مانا لیکن وہ اس پر خاموش رہے۔اس لیے کہ اگر وہ احتجاج کرتے تو مدرسہ سے ان کا اخراج کر دیا جاتا۔

اصولی اعتبار سے دیکھا جائے تو ناظم صاحب کا طلبہ کے سر کے بال منڈوانا طلبہ کے لیے ایک اشتعال انگیز واقعہ تھا۔مگر ان طلبہ نے ایسا نہیں کیا کہ وہ بال منڈوانے کے معاملہ کو اصولی اور نظری معیار پر جانچیں۔ بلکہ وہ سب اس معاملہ میں عملی (پریکٹیکل) بن گئے۔ایک معاملہ جو نظری بنیاد پر قابل قبول نہ تھا اس کو انہوں نے عملی بنیاد پر قبول کرلیا۔

غور کیجیے تو ہر آدمی اپنی ذاتی زندگی میں یہی کرتا ہے۔وہ معاملہ کے نظری پہلو پر اصرار

نہ کرتے ہوئے بھی عملی بنیاد پر اس کو ماننے کے لیے راضی ہو جاتا ہے۔ مگر انھی افراد کا حال یہ ہے کہ جب معاملہ قومی اور ملی ہو تو وہ فوراً اس کو نظری اور اصولی اعتبار سے شروع کر دیتے ہیں۔ وہ ایسا نہیں کرتے کہ عملی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے مسئلہ کو ختم کر دیں۔

لوگوں میں تضاد کیوں ہے کہ وہ اپنے انفرادی معاملہ میں حقیقت پسند ہوتے ہیں اور جب ملت کا معاملہ ہو تو وہ غیر حقیقت پسند بن جاتے ہیں۔ اس کا سبب لوگوں میں ذہنی بیداری کا نہ ہونا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ذاتی معاملہ میں آدمی اس کے نفع اور نقصان کو خود بھگت رہا ہوتا ہے، اس لیے وہ کسی سوچ کے بغیر صرف ذاتی تجربہ کی بنیاد پر صحیح رائے تک پہنچ جاتا ہے۔ ذاتی معاملہ میں رائے قائم کرنے کے لیے سوچنے اور فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ ذاتی تجربہ کی تلخی اور شیرینی اس کا رویہ متعین کرنے کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔ یہ عین وہی معاملہ ہے جو ہر حیوان کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ہر حیوان اپنے ذاتی معاملہ میں جان لیتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ مگر دوسرے کے معاملہ میں وہ اس کو جان نہیں پاتا۔ کیوں کہ دوسرے کے معاملے کو جاننے کے لیے فہم درکار ہے جو کہ حیوان میں نہیں ہوتی۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان کے درمیان کوئی ایسی تحریک نہیں اٹھی جو ان کے اندر ذہنی بیداری پیدا کرے۔ جو فن تفکیر (art of thinking) کے اصولوں کی روشنی میں ان کی ذہنی تربیت کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے کی مسلم نسلیں فکری ارتقاء سے محروم ہیں۔ لوگ بس حیوانی سطح پر جی رہے ہیں، ذہنی ارتقاء یا فکری عمل (thinking process) کی انھیں خبر ہی نہیں۔

اقدام نتیجہ خیز ہونا چاہیے

بنی اسرائیل کے اندر پیش آنے والے واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے زمانے میں پیش آیا۔ قرآن کے مطابق، ایسا ہوا کہ حضرت موسیٰ

اپنی قوم کے اوپر حضرت ہارون کو ذمہ دار بنا کر کچھ دنوں کے لیے طُور پہاڑ پر چلے گئے۔ اس دوران بنی اسرائیل نے انہیں روکا مگر قوم کی طرف سے شدت دیکھ کر وہ اس معاملہ میں خاموش ہو گئے۔ مگر جب حضرت موسیٰ واپس آئے تو انہوں نے اس مصنوعی بچھڑے کو توڑ کر پھینک دیا اور مجرمین کو سزا دی (20:85-97;7:148)۔

یہاں یہ سوچنے کی بات ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے عمل میں یہ فرق کیوں تھا۔ کیا وجہ ہے کہ حضرت ہارون نے کھلے ہوئے شرک کے ایک معاملہ کو عملاً برداشت کیا جب کہ حضرت موسیٰ نے اس کو توڑ کر اور جلا کر ختم کر دیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ہارون نے غور وفکر کے بعد یہ جانا کہ اگر وہ عملی اقدام کرتے ہیں تو ایک گروہ ان کا ساتھ دے گا اور دوسرا گروہ بچھڑا پوجنے والوں کے ساتھ رہے گا۔ اس طرح قوم دو گروہوں میں بٹ کر باہمی لڑائی شروع کر دے گی، مگر حضرت موسیٰ کے عمل کی صورت میں یہ اندیشہ نہ تھا۔ حضرت موسیٰ کو قوم میں غالب حیثیت حاصل تھی۔ اس بنا پر یہ ممکن تھا کہ وہ قوم میں جس فیصلہ کو چاہیں نافذ کریں۔

اس واقعہ پر غور کرنے کے بعد یہ اصول ملتا ہے کہ عمل کو ہمیشہ نتیجہ رخی (result-oriented) ہونا چاہیے۔ اگر عملی اقدام نہیں کرنے سے نتیجہ مطلوب صورت میں نکلنے والا ہو تو عملی اقدام کیا جائے گا اور اگر یہ اندیشہ ہو کہ عملی اقدام سے حالات بگڑ جائیں گے اور ایک برائی کی جگہ دو برائی پیدا ہو جائے گی تو عملی اقدام نہ کیا جائے گا۔

ذہنی تناؤ

جدید صنعتی دور نے انسانی زندگی کو بعض نئی قسم کی پیچیدگیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ یہ چیزیں ابتدائی درجہ میں موجود تھیں مگر موجودہ انتہائی درجہ میں ان کا تجربہ انسان کو پہلی بار ہوا ہے۔ انہی میں سے ایک نمایاں مسئلہ وہ ہے جس کو ذہنی تناؤ (mental tension) کہا جاتا ہے۔

پیس آف مائنڈ کے ڈسٹرب ہونے کا سبب زیادہ تر وہ چیز ہوتی ہے جس کو ٹینشن یا اسٹرس کہا جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی بھی شخص کے لیے ٹینشن اسٹرس سے بچنا ممکن نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس معاملہ میں کیا کیا جائے۔ مگر میں کہوں گا کہ ٹینشن یا اسٹرس کوئی برائی (evil) نہیں۔ بلکہ وہ انسان کے لیے ایک نعمت (boon) کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اگر آدمی کے اندر مِنٹل ٹینشن نہ ہو تو اس کے اندر برین اسٹارمنگ نہیں ہوگی۔ اور اگر برین اسٹارمنگ نہ ہو تو مائنڈ کے اندر وہ سرگرمیاں (activities) پیدا نہیں ہوں گی جو اعلیٰ انٹلکچول ڈیولپمنٹ کا واحد ذریعہ ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ٹینشن اور اسٹریس کا یہ کوئی صحت مند حل نہیں ہے کہ اس کو روکنے کی کوشش کی جائے یا اس کو مکمل طور پر دبا دینے کی کوشش کی جائے۔ اس قسم کا حل ایک قسم کی ذہنی تخدیر (intellectual anesthesia) ہے۔ ایسی تخدیر ذہنی ترقی کے عمل کو روک کر انسان کو حیوانی سطح پر لے جانے کے ہم معنی ہے۔

So the solution lies in managing the crisis/ tension and not in suppressing it.

معیار کا فرق

ایک صاحب نے میری تحریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ میں نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں۔ مگر آپ کی تحریروں میں تضاد پایا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ اسکی کوئی مثال دیجیے۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے ایک طرف سید احمد شہید اور سید اسماعیل شہید کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ لوگ بلاشبہ مخلص تھے۔ مگر اسی کے ساتھ آپ یہ لکھتے ہیں کہ 1831ء میں انہوں نے پنجاب میں جو جہاد کیا وہ ایک غیر دانش مندانہ اقدام تھا۔ ایک طرف آپ شہیدین کی تعریف کرتے ہیں اور دوسری طرف آپ ان کی تنقید کرتے ہیں۔ کیا یہ تضاد نہیں۔

میں نے کہا کہ یہ تضاد کی بات نہیں ہے بلکہ یہ فکری معیار کے فرق کی بات ہے۔ آپ لوگوں کا فکری معیار یہ ہے کہ آپ جن افراد کو اکابر کا درجہ دے دیں، ان کے بارے میں آپ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ غلطی نہیں کر سکتے، انہوں نے جو کچھ کہا یا کیا وہ سب درست تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مزعومہ اکابر کے بارے میں اگر کوئی جزئی تنقید بھی کی جائے تو آپ لوگ بھڑک اٹھتے ہیں۔ اپنے معیار کے مطابق، آپ اپنے اکابر کو صرف قابل تعریف سمجھتے ہیں، قابل تنقید نہیں۔

اس کے مقابلے میں دوسرا معیار وہ ہے جس کو علمی معیار کہا جاتا ہے۔ علمی معیار پراسرار شخصی تقدس پر قائم نہیں ہوتا، وہ معلوم اور ثابت شدہ حقائق پر مبنی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمی معیار میں تحلیل اور تجزیہ کا طریقہ رائج ہے۔ علمی معیار کے مطابق، داخلی نیت ایک الگ چیز ہے اور خارجی عمل اس سے مختلف دوسری چیز۔ یہ علمی معیار شریعت کے عین مطابق ہے۔ اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے کہ اگر آدمی کی نیت درست ہو تو اجتہادی خطاء پر بھی اس کو ایک درجہ کا ثواب ملے گا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7352)۔

میرا طریقہ یہی علمی معیار والا طریقہ ہے۔ میں شخصی تقدس کے نظریہ کو درست نہیں سمجھتا۔ میں شخصیتوں کا تجزیہ خالص حقائق کی روشنی میں کرتا ہوں۔ اس تجزیاتی طریق مطالعہ نے مجھے بتایا کہ سید احمد شہید اور سید اسماعیل شہید بلاشبہ مخلص لوگ تھے۔ مگر 1831ء میں انہوں نے پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف جو مسلح جہاد کیا، اس میں بیک وقت دو کمیاں شامل تھیں — ناقص تیاری اور حالات سے بے خبری۔

سید اسماعیل شہید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب جہاد کا فیصلہ ہوا تو انہوں نے جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ اس وقت وہ دہلی میں تھے۔ گرمی کے زمانہ میں وہ دہلی کی جامع مسجد کے پتھر کے فرش پر ننگے پاؤں چلتے تھے۔ اس کو وہ جہاد کی تیاری سمجھتے تھے۔ ان کا یہ عمل ان کے قلبی اخلاص کا ثبوت تو ضرور ہو سکتا ہے مگر اس کا کوئی تعلق مہاراجہ رنجیت سنگھ کی

اعلیٰ تربیت یافتہ فوج کے خلاف جنگ کی تیاری سے نہیں۔ کیوں کہ اس جنگ میں جو چیز فیصلہ کن بننے والی تھی وہ فوجی طاقت تھی، نہ کہ ننگے پاؤں گرم پتھر پر چلنے کی مشق۔

انھی کمیوں کا نتیجہ تھا کہ ان کا یہ مسلح جہاد صرف یک طرفہ تباہی پر ختم ہوا۔ کسی شخص کی نیت خواہ کتنا ہی زیادہ درست ہو، لیکن اگر وہ پتھر کو توڑنے کے لیے اپنا سر اس سے ٹکرانے لگے تو یقینی طور پر حسن نیت کے باوجود اس کا سر ٹوٹ جائے گا۔ کیونکہ پتھر کو ہتھوڑے سے توڑا جا سکتا ہے مگر سر سے نہیں۔

بے بنیاد سوچ

انڈیا کے ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی قسم کی غلط سوچ میں مبتلا ہیں۔ دونوں ہی یکساں طور پر ایک فرضی یقین میں جی رہے ہیں۔ دونوں کے کیس کو مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

مسلم : اسلام سچا ہے، اس لیے میں بھی سچا ہوں۔

ہندو : ہر مذہب سچا ہے، اس لیے میں بھی سچا ہوں۔

یہ دونوں ہی قسم کی سوچ غلط مفروضات پر قائم ہے۔ غیر جانبدرانہ تجزیہ ان کی غلطی کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس قسم کا یقین محض خوش عقیدگی کی بنیاد پر قائم ہے، وہ کسی حقیقی دلیل کی بنیاد پر قائم نہیں۔

اب مسلمان کے معاملہ کو لیجیے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اسلام سچا اور برحق مذہب ہے۔ اسلام برحق مذہب ہونا اسی دنیا میں آج بھی ایک معلوم اور مسلّم حقیقت ہے۔ قرآن کی متعدد آیتیں اس کا ثبوت ہیں، مثلاً: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (3:19)۔ یعنی، دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔ اسی طرح فرمایا: وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ ۚ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (3:85)۔ یعنی، اور جو شخص اسلام کے سوا

کسی دوسرے دین کو چاہے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں سے ہوگا۔ اس طرح کی آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا سچا اور برحق ہونا آج بھی ایک معلوم اور مسلّم حقیقت ہے۔

مگر جہاں تک مسلمانوں کا معاملہ ہے، ان کی حیثیت اس اعتبار سے بالکل مختلف ہے۔ کوئی شخص جو اسلام کا دعویٰ کررہا ہے یا کوئی گروہ جو اپنے آپ کو اسلامی گروہ بتاتا ہے اس کا اسلام صرف آخرت میں معتبر اور متحقق ہوگا، موت سے پہلے کی دنیا میں نہیں۔ موجودہ دنیا میں آدمی کو اندیشہ اور امید کے درمیان جینا ہے۔ جیسا کہ قدیم علما کا قول ہے کہ— الْإِيمَانُ بَيْنَ الرَّجَاءِ وَالْخَوْفِ۔

اب ہندو کے معاملہ کو لیجیے۔ یہ نظریہ کہ ہر مذہب سچا ہے، ایک غیر علمی اور غیر منطقی نظریہ ہے۔ مذاہب کا تقابلی مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کے درمیان بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً کسی کے نزدیک خدا ایک ہے اور کسی کے نزدیک وہ متعدد ہے۔ کوئی پرسنل گاڈ میں یقین رکھتا ہے اور کوئی یہ سمجھتا ہے کہ خدا ایک سرایت کی ہوئی اسپرٹ (pervading spirit) ہے، جس کا کوئی علیٰحدہ تشخص نہیں۔ کوئی پیغمبری کو مانتا ہے اور کوئی ابنیت خدا کو وغیرہ وغیرہ۔ مذاہب کے درمیان اس قسم کے بنیادی اختلافات موجود ہیں، ایسی حالت میں ہر مذہب کو یکساں بتانا ایک دعویٰ ہے جس کے لیے کوئی علمی اور منطقی اساس موجود نہیں۔ مزید یہ کہ "ہر مذہب سچا ہے" کا نظریہ خود اپنی تردید آپ ہے۔ مذہب سچائی کا نمائندہ ہے۔ اور سچائی کبھی تعدد کو قبول نہیں کرتی۔ سچائی وہی ہے جو ایک ہو، جو سچائی کئی ہو وہ سچائی بھی نہیں۔

مذہب کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کو یقین اور اعتماد عطا کرے۔ وہ اس کے لیے جینے کا غیر متزلزل سہارا ہو۔ جو بحران کے لمحات میں اس کے لیے بھروسہ بن سکے۔ یہ مقصد صرف ایک سچائی کے تصور سے پورا ہوسکتا ہے۔ کیونکہ آدمی صرف کسی ایک سچائی پر اپنے ذہن کو مرتکز کرسکتا ہے، نہ کہ کئی سچائیوں پر۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو کہنے میں خوب صورت معلوم

ہوتی ہیں، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ بے معنی ہوتی ہیں۔ وہ گریمر کے اعتبار سے درست اور حقیقت کے اعتبار سے غلط۔

ذہنی ترقی میں رکاوٹ

دہلی کے ایک اردو ماہنامہ میں دعوت اسلام کے موضوع پر ایک تبصرہ چھپا ہے۔ صاحب تحریر کا ایک پیرا گراف یہ ہے۔ ”تحریک اسلامی کے ایک ممتاز، بلند پایہ رہنما نے بڑی اچھی بات کہی کہ موجودہ جدید جمہوری آزاد ہندستان میں، دارالکفر اور دارالاسلام کی فقہی اصطلاحوں میں نہ پڑیے، یہ پورا ملک دارالدعوہ ہے اور یہ امت مسلمہ امت دعوت ہے“ (زندگی نو، مارچ 2002ء صفحہ 72)۔

اس عبارت میں مذکورہ رہنما کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ رہنما سے مراد کون صاحب ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے بارے میں دارالدعوہ کا لفظ پہلی بار راقم الحروف نے استعمال کیا۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ مجھ سے پہلے کسی نے ہندوستان کو دارالدعوہ کہا ہو۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس سے پہلے مسلم رہنماؤں میں سے کسی نے ہندوستان کو دارالکفر کہا، کسی نے دارالحرب کہا، کسی نے دارالطاغوت کہا، کسی نے دارالامن کہا۔ مگر کوئی بھی شخص ہندوستان کو دارالدعوہ نہ کہہ سکا تھا۔ ہندوستان کے لیے دارالدعوہ کا لفظ پہلی بار میں نے استعمال کیا۔ اور اس کے حق میں شرعی دلائل فراہم کیے۔

اب سوال یہ ہے کہ مذکورہ مضمون نگار کے نزدیک وہ کون شخص ہے جس نے بتایا کہ ہندوستان دارالدعوہ ہے۔ اگر وہ جانتے ہیں کہ یہ کام راقم الحروف نے کیا ہے، پھر بھی انہیں میرا نام لینا پسند نہیں تو یہ ایک قسم کی ذہنی بزدلی ہے۔ اور اگر وہ اپنے حلقے کے کسی بزرگ کو فرضی طور پر یہ کریڈٹ دینا چاہتے ہیں تو یہ بدترین قسم کی گروپرستی ہے۔ دونوں حالتوں میں یہ حقائق پر مصلحت کو ترجیح دینا ہے۔ اس کے سوا اس کی کوئی اور توجیہ ممکن نہیں۔

تجربہ بتاتا ہے کہ اکثر لوگ اس قسم کی کمزوری میں مبتلا رہتے ہیں۔اس کمزوری کا سب سے بڑا نقصان کسی دوسرے کو نہیں پہنچتا بلکہ خود اس شخص کو پہنچتا ہے جو ایسی کمزوری میں مبتلا ہو۔اس کو اپنی اس کمزوری کی یہ بھاری قیمت دینی پڑتی ہے کہ اس کا ذہنی ارتقاء رک جائے۔اس قسم کی کمزوری آدمی کے ذہن کو بند ذہن بنا دیتی ہے۔اور یہ ایک حقیقت ہے کہ بند ذہن کسی آدمی کے ذہنی اور فکری ارتقاء میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

ذہنی ارتقا کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ایک ارتقا یافتہ ذہن ہی کو وہ اعلیٰ چیز حاصل ہوتی ہے جس کو معرفت کہا گیا ہے۔اور معرفت کا نہایت گہرا تعلق دینی فہم سے ہے۔معرفت کے بغیر علم صرف معلومات،اور معرفت کے ساتھ علم بصیرت کا خزانہ۔

امن کس لیے

امن کی تعریف اہل علم حضرات اس طرح کرتے ہیں کہ امن عدم جنگ (absence of war) کا نام ہے۔مگر وہ لوگ جو مختلف مقامات پر حق اور انصاف کے حصول کے نام پر جنگ چھیڑے ہوئے ہیں وہ اس تعریف کو نہیں مانتے۔ان کا کہنا ہے کہ امن برائے امن کوئی چیز نہیں۔ان کے نزدیک امن وہ ہے جو امن مع انصاف (peace with justice) ہو، نہ کہ امن بغیر انصاف (peace without justice)۔

یہ سوچ ایک غیر حقیقی سوچ ہے۔انصاف امن کا نتیجہ نہیں ہے۔انصاف خود طالب انصاف کے عمل کا نتیجہ ہے۔امن کے ذریعہ وہ معتدل حالات پیدا ہوتے ہیں جو مواقع کے استعمال کو ممکن بناتے ہیں۔جنگ کی حالت مواقع (opportunities) کے استعمال میں رکاوٹ ہے۔امن کی حالت قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مواقع کی راہ سے یہ رکاوٹیں ختم ہوجائیں تاکہ ان کو استعمال کرکے اپنا مطلوب حق یا اپنا مطلوب انصاف حاصل کیا جاسکے۔

اگر آدمی کی سوچ یہ ہو کہ وہ فریق ثانی سے امن کا معاملہ کرنے پر صرف اس وقت راضی ہوگا جب کہ امن کے ساتھ ساتھ اس کو انصاف مل رہا ہو، تو آدمی کو نہ کبھی امن ملے گا اور نہ کبھی انصاف۔ ایسا امن اس دنیا میں کسی کے لیے ممکن ہی نہیں۔ یہ سوچ ایک غیر فطری چیز ہے جو اس دنیا میں کبھی نتیجہ خیز ہونے والی نہیں۔ صحیح سوچ یہ ہے کہ امن کو مواقع عمل سے جوڑا جائے، نہ کہ حصول انصاف سے۔ امن کو فریق ثانی سے معاہدہ کرکے حاصل کیا جاسکتا ہے مگر انصاف یا حق کسی کو صرف اپنے عمل سے ملتا ہے، نہ کہ کسی اور کے دینے سے۔

وقت کے پیچھے سوچنا

مارچ 2002ء میں مسئلۂ فلسطین کے حل کے بارے میں عرب ملکوں کے درمیان ایک نیا نظریہ ابھرا۔ وہ یہ کہ اسرائیل کو باقاعدہ طور پر قبول کرلیں گے۔ ایک تعلیم یافتہ عرب نے ایک یہودی سے بات کرتے ہوئے اس کے سامنے یہ تجویز رکھی۔ یہودی نے مسکراتے ہوئے کہا کہ عزیز پڑوسی، تم نے بہت دیر کردی۔

Dear Neighbor, you are too late.

عرب حضرات کی مذکورہ تجویز بہت اچھی ہے مگر یقینی طور پر وہ قابل عمل نہیں۔ یہ دراصل وقت کے پیچھے سوچنا ہے جو کہ عملی طور پر ناممکن ہے۔ ایک اردو شاعر نے درست طور پر کہا ہے کہ:

”گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں“

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ عربوں کے لیے فلسطین کے معاملہ میں جو چیز 1917 میں ممکن تھی، وہ 1948 میں ناممکن ہوچکی تھی۔ اسی طرح ان کے لیے جو چیز 1948ء میں ممکن تھی، وہ ان کے لیے 1967 میں ممکن نہ رہی تھی۔ اسی طرح ان کے لیے جو چیز 1967 میں

ممکن تھی، وہ اب 2002 میں ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ یہ حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ ہو مگر وہ ایک تاریخی حقیقت ہے، اور تاریخ کو بدلنا کسی کے لیے ممکن نہیں، نہ عربوں کے لیے اور نہ کسی دوسرے کے لیے۔

2002ء میں عربوں کے لیے فلسطین کے معاملہ میں جو چیز ممکن ہے وہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ غزّہ اور اریحاء کی صورت میں ان کو جو چیز ملی ہے اس کو قبول کر لیں۔ وہ اس حاصل شدہ خطے پر اپنے مستقبل کی تعمیر کریں۔ مگر بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اپنے پرجوش رہنماؤں کی غیر حقیقت پسندانہ رہنمائی کے نتیجہ میں انہوں نے اس حاصل شدہ ٹکڑے کو بھی اپنے لیے مشتبہ بنالیا ہے۔

عربوں کو جاننا چاہیے کہ وہ حماس اور انتفاضہ جیسی پرتشدّد تحریکوں کے بَل پر کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتے۔ منفی عمل سے کبھی کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ حماس اور انتفاضہ جیسی تحریکیں حقیقت کے اعتبار سے تحریکیں نہیں ہیں، وہ صرف جذباتی ردعمل کا مظہر ہیں۔ اور حقائق کی اس دنیا میں سوچے سمجھے عمل کے ذریعہ کوئی نتیجہ نکلتا ہے، نہ کہ جذباتی ابال کے ذریعہ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ماضی کی بنیاد پر کبھی حال کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ حال کا فیصلہ ہمیشہ حال کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ یہ ایک ناقابل تنسیخ تاریخی قانون ہے۔ اس میں کوئی استثناء کبھی ممکن نہیں، نہ ایک قوم کے لیے اور نہ کسی دوسری قوم کے لیے۔

برائی کی جڑ

اکثر لیڈر سوچ کی اس غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں جو لوگ سیاسی اقتدار پر قابض ہیں وہی تمام برائیوں کی جڑ ہیں۔ اگر ان کو اقتدار سے ہٹا دیا جائے تو تمام برائی ختم ہو جائے گی۔ یہ سوچ اپنے تجربہ میں بار بار غلط ثابت ہوئی ہے۔

مصر کی جماعت الاخوان المسلمون نے یہ سمجھا کہ شاہ فاروق کی حکومت ملک کی تمام

خرابیوں کی جڑ ہے۔ اگر کسی طرح اس حکومت کا خاتمہ کردیا جائے تو اس کے بعد ملک کا نظام ہر اعتبار سے درست ہوجائے گا۔ اس ذہن کے تحت انہوں نے مصر کے کچھ فوجی افسروں کے ساتھ مل کر شاہ فاروق کی حکومت کو ختم کردیا اور انہیں ملک سے نکال دیا۔ مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ صرف یہ کہ حالات پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گئے۔

اسی طرح پاکستان کی جماعت اسلامی نے یہی غلطی مزید اضافے کے ساتھ دہرائی۔ مثلاً صدر محمد ایوب خاں کی حکومت کے زمانے میں انہوں نے یہ فرض کرلیا کہ ملک کے ساتھ تمام خرابیوں کی جڑ ایوب خاں کی فوجی حکومت ہے۔ انہوں نے اس حکومت کے خلاف ہنگامہ خیز مہم شروع کی۔ یہاں تک کی صدر ایوب کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ مگر ملکی حالات میں کوئی سدھار نہ ہوسکا۔ اس کے بعد دوبارہ یہی ہوا کہ انہوں نے فرض کرلیا کہ سابق پاکستانی وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ چنانچہ وہ دوسرے اسلام پسندوں کو ساتھ لے کر مسٹر بھٹو کے سیاسی اقتدار کو اکھاڑنے میں مصروف ہو گئے۔ حتیٰ کہ جنرل ضیاء الحق کی مدد سے مسٹر بھٹو کو پھانسی پر چڑھانے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر ملک کے حالات بدستور بگڑتے چلے گئے۔

"برائی کی جڑ" کے نظریہ کا تجربہ موجودہ زمانے میں بار بار دہرایا گیا ہے مگر ہر بار وہ مکمل طور پر ناکام ہوا ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے لیڈر بھی بار بار اس غلط فکری میں مبتلا ہوئے۔ مثلاً مہاتما گاندھی نے یہ سمجھا کہ برٹش راج ہندوستان کی ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ اسی طرح جے پرکاش نرائن نے سمجھا کہ کانگریسی راج ملک کی ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ مگر ہنگامہ خیز جدوجہد کے بعد جب برٹش راج اور پھر کانگریسی راج ختم ہوا تو معلوم ہوا کہ ملک کے اصل حالات میں مطلوب تبدیلی نہ ہوسکی۔ پورن سوراج اور پورن کرانتی ملک کی اصل برائیوں (مثلاً کرپشن) میں جزئی اصلاح بھی نہ لا سکے، پورن سدھار کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر قسم کے بگاڑ کا تعلق سوچ سے ہے۔ اصلاح کا راز یہ ہے کہ انسانی سوچ میں تبدیلی لائی جائے۔ انسانی سوچ کو بدلے بغیر کوئی بھی اصلاح ممکن نہیں۔

سوچ کے بغیر

بہار کے ایک شہر میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ اس فساد میں مسلمانوں کا بہت زیادہ نقصان ہوا۔ شہر کے مسلمانوں کی معاشیات تباہ ہو کر رہ گئی۔ اس شہر کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے میری ملاقات ہوئی۔ ان سے میں نے پوچھا کہ آپ کے شہر میں فساد کیوں ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ ہندوؤں کا ایک جلوس نکلا۔ مسلم محلہ میں پہنچ کر اس نے مخالفانہ نعرہ لگانا شروع کیا۔ اس پر مسلمان بھڑک اٹھے۔ کچھ مسلم نوجوانوں نے "ایک اسٹپ لیا": اس کے بعد دنگا شروع ہو گیا۔ وہ لوگ مسلم گھروں اور مسلم دکانوں کو جلانے اور لوٹنے لگے۔

میں نے پوچھا کہ آپ کہتے ہیں کہ مسلم نوجوانوں نے ایک اسٹپ لیا، یہ اسٹپ کیا تھا۔ اصرار کے بعد انہوں نے بتایا کہ نوجوانوں نے جلوس کے اوپر کچھ دستی بم پھینکے، اس کے بعد وہ لوگ مشتعل ہو کر تخریبی کارروائیاں کرنے لگے۔ پھر میں نے پوچھا کہ وہ نعرہ کیا تھا جس پر آپ لوگوں نے اسٹپ لیا۔ انہوں نے بتایا کہ نعرہ یہ تھا: جے ماں کالی، مسلمان محلہ کرو خالی۔

گفتگو کے دوران انہوں نے کہا کہ اس قسم کے اشتعال انگیز منصوبہ کا جواب دینا تو ضروری تھا۔ میں نے کہا کہ اس کو اشتعال انگیز منصوبہ نہ کہیے بلکہ ایک ایسا خیالی منصوبہ کہیے جو کبھی وجود میں آنے والا ہی نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بتائیے کہ نعرہ اور فساد کے بعد کیا آپ کا محلہ مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ انہوں نے جوش کے ساتھ کہا کہ ہرگز نہیں، مسلمان آج بھی پہلے کی طرح اپنے محلے میں موجود ہیں۔ میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا نعرہ ہوا میں تحلیل ہو گیا، وہ زمین پر واقعہ نہ بن سکا۔

میں نے ان کی بات سن کر کہا کہ میرے بھائی، جو نعرہ اتنا کمزور تھا کہ خونیں فساد کرانے کے بعد بھی وہ محلہ مسلمانوں سے خالی نہ کرا سکا ایسے کمزور نعرہ پر آپ کو بھڑکنے کی کیا

ضرورت۔ ایسے نعرہ کا سادہ جواب قدیم مثل کے مطابق، یہ تھا: کتے بھونکتے رہتے ہیں اور ہاتھی چلتا رہتا ہے۔

یہ ہے صحیح سوچ کا فقدان۔ صحیح سوچ لوگوں کو مکمل طور پر خونیں فساد سے بچا سکتی تھی، مگر غلط سوچ نے ان کو ذلت اور نقصان کی دوطرفہ تباہی میں مبتلا کردیا۔ غلط سوچ آدمی کو بم کے اوپر بم مارنا سکھاتی ہے، اور صحیح سوچ اس کو وہ تدبیر بتاتی ہے جس کے ذریعہ وہ بم کو ڈیفیوز (defuse) کرکے اس کو غیر مؤثر بنادے۔

سیکنڈری پوزیشن

مسجد کی نماز باجماعت میں ہر روز ایک سبق دیا جاتا ہے۔ وہ سبق یہ ہے کہ دس ہزار نمازیوں میں سے نو ہزار نو سو ننانوے نمازی جب مقتدی بن کے اپنے لیے ثانوی حیثیت (secondary position) کو قبول کرتے ہیں، اس وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک شخص کی امامت میں نماز باجماعت ادا کی جاسکے۔ یہی فارمولا مسجد کے باہر کی زندگی کے لیے بھی مطلوب ہے۔ جس سماج یا گروہ کے اندر یہ مزاج نہ ہو وہاں نہ اتحاد قائم ہوگا اور نہ کوئی ترقی ہوسکے گی۔ زندگی میں ثانوی حیثیت کو قبول کرنا کسی بھی ترقی کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

ملی یا اجتماعی زندگی کے لیے یہ مزاج انتہائی طور پر ضروری ہے۔ مگر یہ مزاج اپنے آپ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے لیے شعوری تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی قوم میں سب سے زیادہ اہمیت ایسی تحریک کی ہے جو لوگوں میں اس قسم کا مزاج پیدا کرے۔ شعور کی بیداری اصل کام کی حیثیت رکھتی ہے۔ کسی بھی تعمیری تحریک کا نقطۂ آغاز شعور کی تربیت ہے، نہ کہ پرجوش مظاہرہ یا عملی اقدام۔

میڈیا کلچر

موجودہ زمانہ میں لوگوں کی سوچ میں بگاڑ آیا ہے اس کا غالباً سب سے بڑا سبب وہ جدید ظاہرہ ہے جس کو میڈیا کلچر کہا جاسکتا ہے۔ جدید میڈیا، خواہ وہ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا، سب کا طریقہ یک طرفہ رپورٹنگ (one sided reporting) کا ہے۔ چونکہ عام لوگ خبروں کو میڈیا کے ذریعہ لیتے ہیں اس لیے لوگوں کی رائے ہر معاملہ میں ناقص ہوگئی ہے۔ وہ یک طرفہ سوچ کے تحت رائے قائم کرتے ہیں۔ اس یک طرفہ رپورٹنگ کا اصول یہ ہے کہ بری خبروں کو لو اور اچھی خبروں کو چھوڑ دو۔ میڈیا کی حیثیت ایک انڈسٹری کی ہے۔ اور انڈسٹری ہونے کے اعتبار سے اس کے لیے یہی مفید طریقہ ہے کہ وہ کسی ملک یا سماج کی بری خبروں کو نمایاں کرے۔ اور اچھی خبروں کو قابل تذکرہ نہ سمجھے۔ میڈیا کی اس روش نے عالمی سطح پر انسانی سوچ کو منفی بنا دیا ہے۔

اس معاملہ کی ایک دلچسپ مثال یہاں نقل کی جاتی ہے۔ میں اکثر بی بی سی لندن کی نشریات کو سنتا ہوں۔ ایک دن میں بی بی سی لندن کا ہندی پروگرام سن رہا تھا۔ اپنے طریقہ کے مطابق، انہوں نے آخر میں کچھ خطوط پڑھ کر سنائے۔ ایک خط ماریشش میں مقیم ایک ہندو کا تھا۔ اس نے اپنے خط میں یہ شکایت کی تھی کہ آپ ہندی بولنے والے علاقے کی خبریں نشر کرتے ہیں، ماریشش میں بھی بہت سے لوگ ہندی بولتے ہیں مگر آپ کبھی ماریشش کی کوئی خبر نہیں دیتے۔ بی بی سی لندن کے اناؤنسر نے ہنستے ہوئے اس خط کا جواب دیا۔ اس نے کہا کہ میڈیا تو بری خبروں کی رپورٹنگ کا نام ہے۔ آپ کے ملک میں سب سے اچھی خبریں ہوتی ہیں، اور اچھی خبر میڈیا کے نزدیک کوئی خبر نہیں۔

Good news is no news.

یہ فطرت کے نظام کے خلاف ہے کہ دنیا میں صرف برائی ہی برائی ہو۔ حقیقت یہ ہے

کہ خود نظام فطرت کے تحت دنیا میں اگر ایک فیصد برائی ہوتی ہے تو عین اسی وقت ننانوے فیصد اچھائی موجود رہتی ہے، خواہ براہ راست طور پر یا بالواسطہ طور پر۔ مگر میڈیا کبھی لوگوں کو اس واقعہ کی خبر نہیں دیتا کہ ہم جن برائیوں کی رپورٹ کر رہے ہیں وہ پورے سماج کا ایک فیصد حصہ ہے، نہ کہ کل حصہ۔ 1947ء سے پہلے برصغیر ہند کے اخبارات انگریزوں کے بارے میں صرف ان کے "ظلم" کی خبریں دیتے تھے، انگریزی نظام کے مثبت پہلو اخباروں میں جگہ نہیں پاتے تھے۔ چنانچہ تمام ہندوستانیوں کو انگریزوں سے نفرت ہو گئی۔

1947 سے پہلے مسلم لیگ سے متاثر اخبارات یہاں کے ہندوؤں کے مثبت پہلوؤں کو نظر انداز کرتے تھے اور ان کے بابت میں صرف منفی باتیں چھاپتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کی اکثریت یہاں کے ہندوؤں کے بارے میں بدظن ہو گئی۔ اسی طرح آج کل تمام دنیا کا مسلم میڈیا امریکہ کے مثبت پہلوؤں کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا، وہ اس کے بارے میں صرف بری باتوں کو مسلمانوں تک پہنچاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان امریکہ سے متنفر ہو گئے ہیں اور یہ سمجھنے لگے ہیں کہ امریکہ اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے۔

میڈیا کی حیثیت ایک انڈسٹری کی ہے۔ میڈیا کے اپنے تجارتی مصالح کی بنا پر یہ ممکن نہیں کہ وہ یک طرفہ رپورٹنگ کا طریقہ ختم کرے اور دوطرفہ رپورٹنگ کا طریقہ اپنے یہاں رائج کرے۔ اس مسئلہ کا عملی حل میڈیا کی شکایت کرنا نہیں ہے بلکہ خود اپنے ذہن کی اصلاح کرنا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم لوگوں کے اندر شعوری بیداری پیدا کریں۔ ہم یہ کوشش کریں کہ لوگوں کے اندر تفکیر وتدبر کی صحیح صلاحیت پیدا ہوتا کہ وہ میڈیا کی ناقص رپورٹنگ سے متاثر نہ ہوں، بلکہ خود تجزیہ کر کے معاملات کے بارے میں درست رائے قائم کریں۔

اس تجزیہ کا طریقہ یہ ہے کہ مثلاً جب آپ مسلم اخباروں میں یا مسلم رہنماؤں کی

تقریروں میں یہ سنیں کہ امریکہ اسلام کا دشمن ہے تو آپ اس کا تجزیہ کریں۔ آپ یہ سوچیں کہ امریکہ جب ایک دشمن ملک ہے تو چھ ملین سے زیادہ مسلمان وہاں جا کر کیسے آرام کے ساتھ رہ رہے ہیں، حتیٰ کہ اخبار کے ایڈیٹر یا اسٹیج کے مقرر کے خود اپنے رشتہ دار بھی۔ اسی طرح یہ کہ اگر امریکہ اسلام دشمن ہے تو وہاں ہزاروں کی تعداد میں اسلامی ادارے کیوں قائم ہیں اور آزادی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ کیوں ایسا ہے کہ امریکہ میں ایسے شاندار اجتماعات ہوتے ہیں جو مسلم ملکوں میں بھی نہیں ہوتے۔ اسی طرح یہ کہ اگر امریکہ اپنی اسلام دشمنی کی بنا پر فلسطین میں یہودیوں کی مدد کرتا ہے تو وہی امریکہ اسلامی ملک پاکستان کی مسلسل طور پر کیوں مدد کر رہا ہے، وغیرہ۔

جب آپ مسلم اخباروں اور مسلم رہنماؤں کی باتوں کا اس طرح تجزیہ کریں گے تو آپ یقینی طور پر جان لیں گے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ میڈیا کی فراہم کردہ ایک فیصد خبروں پر انحصار نہ کیجیے بلکہ اس کے ساتھ بقیہ ننانوے فیصد خبروں کو بھی شامل کرکے دیکھیے اور پھر آپ کبھی رائے قائم کرنے کی غلطی میں مبتلا نہیں ہوں گے۔

الٹی سوچ

کوئی فرد یا گروہ تشدّد کیوں کرتا ہے، اپنے کسی حق کے حصول کے لیے۔ مگر نتیجے کے اعتبار سے یہ سوچ بالکل الٹی سوچ ہے۔ کیوں کہ تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ تشدّد کے ذریعہ ہم کھوتے ہیں اور امن کے ذریعہ ہم حاصل کرتے ہیں۔

Through violence we lose, through peace we gain.

ہٹلر اور اسٹالن جیسے بہت سے ڈکٹیٹروں نے بہت بڑے پیمانے پر تشدّد کیا، اپنے خیال کے مطابق، اپنے مفروضہ مقصد کو حاصل کرنے کے لیے۔ مگر بلا استثنا ہر ایک تشدّد کا انجام صرف تباہی کی صورت میں نکلا۔

یہی معاملہ خود مسلمانوں کا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مختلف علاقہ کے مسلمانوں نے بزعم خود انصاف کے لیے یا اپنے حقوق کے لیے تشدّد کا طریقہ اختیار کیا۔ مگر اس کا نتیجہ ہمیشہ برعکس صورت میں نکلا۔ تشدّد کے آغاز میں وہ جہاں تھے، تشدّد کے آخر میں وہ اس سے بھی زیادہ پیچھے چلے گئے۔

اس کی ایک مثال فلسطین کا مسئلہ ہے۔ اعلان بالفور (Balfour Declaration) کے تحت 1948 میں یہودیوں کو فلسطین کا ایک تہائی حصہ دیا گیا۔ اس کے مقابلے میں عربوں کو فلسطین کا دو تہائی حصہ حاصل ہوا جس میں پورا یروشلم بھی شامل تھا۔ مگر عربوں نے اس تقسیم کو قبول نہیں کیا اور اعلان کیا کہ ہم یہودیوں کو سمندر میں ڈھکیل دیں گے۔

عربوں کی یہ جدو جہد ابتداء ہی سے تشدّد کے راستہ پر چل پڑی اور آج تک اسی راستہ پر چل رہی ہے۔ مگر بے پناہ جانی اور مالی قربانی کے باوجود اس کا نتیجہ عربوں کو صرف ذلت اور محرومی کی صورت میں ملا، ایک روایت میں آیا ہے کہ: إِنَّ اللّٰهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ، وَيُعْطِي عَلَى الرِّفْقِ مَا لَا يُعْطِي عَلَى الْعُنْفِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2593)۔ یعنی، اللہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ خدا نے اس دنیا کے لیے جو قانون مقرر کیا ہے اس کے تحت یہاں کامیابی صرف پُرامن طریق کار میں لکھ دی گئی ہے، پرتشدّد طریق کار کے ذریعہ یہاں کسی کو کامیابی ملنے والی نہیں۔

ایک اور روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَاسْأَلُوا اللّٰهَ الْعَافِيَةَ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1742)۔ یعنی، دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو اور اللہ سے عافیت مانگو۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ اگر کسی کے ساتھ عداوت کے اسباب پیدا ہوں تو اس کے مقابلے میں تمہاری جوابی منصوبہ بندی امن کی بنیاد پر ہونی چاہیے، نہ کہ تشدّد کی بنیاد پر۔

اصل یہ ہے کہ آدمی جب بھی تشدّد کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو وہ جذبات سے مغلوب ہو کر

ایسا کرتا ہے۔ وہ ضد اور انتقام کی نفسیات کے تحت تشدّد کے راستے پر چل پڑتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرے کہ اس قسم کے مواقع پر اپنے منفی جذبات کو قابو میں رکھے، وہ حقیقت پسندانہ انداز میں پورے معاملہ کا بے لاگ جائزہ لے کر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے تو وہ کبھی تشدّد کا طریقہ اختیار نہیں کرے گا۔ وہ ہر حال میں امن کے حدود میں رہ کر اپنی کارروائی کرے گا۔ خواہ امن کا طریقہ اختیار کرنے میں ابتدائی طور پر اس کو کچھ محرومی کو برداشت کرنا پڑے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پُرامن طریقہ اختیار کرنے میں بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ آدمی کو کچھ نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر اس کے اندر غیر متاثر سوچ ہو تو وہ اس کو بتائے گی کہ تھوڑے نقصان کو برداشت کرلو تاکہ تمہیں بڑے نقصان کو برداشت نہ کرنا پڑے۔ جو کچھ کھویا جاچکا ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش میں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ اب بھی حاصل ہے اس کو بھی کھودینا پڑے۔

اوپر اٹھ کر سوچنا

جب ایک فرد اور دوسرے فرد کے درمیان یا ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان کسی معاملہ میں نزاع پیدا ہو تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ وقتی مسائل سے اوپر اٹھ کر سوچ نہیں پاتے۔ سامنے کا نقصان، عزت کا سوال، اس قسم کی چیزیں آدمی کے ذہن پر اتنا زیادہ غالب آتی ہیں کہ اس کے لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ نزاع سے الگ ہو کر سوچے اور زیادہ دوررس فیصلہ کرسکے۔

اسی کوتاہ فہمی کا نتیجہ ہے کہ اکثر افراد اور اکثر قومیں کسی نہ کسی مسئلہ میں الجھی رہتی ہیں۔ ان کے وقت اور ان کی طاقت کا ایک بڑا حصہ مستقل طور پر مسائل کے حل کے نام پر غیر مفید چیزوں میں ضائع ہوتا رہتا ہے۔ حالانکہ عقل مندی یہ ہے کہ اپنی پوری قوت کو صرف تعمیر وترقی کے کام میں لگایا جائے۔

دانش مندی یہ ہے کہ جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہو تو فوری تقاضوں (considerations) کو نظر انداز کر کے مستقبل کے اعتبار سے جرأت مندانہ فیصلہ کیا جائے۔ مسئلہ پیدا ہونے کے بعد ساری توجہ مسئلہ کو ختم کرنے پر لگائی جائے۔ ہر فوری نقصان کو گوارا کرتے ہوئے مصالحت کر لی جائے۔

ایسے ہر موقع پر آپ کا نشانہ نزاع کو ختم کرنا ہونا چاہیے، نہ کہ خود مسئلہ کو ختم کرنا۔ آپ کو چاہیے کہ آپ مستقبل کو دیکھیں، نہ کہ صرف حال کو۔ آپ کی نظر ملنے والے امکان پر ہونی چاہیے، نہ کہ کھوئے جانے والے نقصان پر۔ یہی اس دنیا میں ترقی کا واحد راز ہے۔

تنقید کوئی برائی نہیں

بہت سے لوگ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ کام کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اُس میں تنقید کا انداز اختیار نہ کیا جائے۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ غیر تنقیدی انداز عوام کی بھیڑ جمع کرنے کے لیے تو یقیناً مفید ہے مگر وہ کسی گہرے اصلاحی کام کے لیے ہرگز مفید نہیں۔

تنقید کوئی برائی نہیں، تنقید ایک اعلیٰ نوعیت کا ذہنی عمل ہے۔ تنقید انسان کی فکری ترقی کے لیے ضروری ہے۔ جہاں تنقید نہیں وہاں فکری ترقی بھی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تنقید کو امر ممنوع (taboo) قرار دینے کا نتیجہ سادہ طور پر صرف یہ نہیں ہوگا کہ لوگوں کے درمیان بے تنقید حالت قائم ہو جائے۔ بلکہ عملاً جو کچھ ہوگا وہ یہ کہ لوگ ذہنی جمود میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اُن کے درمیان سوچنے کا عمل (thinking process) رُک جائے گا۔ اور جس انسانی سماج میں سوچنے کا عمل رک جائے وہ دھیرے دھیرے ایک ایسا سماج بن جائے گا جہاں لوگ جسمانی اعتبار سے بظاہر انسان دکھائی دیں گے، مگر اپنی عقل وفہم کے لحاظ سے وہ حیوانی سطح پر ہوں گے۔ وہ اعلیٰ فکری ترقی سے محروم ہو کر رہ جائیں گے۔ جب کہ اس دنیا میں اعلیٰ فکری ترقی ہی کسی انسان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

بچوں کے لیے زیادہ بہتر تحفہ

جو لوگ زیادہ بڑی ترقی حاصل نہ کر سکیں وہ اکثر اس احساس میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ کیا کریں کہ اُن کے بچے اُس معاشی کمی میں مبتلا نہ ہوں جس میں وہ خود مبتلا ہوئے۔ اس احساس کے تحت وہ ایک ایسی چھلانگ لگا دیتے ہیں جو نتیجہ کے اعتبار سے اُن کے لیے برعکس ثابت ہوتی ہے۔

یہ بچوں کے بارے میں سوچنے کا صحیح طریقہ نہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے صحیح فارمولا یہ ہے کہ — اپنے لیے قناعت، اور بچوں کے لیے ترقی۔ یعنی حالات کے اعتبار سے آپ جس معاشی کامیابی تک پہنچے ہیں اس پر قناعت کرتے ہوئے زندگی گزاریے۔ اس معاملہ کو بچوں کے اوپر چھوڑ دیجیے کہ وہ وسیع دنیا میں ہاتھ پاؤں ماریں اور اپنی محنت کے ذریعہ زیادہ ترقی حاصل کریں۔ آپ بچوں کے لیے صرف ابتدائی زینہ بننے پر قانع ہو جائیے۔ اگلے زینوں پر چڑھنا اور اوپر کی منزل تک پہنچنا یہ بچوں کے لیے چھوڑ دیجیے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی باپ کی طرف سے اپنے بچوں کے لیے سب سے بہتر عطیہ یہ نہیں ہے کہ وہ اُن کے لیے دولت کا ڈھیر چھوڑے۔ اس کے برعکس، زیادہ بہتر عطیہ یہ ہے کہ وہ بچوں کو ایسے حالات دے سکے جو انہیں عمل پر ابھارنے والے ہوں۔ بچوں کے اندر محنت کا جذبہ ہونا سب سے بڑا سرمایہ ہے، نہ کہ باپ کی طرف سے ملی ہوئی دولت۔ محنت کے بغیر جو دولت ملے وہ کوئی اچھی چیز نہیں۔ اس قسم کی دولت وہ چیز ہے جس کو ایزی منی (easy money) کہا جاتا ہے۔ اور یہ ایک ثابت شدہ واقعہ ہے کہ ایزی منی اس کے پانے والے کو فائدہ کم پہنچاتی ہے اور نقصان زیادہ۔

اتحاد کا راز

کسی گروہ کے درمیان اتحاد کیسے قائم ہو۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اختلاف کو مٹاؤ تا کہ باہمی اتحاد قائم ہو۔ اس نظریہ کے پیچھے جو سوچ ہے وہ یہ ہے کہ جب اختلاف نہ ہوگا تو

اپنے آپ اتحاد قائم ہو جائے گا۔ اس سوچ کے مطابق، اختلاف ہے تو اتحاد نہیں، اور جہاں اتحاد ہے وہاں اختلاف نہیں۔ یہ سوچ سراسر بے بنیاد ہے۔ اس طرح کے فارمولے کے ذریعہ دنیا میں کبھی اتحاد قائم ہونے والا نہیں۔ اختلاف ایک فطری چیز ہے۔ وہ ہر انسان کی فطرت کا ایک لازمی حصہ ہے۔ ایسی حالت میں اختلاف کو مٹانا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ اس مقصد کے لیے صحیح اور قابل عمل فارمولا یہ ہے کہ اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا نام اتحاد ہے، نہ کہ اختلاف کے بغیر متحد ہونے کا۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں ایسا ہونا ممکن ہی نہیں کہ لوگوں کے اختلافات کو اس طرح بلڈوز کر دیا جائے کہ ان کا وجود ہی باقی نہ رہے۔

موجودہ دنیا میں اصلاح کا حقیقی فارمولا صرف وہ ہے جو انسانی فطرت کے مطابق ہو۔ جو فارمولا فطرت سے مطابقت نہ رکھتا ہو وہ قابل عمل بھی نہیں۔ اور جو چیز قابل عمل نہیں وہ مفید بھی نہیں۔

عسر کے ساتھ یسر

موجودہ دنیا کا نظام امید کے اصول پر قائم ہے۔ یہاں ہر رات کے بعد صبح آتی ہے۔ یہاں ہر عسر کے ساتھ ہمیشہ یسر موجود رہتا ہے۔ یہاں ہر مسئلہ کے ساتھ مواقع کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہر پرابلم کے ساتھ سلوشن کا موجود ہونا اس دنیا کا ایک اٹل اصول ہے جس میں کبھی فرق نہیں آتا۔

اگر کبھی ایسا ہو کہ مسئلہ حل ہوتا ہوا نظر نہ آئے تو سمجھنا چاہیے کہ ہم جو فارمولا استعمال کر رہے ہیں وہ صورت حال کے مطابق نہیں۔ ایسی حالت میں نئے فارمولے کو استعمال کرنا چاہیے۔ یہی سنت رسول ہے۔ جہاں جنگ کا فارمولا کارآمد نہ ہو رہا ہو وہاں امن کا فارمولا استعمال کیجیے۔ جہاں براہ راست مقابلہ موثر نہ ہو رہا ہو وہاں بالواسطہ مقابلے کا طریقہ اختیار کیجیے، وغیرہ۔

کامیاب ازدواجی زندگی

شوہر اور بیوی کے درمیان بہتر تعلق کی تعلیم دیتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (4:19)۔ یعنی، انکے ساتھ اچھی طرح گزر بسر کرو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں تمہارے لیے بہت بڑی بھلائی رکھ دی ہو۔

یہ بات اپنی حقیقت کے اعتبار سے شوہر اور بیوی دونوں ہی کے لیے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن معاشرت یا بہتر ازدواجی زندگی کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ شوہر کو بالکل اپنی پسند کی بیوی مل جائے یا بیوی کو بالکل اپنی پسند کے مطابق شوہر مل جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ قانون فطرت کے مطابق، ایسا ہونا ممکن نہیں۔ کامیاب ازدواجی زندگی کا راز پسند کے خلاف زوج (spouse) کے ساتھ موافقت (adjustment) کرنا ہے، ناپسندیدگی میں پسند کا پہلو تلاش کر لینا ہے۔ مشہور سنگر محمد رفیع کا ایک گانا اتنا مقبول ہوا کہ وہ ہر ماں باپ کے دل کی دھڑکن بن گیا۔ خود رفیع صاحب نے جب اس کو گایا تو وہ شدت تاثر سے رو پڑے۔ اس گانے میں باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے کچھ اشعار کہتا ہے، جس میں سے ایک شعر یہ ہے۔

بابل کی دعائیں لیتی جا   جا تجھ کو سکھی سنسار ملے
میکے کی کبھی نہ یاد آئے   سسرال میں اتنا پیار ملے

یہ بات فطرت کے قانون کے خلاف ہے۔ موجودہ دنیا میں کسی لڑکے یا لڑکی کو اس طرح سکھ اور پیار نہیں مل سکتا۔ ایسی حالت میں مذکورہ قسم کے سکھ اور پیار کو زوجین کے لیے کامیاب زندگی کا معیار بتانا زوجین کے ساتھ ناانصافی ہے۔ کیوں کہ اس کے نتیجے میں دونوں کے اندر غیر واقعی ذہن بنتا ہے، اور غیر واقعی ذہن کے ساتھ اس دنیا میں کامیاب زندگی کی تعمیر ممکن نہیں۔

عقیدۂ خدا اور سائنس

سائنس اپنی حقیقت کے اعتبار سے عین اسی علم فطرت کا ظہور ہے، جس کی خبر پیشگی طور پر قرآن میں ان الفاظ میں دی گئی ہے — سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ یعنی، ہم لوگوں کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں اور انفس میں۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہوجائے گا کہ یہ حق ہے۔

سائنس کی جدید تحقیقات کی روشنی میں کائنات کی جو نئی تصویر بنی ہے، وہ عین وہی ہے، جو قرآن میں پیشگی طور پر بتا دی گئی تھی۔ اس اعتبار سے جدید سائنسی دریافتیں گویا کتابِ الٰہی کے اشارات کی تفصیل ہیں، اور اسی کے ساتھ اس کی دلیل بھی۔ یہاں مختصر طور پر ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

جدید دریافت کے مطابق، کائنات کی ابتدا تقریباً 13.8 بلین سال پہلے ہوئی۔ اس کے بعد مختلف تدریجی انقلابات سے گزرتے ہوئے وہ اپنی موجودہ حالت تک پہنچی۔ اس پورے سفر کی روداد اس موضوع کی کتابوں میں پڑھ کر معلوم کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کو محسوس طور پر کسی سائنسی پلینیٹیریم (Planetarium) میں دیکھا جاسکتا ہے۔ میں نے یہ پورا منظر واشنگٹن کے نیشنل پلینیٹیریم میں دیکھا ہے۔

سائنسی مطالعہ بتاتا ہے کہ 13.8 بلین سال پہلے خلا میں ایک سپر ایٹم ظاہر ہوا۔ یہ ان تمام ذرات (particles) کا مجموعہ تھا، جو موجودہ کائنات میں پائے جاتے ہیں۔ گویا موجودہ پوری کائنات ایک بہت بڑے فٹ بال جیسے گولے کی صورت میں شدت کے ساتھ باہمی طور پر چمٹی ہوئی تھی۔ اس گولے کے تمام ذرات بے حد طاقت ورکشش کے ساتھ ایک دوسرے سے داخلی طور پر جڑے ہوئے تھے۔ معلوم طبیعیاتی قانون کے مطابق، یہ ناممکن تھا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہوکر بیرونی سمت میں سفر کریں۔

اس وقت اس سُپر ایٹم کے اندر نہایت طاقتور دھماکہ ہوا۔ اس دھماکہ کے فوراً بعد سپر ایٹم کے ذرات بکھر کر تیزی سے بیرونی سمت میں سفر کرنے لگے۔ اس کے بعد یہ ذرات وسیع خلا میں مختلف مجموعوں کی صورت میں اکٹھا ہو گئے۔ انھیں مجموعوں سے خلا میں پائی جانے والی وہ دنیائیں بنیں، جن کو ستارہ، سیارہ، کہکشاں، شمسی نظام، زمین اور چاند جیسے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔

سُپر ایٹم کا یہ دھماکہ بیک وقت دو چیزیں ثابت کرتا ہے۔ ایک یہ کہ یہاں کائنات سے الگ ایک طاقتور ہستی پہلے سے موجود تھی، جس نے اپنی ارادی مداخلت کے ذریعے یہ غیر معمولی واقعہ کیا کہ سپر ایٹم کے ذرات داخلی رخ پر سفر کے بجائے بیرونی رُخ پر سفر کرنے لگے۔

اس واقعے کا دوسرا عظیم پہلو یہ ہے کہ دھماکہ (explosion) ہمیشہ تخریبی نتائج کا سبب بنتا ہے۔ پٹاخہ سے لے کر بم تک ہر دھماکہ بلا استثنا یہی خاصیت رکھتا ہے۔ مگر سُپر ایٹم کا دھماکہ استثنائی طور پر غیر تخریبی تھا۔ اس نے مکمل طور پر صرف صحت مند اور تعمیری نتائج پیدا کیے۔ یہ استثنائی واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کائنات کا خالق لامحدود قدرت کا مالک ہے۔ وہ یہ استثنائی اختیار رکھتا ہے کہ واقعے کے ساتھ نتائج پر مکمل کنٹرول کر سکے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ ہماری کائنات ایک پھیلتی ہوئی کائنات (expanding universe) ہے۔ وہ غبارہ کی مانند مسلسل طور پر بیرونی سمت میں پھیل رہی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کا ایک متعین آغاز ہے۔ اگر کائنات ابدی ہوتی تو وہ اپنی اس پھیلتی ہوئی نوعیت کی بنا پر اب تک ختم ہو چکی ہوتی۔ یہ ثابت ہونا کہ کائنات کا ایک آغاز ہے، یہ بھی ثابت کر دیتا ہے کہ اس کا کوئی آغاز کرنے والا ہے۔ ایک غیر موجودہ چیز کا آغاز اسی وقت ممکن ہے، جب کہ اس سے پہلے کوئی موجود ہو، جو اپنے ارادے سے اُس کا آغاز کر سکے۔

کائنات میں ایسے بے شمار شواہد ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ کائنات کا منصوبہ ساز اور اس کا ناظم صرف ایک ہے۔ اگر ایک سے زیادہ ناظم ہوتے تو یقینی طور پر کائنات میں فساد برپا ہو جاتا۔

مثال کے طور پر زمین اور سورج کا فاصلہ تقریباً 9 کرور 30 لاکھ میل ہے۔ یہ فاصلہ مسلسل طور پر اپنی حالت پر برقرار رہتا ہے۔ اگر اس فاصلہ میں تبدیلی آجائے تو اس کے مہلک نتائج پیدا ہوں گے۔ مثلاً اگر یہ فاصلہ بڑھ کر 20 کرور میل دور ہو جائے تو زمین پر اتنی ٹھنڈک پیدا ہو کہ پانی، حیاتیات، حیوانات اور انسان سب منجمد ہو جائیں۔ اسی طرح یہ فاصلہ اگر کم ہو کر 5 کرور میل ہو جائے تو زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کہ تمام چیزیں بشمول انسان جل کر ختم ہو جائیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سورج اور زمین دونوں کا خدا ایک ہے۔ اگر دونوں کے خدا الگ الگ ہوتے تو دونوں الگ الگ اپنی مرضی چلاتے اور پھر یقینی طور پر یہ فاصلہ گھٹتا یا بڑھتا رہتا اور اس بے قاعدگی کی بنا پر زمین پر انسانی تہذیب کا وجود ناممکن ہو جاتا۔

نامعلوم حد تک وسیع کائنات میں ہمارا زمینی سیارہ ایک نادر استثنا ہے۔ یہاں پانی اور ہوا اور نباتات جیسی ان گنت چیزیں پائی جاتی ہیں جو انسانی زندگی کے لیے لازمی طور پر ضروری ہیں۔ جب کہ وسیع خلا میں معلوم طور پر کوئی بھی ایسی دنیا موجود نہیں جہاں بقائے حیات کا یہ سامان پایا جاتا ہو۔ یہ استثنا بتاتا ہے کہ یہ دنیا محض بے شعور مادہ کے ذریعہ نہیں بنی۔ بلکہ وہ ایک باشعور ہستی کا تخلیقی کرشمہ ہے۔ اگر وہ محض مادی قوانین کے بے شعور تعامل کا نتیجہ ہوتی تو کائنات میں بہت سی ایسی زمینیں ہوتیں، نہ کہ صرف ایک ایسی زمین۔

ہماری دنیا کی ہر چیز انتہائی حد تک بامعنی ہے۔ چیزوں کی معنویت یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ دنیا ایک باشعور تخلیق کا نتیجہ ہے۔ کوئی دوسرا نظریہ اس حکمت اور معنویت کی توجیہہ نہیں کرسکتا۔

مثلاً زمین کے حجم (size) کو لیجیے۔ زمین کا موجودہ حجم تقریباً 25 ہزار میل کی گولائی میں ہے۔ یہ حجم بے حد بامعنی ہے۔ چنانچہ یہ حجم اگر 50 ہزار میل ہوتا تو زمین کی کشش اتنی زیادہ بڑھ جاتی کہ وہ انسانی جسم کی بڑھوتری کو روک دیتی۔ اس کے بعد زمین پر صرف بالشتیے قسم کے انسان (dwarf) دکھائی دیتے۔ اس کے برعکس، اگر زمین کا حجم گھٹ کر 12

ہزار میل ہوتا تو اس کی قوتِ کشش اتنی کم ہوجاتی کہ وہ انسانی بڑھوتری کو روک نہ سکتی۔ انسان کا قد تاڑ (palm) کی طرح لمبا ہوجاتا۔ اس کے سوا اور بے شمار قسم کے غیر موافق حالات پیدا ہوتے جو انسان کی تمام تمدنی ترقیوں کو ناممکن بنا دیتے۔

مذکورہ پہلوؤں پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ سائنسی اعتبار سے، یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ اس دنیا کا ایک خالق ہے، اور وہ یقینی طور پر صرف ایک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں ہمارے لیے جو انتخاب ہے، وہ با خدا کائنات (universe with God) اور بے خدا کائنات (universe without God) میں نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے لیے حقیقی انتخاب با خدا کائنات (universe with God) اور غیر موجود کائنات (no universe at all) میں ہے۔ یعنی اگر ہم خدا کے وجود کا انکار کریں تو ہم کو کائنات کے وجود کا بھی انکار کرنا پڑے گا۔ چوں کہ ہم کائنات کے وجود کا انکار نہیں کر سکتے اس لیے ہم خدا کے وجود کا بھی انکار نہیں کر سکتے۔ اس معاملے میں ہمارے لیے دوسرا ممکن انتخاب موجود نہیں۔

مذہب اور سائنس

انسانیات (Anthropology) کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مذہب کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے، جتنا کہ انسان کی تاریخ پرانی ہے۔ جب سے انسان زمین پر موجود ہے اسی وقت سے مذہب بھی یہاں موجود رہا ہے۔ ابھی تک کوئی ایسا انسانی معاشرہ دریافت نہیں ہوا ہے جس کے اندر مذہب نہ پایا جاتا ہو۔ حتیٰ کہ موجودہ زمانہ جس کو کچھ پُر جوش لوگ لامذہبیت کا زمانہ سمجھتے ہیں وہ بھی یقینی طور پر مذہب سے خالی نہیں ہے۔ آج بھی مذہب اتنا ہی زندہ ہے جتنا کہ وہ اس سے پہلے زندہ تھا۔

موجودہ زمانے میں روایتی مذہبی طبقہ کے علاوہ اہلِ علم کا جو نیا طبقہ پیدا ہوا، جس کو عام طور پر ماڈرن طبقہ کہا جاتا ہے، وہ وسیع تر تقسیم میں دو گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو اپنے دعویٰ کے مطابق خدا اور مذہب کا منکر ہے۔ اس قسم کے افراد کو عام طور پر ملحد (Atheist) کہا جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو اگرچہ مذہب کے روایتی فارم سے اپنے آپ کو وابستہ نہیں کرتا، تاہم وہ خود اپنی تشریح کے مطابق، اپنے آپ کو خدا اور مذہب کا ماننے والا بتاتا ہے۔ پہلے گروہ کی ایک ممتاز شخصیت کے اعتبار سے انگریز فلسفی برٹرینڈ رَسل (1872-1970) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ دوسرے گروہ کی ایک مثال مشہور جرمن سائنس داں البرٹ آئن اسٹائن (1879-1955) ہے۔

پہلا گروہ: برٹرینڈ رسل

برٹرینڈ رَسل ایک غیر معمولی ذہین آدمی تھا۔ اس کو لمبی عمر ملی۔ وہ اپنی نوجوانی کے زمانے سے لے کر بڑھاپے کی عمر تک مسلسل مطالعہ کرتا رہا۔ اس کی سوانح عمری اور اس کی

دوسری کتابوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ابتدائی عمر میں اس کو سب سے زیادہ جس چیز سے دلچسپی ہوئی وہ یقینیت (certainty) تھی۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے علم کا طالب تھا مگر وہ اس علم کو حاصل کرنا چاہتا تھا جس کے واقعہ ہونے پر وہ یقین کر سکے۔ اپنے اس مزاج کی بنا پر اس کو سب سے پہلے میتھ میٹکس سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں میرا احساس یہ تھا کہ میں نے اپنے لیے مذہب کا ایک قابلِ اعتماد بدل پالیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کو نظر آیا کہ میتھ میٹکس میں منطقی تیقن (logical certainty) موجود ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ میں نے میتھ میٹکس کی صورت میں اس علم کو پالیا ہے جس کو میرا ذہن تلاش کر رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں مذہب برٹرینڈ رَسل کو توہمات (superstition) کا مجموعہ نظر آیا۔ چنانچہ اس نے مروّجہ مذہب کو رد کر کے میتھ میٹکس کو اپنے دین کے طور پر اختیار کر لیا۔

مگر بعد کو جب برٹرینڈ رَسل نے زیادہ تفصیلی مطالعہ کیا تو اس کا یہ یقین متزلزل ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ میرا یہ یقین حقائق کے سرسری مطالعہ پر مبنی تھا، حقائق کا زیادہ گہرا مطالعہ اس کی تصدیق نہیں کرتا۔

برٹرینڈ رَسل کے بعد کے مطالعہ کے نتائج کو اس کی کتاب انسانی علم (Human Knowledge) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں برٹرینڈ رَسل نے قطعی دلائل کے ذریعہ دکھایا ہے کہ موجودہ دنیا میں انسانی مطالعہ کبھی بھی کسی کو یقینی علم تک نہیں پہنچا سکتا۔ ایک طرف انسانی محدودیتیں اور دوسری طرف کائنات کی پراسرار نوعیت (Mysterious nature) فیصلہ کن طور پر یقینی علم کی راہ میں حائل ہیں۔ انسان کا مطالعہ آخر کار جہاں اس کو پہنچاتا ہے وہ تیقن (certainty) نہیں ہے بلکہ صرف قرینہ یا احتمال (probability) ہے۔ اس کو دوسرے الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ہم حقیقت (reality) کو براہِ

راست دریافت نہیں کر سکتے۔ ہم صرف یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ احتمالی طور پر یہاں فلاں حقیقت موجود ہے، اگرچہ وہ براہِ راست ہمارے تجربہ میں نہیں آتی۔

برٹرینڈ رَسل کو اس کے تمام عمر کے مطالعہ نے جہاں پہنچایا وہ ایک ایسا مقام تھا جہاں وہ حقیقی مذہب کے عین قریب پہنچ چکا تھا۔ اگر اسلامی الفاظ استعمال کیے جائیں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ لاالٰہ کی منزل تک پہنچ چکا تھا، مگر اس کے بعد وہ الا اللہ کی منزل طے نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ اس کی موت ہوگئی۔

برٹرینڈ رَسل کی یہ بات کہ انسانی علم ہم کو صرف قرینہ یا احتمال (probability) تک پہنچاتا ہے، یہ اس کی ذاتی بات نہیں۔ یہی موجودہ زمانے کے تمام علمائے سائنس کا موقف ہے۔ یہ اصول اب جدید علم کا ایک ایسا مسلمہ بن چکا ہے جس سے کسی بھی صاحبِ علم کو اختلاف نہیں۔

علمی تحقیقات کا اس حقیقت تک پہنچنا کہ اس دنیا میں، خالص علمی طور پر، ہم صرف قرینہ یا احتمال تک پہنچ سکتے ہیں، بے حد اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم موجودہ علم کے مطابق، سائنس اور مذہب کے درمیان وہ فرق ختم ہو چکا ہے جو قدیم زمانے میں فرض کرلیا گیا تھا۔ اب عقل (reason) کا موقف بھی عین وہی ہے جو اس سے پہلے عقیدہ (belief) کا موقف تھا۔

مذہب کا موقف قدیم ترین زمانے سے یہ تھا کہ سچائی یا حقیقت اپنی نوعیت میں ایک غیبی چیز ہے، وہ نہ دکھائی دینے والی دنیا (unseen world) سے تعلق رکھتی ہے۔ ہمارے لیے صرف یہ ممکن ہے کہ ہم ظاہری قرائن کی بنیاد پر یہ مستنبط کریں کہ فلاں حقیقت یہاں موجود ہے۔ اگرچہ وہ دکھائی نہیں دیتی۔ اب سائنس کا موقف بھی عین یہی ہو چکا ہے۔ جدید سائنس کا کہنا ہے کہ ہم چیزوں کی اصل کو نہیں دیکھ سکتے، ہم چیزوں کے صرف ظاہری

اثر (effect) کو دیکھ سکتے ہیں۔ اور ظاہری اثر سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ فلاں چیز یہاں موجود ہے، اگرچہ بظاہر وہ ہمارے مشاہدہ اور تجربہ میں نہیں آتی۔

برٹرینڈ رَسل اور اس کے جیسے تمام لوگوں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ قرینہ (probability) کی بنیاد پر مذہب کی واقعیت کو بھی اسی طرح مانیں جس طرح وہ سائنسی نظریات کی واقعیت کو مانتے ہیں۔ ان میں سے ایک کو ماننے کے بعد دوسرے کو نہ ماننے کی کوئی وجہ ان کے پاس موجود نہیں۔ ان حضرات کو جاننا چاہیے کہ اب ان کے لیے جن دو حالتوں کے درمیان انتخاب ہے وہ انکار مذہب اور اقرارِ مذہب نہیں ہے بلکہ وہ اقرارِ مذہب اور انکار خویش کے درمیان ہے۔ یہ حضرات اگر مذہب کے انکار پر مصر ہوں تو انہیں خود اپنا انکار بھی کرنا پڑے گا۔ چونکہ ان کے لیے اپنا انکار ممکن نہیں اس لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ مذہب کا انکار کریں۔

دوسرا گروہ: آئن اسٹائن

دوسرے گروہ کی ایک علامتی شخصیت آئن اسٹائن ہے۔ آئنسٹین نے اپنی پوری زندگی سائنس کے مطالعہ میں گزاری۔ مگر اسی کے ساتھ وہ اپنے اندر روحانی جذبات بھی پاتا تھا۔ چنانچہ اس نے مذہب کا بھی مطالعہ کیا۔ مذہب کے بارے میں بھی اس کا عقیدہ اتنا ہی گہرا تھا جتنا کہ سائنس کے بارے میں اس کا عقیدہ گہرا تھا۔ تاہم اس کے نظریہ کے مطابق دونوں دو بالکل الگ الگ موضوعات تھے۔ اس کے الفاظ میں، سائنس کا موضوع یہ جاننا ہے کہ کیا ہے (what is)۔ اس کے مقابلے میں مذہب کا موضوع یہ جاننا ہے کہ کیا ہونا چاہیے (what should be)۔ گویا مذہب کا تعلق داخلی یقین سے ہے اور سائنس کا تعلق خارجی معلومات سے۔

تاہم یہ تقسیم کافی نہیں۔ اس تقسیم کے باوجود وہ اصل سوال بدستور باقی رہتا ہے جس کی

بنا پر سائنس اور مذہب کا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ خالص علمی اعتبار سے مذکورہ تقسیم کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ اصل سوال مذہب اور سائنس دونوں کو ملانے کا ہے۔ مذہب علمِ الٰہی کا نام ہے اور سائنس علمِ انسانی کا نام۔ یہ ضروری ہے کہ ہم ایسا فارمولا دریافت کریں جو علمِ الٰہی اور علمِ انسانی دونوں کو ایک کر سکے۔ اس کے بغیر انسان کے اندر وہ مطلوب شخصیت پیدا نہیں ہو سکتی جس کو علمِ نفسیات میں متکامل شخصیت (integrated personality) کہا جاتا ہے۔

برٹرینڈ رسل اور اس کے جیسے لوگوں کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے علم کی نوعیت کو نہیں سمجھا۔ اس لیے وہ صحیح رائے تک نہ پہنچ سکے۔ اس طرح آئن اسٹائن اور اس کے جیسے لوگوں کی یہ غلطی ہے کہ انہوں نے مذہب کی نوعیت کو نہیں سمجھا اور اپنی عدم واقفیت کی بنا پر مذہب کا ایک خود ساختہ تصور قائم کر لیا جو حقیقت سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ اس گروہ کے لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ تمام مروجہ مذاہب کو مذہب کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ دنیا میں ایک درجن بڑے مذاہب (major religions) ہیں۔ اس کے علاوہ سیکڑوں کی تعداد میں دوسرے مذاہب موجود ہیں۔ یہ لوگ ان سب کو ملا کر مذہب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر مذہب کی تعلیمات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں وہ یکسانیت نہیں پائی جاتی جو سائنس میں موجود ہے۔ اس لیے وہ یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ مذہب ایک شخصی معاملہ ہے۔ جو شخص جس مذہبی عقیدہ کو مانے وہی اس کا مذہب ہے، کسی دوسرے شخص کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔

اس قسم کا مذہبی تصور خود مذہب کی نفی ہے۔ مذہب کیا ہے۔ مذہب اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ایسی مکمل آئیڈیالوجی کا نام ہے جو انسان اور کائنات کی اطمینان بخش توجیہ کر سکے۔ جس میں انسان اپنے تمام داخلی اور خارجی سوالات کا جواب پالے۔ مذہب آدمی کے لیے یقین کا سرچشمہ ہے۔ جو مذہب کلی صداقت نہ ہو وہ انسان کو یقین کا سرمایہ نہیں دے سکتا۔ اور جو مذہب انسان کو یقین نہ دے وہ مذہب بلاشبہ مذہب بھی نہیں۔

اصل یہ ہے کہ جدید اہلِ علم مذہب کے مطالعہ میں چند غلطیاں کرتے ہیں۔اس بنا پر وہ مذہب کو سمجھنے میں بھی ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

1۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہر موجود مذہب کو مستند مذہب سمجھ لینا اور اس بنیاد پر مذہب کا مطالعہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے توہماتی عقائد جیوتش (Astrology) اور فلکیات (Astronomy) سب کو یکجا کر کے اور پھر ان کے مجموعی مطالعہ سے ایک علم الافلاک بنانے کی کوشش کی جائے۔اس معاملے میں سائنٹفک مطالعہ کا طریقہ یہ ہے کہ غیر ثابت شدہ خیالات اور اوہام کو الگ کر دیا جائے اور صرف ثابت شدہ معلومات کی بنیاد پر علم افلاک وضع کیا جائے۔

ٹھیک یہی طریقہ ہمیں مذہب کے مطالعہ میں بھی اختیار کرنا چاہیے۔بطورِ واقعہ یہ درست ہے کہ آج کی دنیا میں مذہب کے نام سے بہت سے اعتقادی نظام پائے جاتے ہیں۔لیکن جب ان کا گہرا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خالص علمی اعتبار سے تمام مذاہب کی حیثیت یکساں نہیں۔

ان میں ایسے مذاہب ہیں جن کی کوئی معلوم تاریخ نہیں۔ظاہر ہے کہ ایسے تمام مذاہب ابتدائی طور پر ہی رد ہو جاتے ہیں۔کیوں کہ جن مذاہب کو تاریخی اعتباریت (historical credibility) حاصل نہ ہو وہ سرے سے اس قابل ہی نہیں کہ ان پر غور کیا جائے۔اسی طرح کتنے مذاہب ہیں جن کے بارے میں یہ ثابت نہیں کہ ان کا موجودہ متن (text) کسی تبدیلی کے بغیر آج موجود ہے، اور جس مذہب کا خود متن مشتبہ ہو اس کی صداقت پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے۔

اس قسم کے مختلف علمی معیار (scientific criteria) ہیں جن کا استعمال مذاہب کے مطالعہ میں ضروری ہے۔مگر جب ان معیاروں کو موجودہ مذاہب پر منطبق کیا جاتا ہے تو یہ مذاہب اس علمی جانچ پر پورے نہیں اترتے۔

مذاہب کے پورے مجموعے میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو استثنائی طور پر اس خصوصیت کا حامل ہے کہ وہ ہر قسم کی علمی جانچ پر پورا اترتا ہے۔ ایسی حالت میں تمام موجود مذاہب کو یکساں درجہ دے کر ان کا خلاصہ نکالنا ایک غیر علمی فعل ہے۔ اس معاملے میں واحد درست موقف یہ ہے کہ ضروری علمی جانچ پر پورا اترنے والے مذہب کو لے لیا جائے اور جو مذاہب اس قسم کی علمی جانچ پر پورے نہ اتریں انہیں تاریخ کے کتب خانہ میں محفوظ کر دیا جائے۔

2۔ اسلام کو مذہب کا مستند ایڈیشن (authentic version) ماننے کے بعد وہ تمام غلط فہمیاں اپنے آپ ختم ہو جاتی ہیں جو مختلف مذاہب کو یکساں درجہ دینے کی صورت میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کائنات کے بارے میں توہماتی عقائد کو الگ کر کے خالص سائنسی حقیقتوں کی بنیاد پر کائنات کا مطالعہ کرنا۔

3۔ اسلام کو مذہب کا واحد نمائندہ ماننے کی صورت میں ہم کو ایک ایسا مستند ماخذ مل جاتا ہے، جس کے ذریعہ مذہبی عقائد کا ایک غیر اختلافی نظام بنایا جا سکے۔ مثلاً مذاہب میں خدا کے بارے میں مختلف اور متضاد نظریات پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح پیغمبری اور رسالت کے بارے میں سخت اختلافی نظریات موجود ہیں۔ موت کے بعد زندگی کی نوعیت کیا ہوگی، اس کے بارے میں بھی متضاد نظریات پائے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ دوسرے تمام مذہبی عقائد وافکار کا ہے۔ مگر اسلام کو مذہب کے مستند ماخذ کی صورت میں لینے کے بعد ہمیں ایسے غیر اختلافی نظریات وعقائد مل جاتے ہیں جن پر ہم یقین کر سکیں۔ یقین وہ سب سے بڑی چیز ہے جس کے لیے انسان کو مذہب کی ضرورت ہے۔ اور تمام مذاہب کو یکساں ماننے کی صورت میں، اسی اصل مطلوب چیز سے انسان محروم ہو جاتا ہے۔

4۔ ایک اہم سوال یہ ہے کہ مذہب اور دنیوی معاملات کے درمیان تعلق کی

نوعیت کیا ہو۔ یہ ایک بے حد اہم سوال ہے جس کا جواب مختلف مذاہب میں مختلف انداز سے دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر عیسائیت میں دنیوی معاملات کو مذہب کا لازمی جزء قرار دیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ لوگوں کو ناقابلِ عمل نظر آنے لگا۔ یہاں تک کہ چرچ اور ریاست میں وہ جنگ شروع ہوئی جس کے نتیجے میں دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ اس معاملے میں اسلام نے نہایت اہم ہدایات دی ہیں۔ ان میں سے کچھ کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

الف۔ اسلام میں ایک اہم تعلیم وہ ہے جو حدیث میں ان الفاظ میں دی گئی ہے: أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2363)۔ یعنی تم لوگ اپنی دنیا کے معاملے میں زیادہ جانتے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خالص دنیوی نوعیت کے معاملات، مثلاً زراعت، باغبانی، شہری منصوبہ بندی، اقتصادی تنظیم جیسی چیزوں کو علمی ریسرچ کی بنیاد پر طے کیا جائے گا۔ یعنی علمی ریسرچ میں جو چیز انسانیت کے لیے مفید ثابت ہوگی وہی مذہب کے نزدیک بھی درست مانی جائے گی۔

ب۔ اسی طرح مذہب اور سیاسی حکمرانی کے معاملے میں قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ سیاسی اقتدار اللہ کا ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے سیاسی اقتدار دیتا ہے (3:26)۔ مزید یہ کہ سیاسی اقتدار امتحان کا ایک پرچہ ہے جس طرح مال اور اولاد وغیرہ امتحان کے پرچے ہیں (10:14)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی حکمرانی کے حصول کے لیے لڑائی کرنا اسلام کی تعلیم نہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ فطری تاریخی حالات جس کے حق میں سیاسی اقتدار کا فیصلہ کریں، دوسرے لوگ اس کو قبول کر کے اس کو اپنے امتحان کا موقع دیں، نہ کہ لڑائی کر کے اس سے سیاسی امتحان کے خداداد پرچے کو چھیننے کی کوشش کریں۔

کیمسٹری کی سائنس اگر مفروضات پر بنے ہوئے قدیم فن کیمیا کو اپنے ساتھ شامل رکھتی تو کیمسٹری کی سائنس کبھی ترقی نہیں کرتی۔ اسی طرح ایسٹرانمی، اگر اوہام پر قائم قدیم علمِ نجوم پر بھروسہ کرتی تو جدید ایسٹرانمی کا ارتقاء ممکن نہ ہوتا۔ یہی معاملہ تمام علوم کا ہے۔ موجودہ زمانے میں مختلف علوم کی ترقی صرف اس وقت ممکن ہوئی ہے جب کہ ہر علم سے غیر سائنسی مفروضات کو الگ کر دیا گیا۔ اور خالص سائنسی حقائق کی بنیاد پر تمام علوم کو مدون کیا گیا۔ یہی اصول ہمیں مذہب کے بارے میں اختیار کرنا ہے۔

مذہب میں سائنسی مطالعہ کے ذریعہ ہمیں یہ دریافت کرنا ہے کہ کون سا مذہب غیر متغیر حالت میں آج بھی موجود ہے۔ اور کون سے وہ مذاہب ہیں جو تغیرات کی بنا پر اپنا علمی استناد (authenticity) کھو چکے ہیں۔ اس اعتبار سے جب خالص علمی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حیثیت اب صرف اسلام کو حاصل ہے۔ اسلام کا متن، اس کی تاریخ، اس کی تعلیمات حتی کہ اس کے متن کی اصل زبان بھی آج تک پوری طرح اپنی ابتدائی حالت میں موجود ہے۔ اسلام ہمیں قابلِ یقین مذہبی نظام بھی دیتا ہے اور اسی کے ساتھ دوسری وہ تمام چیزیں بھی جن کی ہمیں اپنی مذہبی زندگی کی تشکیل کے لیے ضرورت ہے۔

قناعت کامیابی کا راز

ایک عوامی مثل ہے۔ یہ مثل زندگی کی ایک اہم حقیقت کو بتاتی ہے اس مثل کے الفاظ یہ ہیں: ”آدھی چھوڑ کے پوری دھاوے، پوری ملے نہ آدھی پاوے“۔

اصل یہ ہے کہ انسان بیشتر حالات میں اپنی خواہشات اور اپنی امنگوں (ambitions) کے تحت سوچتا ہے اس بنا پر اکثر وہ ایسے اقدامات کر بیٹھتا ہے جو حقیقی حالات کے اعتبار سے اس کے لیے قابل حصول نہیں ہوتے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا عمل انجام کے اعتبار سے مکمل ناکامی پر ختم ہوتا ہے، وہ ناممکن کو حاصل کرنے کی کوشش میں ممکن کو بھی کھو بیٹھتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اکثر مشہور مسلم رہنماؤں کی کہانی یہی ہے۔ انہوں نے حقائق کی رعایت کئے بغیر محض اپنی خواہشوں اور امنگوں کے تحت بڑی بڑی چھلانگ لگادی، اس کا نتیجہ ملت کے حصہ میں تباہی کے سوا کچھ اور نہ آیا۔ اس معاملہ کو سمجھنے کیلیے چند مثالیں لیجیے۔

1۔ سردار شوکت حیات خاں مشہور پاکستانی لیڈر رہیں۔ وہ متحدہ پنجاب کے سابق وزیر اعظم مرحوم سکندر حیات خان کے صاحبزادے ہیں۔ سردار شوکت حیات خان نے اپنے کیریر کا آغاز دوسری جنگ عظیم میں فوجی افسر کی حیثیت سے کیا۔ 1943 میں مسلم لیگ کی سیاست میں سرگرم طور پر شامل ہوگئے۔ پاکستان کے قیام کے بعد وہ پنجاب کے وزیر بنے اور وہاں کے دوسرے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔

سردار شوکت حیات خان نے اپنی زندگی کے حالات پر ایک کتاب انگریزی زبان میں لکھی ہے، جس کا نام ہے — دی نیشن دیٹ لوسٹ اٹس سول:

The Nation that Lost its Soul (1995, pp. 376)

اس کتاب کا اردو ترجمہ ”گم گشتہ قوم“ دسمبر 1995ء میں پاکستان سے چھپا ہے۔ کتاب کا یہ اردو ایڈیشن 461 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے ناشر جنگ پبلشرز لاہور

ہیں۔ اس کتاب کے ایک باب کا عنوان ”لیاقت علی خاں“ ہے۔ جو پاکستان کے پہلے وزیر اعظم تھے۔ اس باب میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے ایک کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

”نواب زادہ لیاقت علی خان“ کو حقائق اور ملک کے جغرافیہ سے بھرپور واقفیت نہ تھی۔ جس کے وہ پہلے وزیر اعظم بن چکے تھے .... بعد میں کشمیر پر حملہ کے دوران جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن لاہور آیا۔ ایک ڈنر جس میں لیاقت، گورنر مودی اور پنجاب کے چار وزیر موجود تھے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سردار پٹیل کا پیغام پہنچایا۔ پٹیل جو ہندستان کی ایک طاقتور شخصیت تھا۔ اس کا پیغام تھا کہ اس اصول کی پابندی کی جائے جو کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین ریاستوں کے مستقبل کے بارے میں طے پایا تھا وہ یہ کہ ریاست اپنے باشندوں کی اکثریت اور سرحدوں کے ساتھ ملاپ کی بنا پر پاکستان یا ہندستان کے ساتھ الحاق کریں گی۔ پٹیل نے کہا کہ پاکستان کشمیر کو لے لے اور حیدرآباد دکن کا مطالبہ چھوڑ دے جہاں پر ہندو آبادی کی اکثریت تھی اور جس کا پاکستان کے ساتھ زمینی یا سمندری ذریعہ سے کوئی اتصال بھی نہ تھا۔ یہ پیغام دینے کے بعد ماؤنٹ بیٹن گورنمنٹ ہاؤس میں آرام کرنے چلا گیا۔

میں کشمیر آپریشن کا مکمل نگراں تھا۔ میں نے لیاقت علی خاں کے پاس جا کر انہیں تجویز دی کہ ہندستان کی فوج جو کشمیر میں داخل ہو چکی ہے ہم قبائلیوں کی مدد سے اس کو باہر نکالنے اور کشمیر کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ یہاں تک کہ ہماری اس وقت کی فوج بھی اس کامیابی کے حصول میں شاید مددگار ثابت نہ ہو سکے گی۔ لہٰذا ہمیں سردار پٹیل کی پیشکش کو ٹھکرانا نہیں چاہئے۔ نواب زادہ نے میری جانب مڑ کر کہا ”سردار صاحب، کیا میں پاگل ہو گیا ہوں کہ میں کشمیر کے پہاڑوں اور ٹیلوں کے بدلے ریاست حیدرآباد دکن کو چھوڑ دوں جو پنجاب سے بھی بڑی ریاست ہے“۔

پرائم منسٹر کے اس ردعمل کو دیکھ کر میں تو سن ہو گیا کہ ہمارا وزیر اعظم ملکی جغرافیہ سے اتنا بے خبر تھا۔ اس کی ذہانت کا یہ معیار کہ وہ حیدرآباد دکن کو کشمیر پر ترجیح دے رہا ہے۔ یہ تو احمقوں کی جنت میں رہنے والی بات تھی۔ حیدرآباد کا حصول ایک سراب تھا جب کہ کشمیر اپنے آپ مل رہا تھا۔ کشمیر کی پاکستان کے ساتھ اہمیت سے وہ قطعی واقف نہیں تھے۔ چنانچہ احتجاج کے طور پر میں نے کشمیر آپریشن کی نگرانی سے استعفیٰ دے دیا (صفحہ 232-231)۔

سردار شوکت حیات خاں کا یہ بیان اس دردناک حقیقت کی ایک واضح مثال ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈر کس طرح مذکورہ مثل کا شکار ہوئے ہیں۔ وہ ممکن اور ناممکن کے فرق کو سمجھ نہ سکے۔ وہ نہ ملنے والی چیز کو پانے کے لیے دوڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملنے والی چیز بھی ان سے کھوئی گئی اور نہ ملنے والی چیز تو سرے سے ملنے والی ہی نہ تھی۔

2۔ اب اس نوعیت کی ایک اور مثال لیجئے۔ اس مثال کا تعلق 1947 سے پہلے کے دور سے ہے جب کہ برصغیر ہند میں انگریزوں کا سیاسی اقتدار قائم تھا۔ اس مثال کو اردو ہفت روزہ الجمعیۃ سے لے کر یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس امروہہ (5-3 مئی 1930ء) سے کچھ روز قبل وائسرائے ہند کی کونسل کے ایک ذمہ دار ممبر سر میاں فضل حسین مرحوم نے سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی کو بلا کر یہ پیش کش کی کہ آپ جمعیۃ علماء کے اجلاس امروہہ میں کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کی تجویز پاس نہ ہونے دیں۔ میں حکومت برطانیہ سے مقبرہ صفدر جنگ اور اس سے ملحقہ جائداد بمعہ اراضی جمعیۃ علماء ہند کے علمی کاموں کے لیے دلوا دوں گا۔ حضرت مولانا نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں فرمایا "میاں صاحب! تمام علما کرام وزعما عظام مجھے بے وقوف نہیں بنائیں گے کہ ہم پورے ملک کو حاصل کرنے کی تجویز پاس کر رہے ہیں۔ اور تم صرف ایک مقبرہ وہ بھی مسلمانوں کی وقف ملکیت پر فیصلہ کر رہے ہو۔ مولانا کے جواب سے میاں صاحب موصوف کو بہت مایوسی ہوئی۔ یہ واقعہ حضرت مولانا نے راقم

الحروف سے خود بیان فرمایا تھا۔ (جمعیۃ علماء ہند کا پچاس سالہ عہد از شیخ عبدالحق پراچہ دہلوی ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء صوبہ دہلی، مطبوعہ الجمعیۃ ویکلی، دہلی، 2 جنوری 1970ء، صفحہ 8)۔

1930ء کے اس واقعہ کو اب 75 سال کے بعد کے حالات کی روشنی میں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس معاملہ میں وہی صورت پیش آئی جس کا ذکر مذکورہ عوامی مثل میں کیا گیا ہے، پچھتر سال پہلے کے رہنماؤں کو ایک نہایت قیمتی موقع کسی کوشش کے بغیر مل رہا تھا مگر وہ اس قیمتی موقع سے صرف اس لیے فائدہ نہ اٹھا سکے کہ ان کے ذہن میں ایک بہت بڑی چیز بسی ہوئی تھی۔ اگرچہ حقیقت واقعہ کے اعتبار سے وہ چیز انہیں ملنے والی ہی نہ تھی۔

انگریزوں کی مذکورہ پیش کش اپنے امکانات کے اعتبار سے وہی اہمیت رکھتی تھی جس کی پیش کش مغل بادشاہ جہانگیر کے زمانہ میں انگریز تاجر کو کی گئی۔ اور اس نے اس کو فوراً قبول کرلیا۔ پچھتر سال پہلے کے مسلم رہنما اگر انگریز کی مذکورہ پیش کش کو قبول کر لیتے اور اس کو علمی اور تعلیمی اور دعوتی مرکز بنا دیتے تو اس کے نتائج اتنے دوررس نکلتے کہ شاید تاریخ کا نقشہ ہی کچھ دوسرا ہوتا۔

اوپر جو دو مثالیں پیش کی گئیں یہی موجودہ زمانے کے تقریباً تمام مشہور رہنماؤں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے کام کے عظیم مواقع موجود تھے۔ مگر تقریباً ہر ایک کا یہ حال ہوا کہ وہ ناممکن کو نشانہ بنا کر اس کی طرف دوڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ممکن کو بھی حاصل نہ کرسکا اور ناممکن تو حاصل ہونے والا ہی نہ تھا۔

مثلاً سید جمال الدین افغانی کو ترکی کی عثمانی سلطنت نے کام کے عظیم مواقع دیے مگر جمال الدین افغانی خود عثمانی سلطنت کی جڑ اکھاڑنے پر تل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں ترکی کو چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا، مصر کے سید قطب کو وزارت تعلیم بہت چھوٹی چیز لگی۔ وہ خود ناصر کے سیاسی اقتدار کو ختم کرنے کے درپے ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں چھوٹی چیز اور بڑی چیز دونوں ہی سے محروم ہونا پڑا۔

یہی معاملہ پاکستان میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ پیش آیا۔ وہاں کے سابق حکمراں صدر محمد ایوب خاں نے سید ابوالاعلیٰ مودودی اوران کے ساتھیوں کو یہ پیش کش کی کہ وہ حکومت کے مکمل تعاون سے پاکستان میں بڑے پیمانہ پر ایک نیشنل یونیورسٹی بنائیں اور اس کے ذریعہ وہ نئی نسل کی تعلیم وتربیت پر کام کریں۔مگر دوبارہ یہی ہوا کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کو مذکورہ پیش کش چھوٹی معلوم ہوئی۔انہوں نے پوری حکومت پر قبضہ کرنے کی دھنوادھار تحریک شروع کردی مگر تمام کوششوں کے بعد آخر کار جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ وہ چھوٹی چیزاور بڑی چیز دونوں ہی سے محروم ہوکر رہ گئے۔

یہی موجودہ زمانہ کے اکثر مسلم رہنماؤں کی کہانی ہے۔وہ اپنی خیالی امنگوں میں اتنا گم ہوئے کہ انہیں حقائق وواقعات کی خبر نہ ہوسکی۔وہ بڑے بڑے نشانوں کواپنا مقصد بنا کران کی طرف دوڑتے رہے، حالانکہ یہ نشانے سرے سے ان کے لیے قابل حصول ہی نہ تھے۔ اور جو چیزان کے لیے حالات کے اعتبار سے قابل حصول تھی وہ انہیں دکھائی ہی نہ دی۔اسی غیر حقیقت پسندانہ مزاج کا نتیجہ ہے کہ ان مشہور رہنماؤں نے صرف ناکام اقدامات کی مثالیں قائم کیں، وہ کامیاب اورنتیجہ اقدام کی مثال قائم نہ کرسکے۔زیادہ کو پانے کی کوشش میں وہ تھوڑے سے بھی محروم رہے۔

مسلم رہنماؤں کی اس بھیانک غلطی کا سبب یہ تھا کہ تھوڑے کو وہ صرف تھوڑا سمجھے، وہ تھوڑے کوزیادہ کے روپ میں نہ دیکھ سکے۔وہ زندگی کے اس راز سے ناآشنا رہے کہ عمل کا آغاز ہمیشہ تھوڑے سے کیا جاتا ہے۔زیادہ سے عمل کا آغاز ممکن نہیں، جوآدمی اس راز کو سمجھ لے وہ تھوڑے سے شروع کرکے آخر کار زیادہ تک پہنچ جائے گا۔اور جوشخص اس راز کو نہ سمجھے وہ اپنے غیر حقیقت پسندانہ مزاج کی بنا پر اپنے عمل کا نقطہ آغاز ہی نہ پائے گا۔اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ جوآدمی اپنے سفر کا نقطہ آغاز پالے وہ کبھی نہ کبھی اپنی منزل تک پہنچ جائے گا، اور جوآدمی اپنے سفر کا نقطہ آغاز نہ پائے وہ کبھی اپنی منزل تک نہ پہنچے گا خواہ وہ

ساری عمر بے فائدہ دوڑ ودھوپ کرتا رہے۔ زندگی کے اسی اصول کا نام دینی اصطلاح میں قناعت ہے اور قناعت بلاشبہ ہر قسم کی انفرادی اور اجتماعی کامیابیوں کا واحد راز ہے۔

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں معمولی لفظی فرق کے ساتھ آئی ہے۔ مثلاً مسلم کتاب الزکاۃ۔ الترمذی، کتاب الزھد، مسند احمد بن حنبل، وغیرہ۔ مسند احمد کے الفاظ یہ ہیں: أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ، وَرُزِقَ كَفَافًا، وقَنَّعَهُ اللّٰهُ بِمَا آتَاهُ (مسند احمد، حدیث نمبر 6572)۔ یعنی، اس شخص نے فلاح پائی جس نے اسلام قبول کیا اور اس کو بقدرِ ضرورت رزق ملا اور اللہ نے اس کو اس پر قناعت دی جو اس کو اس نے دیا۔

اس حدیث کو عام طور پر انفرادی معنوں میں اور معاشی مفہوم میں لیا جاتا ہے۔ مگر وہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے، اس حدیث کا پورا مطلب یہ ہے کہ افراد یا قوموں کو موجودہ زمانے میں جو کچھ ملے یا حالات کے اعتبار سے جو ان کے لیے ممکن ہو اس کو وہ خوش دلی کے ساتھ قبول کرلیں، اس پر راضی رہتے ہوئے وہ اپنا عمل شروع کردیں۔ اس کا پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ ملے ہوئے کو پانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ جو کچھ ان کو حال میں حاصل نہیں، وہ ان کی منصوبہ بند جدوجہد کے نتیجہ میں مستقبل میں حاصل ہوجائے۔

امن عالم

نظریۂ امن

Ideology of peace

امن کیا ہے

اہل علم امن کی تعریف عدم جنگ (absence of war) کے الفاظ میں کرتے ہیں۔ فنّی اعتبار سے یہ تعریف بالکل درست ہے۔ کسی سماج میں جب تشدد اور جنگ نہ ہو تو اس کے بعد وہاں جو صورت حال پیدا ہوگی اسی کا نام امن ہے۔ جب بھی انسانوں کے درمیان جنگ اور تشدد کی حالت نہ ہو تو اُس کے بعد امن کی حالت اپنے آپ قائم ہو جائے گی۔

تاہم کسی سماج میں امن کی حالت قائم ہونا سادہ طور پر صرف یہ نہیں ہے کہ وہاں جنگ اور تشدد کا خاتمہ ہو گیا۔ جنگ اور تشدد کا ختم ہونا اس معاملہ کا سلبی پہلو ہے۔ اس کا ایجابی پہلو یہ ہے کہ جب بھی کسی سماج کے اندر حقیقی معنوں میں امن کی حالت قائم ہو جائے تو اُس کے بعد لازماً ایسا ہوگا کہ لوگوں کے اندر مثبت سرگرمیاں جاری ہو جائیں گی۔ ہر آدمی یکسوئی کے ساتھ اپنی زندگی کی تعمیر میں لگ جائے گا۔

کسی سماج کے اندر امن کا قائم ہونا ایسا ہی ہے جیسے دریا کے سامنے سے بند کو ہٹا دیں۔ انسانی زندگی، بہتے دریا کی مانند، خود اپنے زور پر رواں دواں ہونا چاہتی ہے۔ وہ صرف اُس وقت رُکتی ہے جب کہ اُس کے سامنے کوئی مصنوعی رکاوٹ کھڑی کر دی جائے۔ رُکاوٹ نہ ہو تو خود فطرت کے زور پر زندگی کی تمام سرگرمیاں جاری ہو جائیں گی۔

جنگ و تشدد کی حیثیت زندگی کے عمل میں رُکاوٹ کی مانند ہے۔ اور امن اپنے نتیجہ کے اعتبار سے یہ ہے کہ زندگی کی دوڑ کے تمام راستے آخری حد تک کھول دیے گئے ہوں۔

امن کا مطالعہ عام طور پر جنگ کے حوالہ سے کیا جاتا ہے۔ مگر یہ امن کا بہت محدود مفہوم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امن کا تعلق پوری انسانی زندگی سے ہے۔ امن اپنے آپ میں

ایک مکمل آئیڈیالوجی ہے۔ امن شاہ کلید (master key) ہے جس سے ہر کامیابی کا دروازہ کھلتا ہے۔ امن ہر کام کی کامیابی کے لیے موافق ماحول بناتا ہے۔ امن کے ساتھ ہر کام کیا جا سکتا ہے۔ اور امن کے بغیر کسی بھی کام کو کرنا ممکن نہیں۔ یہ بات چھوٹے معاملات کے لیے بھی درست ہے اور بڑے معاملات کے لیے بھی۔

کائنات کا مذہب امن ہے

قرآن کی سورہ نمبر 36 میں ارشاد ہوا ہے: لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (36:40)۔ یعنی، نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو پکڑ لے اور نہ رات دن سے پہلے آ سکتی ہے۔ اور سب ایک ایک مدار (orbit) میں تیر رہے ہیں۔

قرآن کی اس آیت میں ایک فلکیاتی واقعہ کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ دنیا کا نظام کس اصول پر قائم ہے۔ وہ امن کا اصول ہے۔ کائنات کے اندر ان گنت چیزیں ہیں۔ یہاں کی ہر چیز مسلسل حرکت میں ہے۔ مگر کسی چیز کا دوسری چیز سے ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ کائنات کا ہر جزء اپنے اپنے دائرہ میں اپنا عمل انجام دیتا ہے۔ یہاں کا کوئی جزء کسی دوسرے جزء کے دائرہ کار میں داخل نہیں ہوتا۔ اس لیے ایک کا دوسرے سے ٹکراؤ بھی نہیں ہوتا۔

یہی امن کلچر انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسان کو بھی یہی کرنا ہے کہ وہ کائنات کے اس ہمہ گیر اُصول کو اپنی زندگی میں اپنا لے، وہ بھی ٹکراؤ کے راستہ کو چھوڑ کر امن کے راستہ پر چلنے لگے۔

کائنات کا کلچر امن کلچر ہے۔ اسی امن کا یہ نتیجہ ہے کہ کائنات اربوں سال سے چل رہی ہے مگر اس میں کوئی ٹکراؤ پیش نہیں آیا جو اُس کے نظام میں خلل ڈال دے۔ کائنات میں اگر تشدد کلچر کا رواج ہوتا تو اب تک کائنات آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو چکی ہوتی۔ وہ ہمارے لیے قابل رہائش دنیا کے طور پر موجود ہی نہ ہوتی۔

جس خالق نے کائنات کو پیدا کیا ہے اُسی نے انسان کو بھی پیدا کیا ہے۔ خالق کو مطلوب ہے کہ اُس نے وسیع تر کائنات میں جو امن کلچر قائم کر رکھا ہے، انسان بھی اُسی امن کلچر کو اپنائے ، صرف اس فرق کے ساتھ کہ یہ امن کلچر بقیہ کائنات میں فطرت کے زور پر قائم ہے۔ انسان ایک آزاد مخلوق ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اس امن کلچر کو خود اپنے ارادہ اور اپنے فیصلہ کے تحت اپنی زندگی میں اختیار کرے۔

قرآن ایک کتاب امن

قرآن بلا شبہ امن کی ایک کتاب ہے، وہ جنگ اور تشدد کی کتاب نہیں۔ قرآن کے تمام بیانات براہ راست یا بالواسطہ طور پر امن سے متعلق ہیں۔ قرآن کا پہلا جملہ 'بسم اللہ الرحمن الرحیم' ہے جس کے معنٰی یہ ہیں کہ اللہ نہایت مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جس خدا نے یہ کتاب بھیجی ہے اُس کی سب سے بڑی صفت رحمت ہے۔ اور یہ کتاب خدا کی اسی صفتِ رحمت کا اظہار ہے۔

قرآن کی تمام آیتیں براہ راست یا بالواسطہ طور پر امن کی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ قرآن کی کُل آیتوں کی تعداد 6236 ہے۔ ان میں بمشکل چالیس آیتیں ایسی ہیں جو قتال (جنگ) کے حکم کو بیان کرتی ہیں۔ یعنی ایک فیصد سے بھی کم آیتیں۔ زیادہ متعین طور پر کُل آیتوں کے مقابلہ میں صرف اعشاریہ چھ فیصد (0.6 percent)۔

جو لوگ قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہیں وہ قرآن کے حقیقی مومن صرف اُس وقت قرار پائیں گے جب کہ وہ قرآن کی اس تعلیم کی پیروی کرتے ہوئے مکمل طور پر امن پسند بن جائیں۔ وہ کسی حال میں بھی تشدد کا رویہ اختیار نہ کریں۔

یہاں یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ لوگوں کو چاہیے کہ وہ اسلام اور مسلمان کے درمیان فرق کریں۔ وہ مسلمانوں کے عمل کو اسلام کی تعلیم کا نام نہ دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں

کے عمل کو اسلام کے معیار سے جانچا جائے گا، نہ یہ کہ اسلام کو مسلمانوں کے عمل سے سمجھا جانے لگے۔ اسلام ایک نظریہ ہے۔ مسلمان اُسی وقت مسلمان ہیں جب کہ وہ اسلامی تعلیمات کی پیروی کریں۔ جولوگ اسلامی تعلیمات کو چھوڑ دیں اُن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، خواہ بطور خود وہ اپنے آپ کو اسلام کا چیمپین بتاتے ہوں۔

امن اور تشدد کا فرق

امن ایک منصوبہ بند عمل ہے، اور تشدد صرف بھڑک کر جارحانہ کارروائی کرنے کا نام ہے۔ امن پسند آدمی پہلے سوچتا ہے اور اس کے بعد وہ عمل کرتا ہے۔ تشدد پسند آدمی پہلے کر ڈالتا ہے، اس کے بعد وہ سوچتا ہے۔ پُرامن عمل میں پہلے بھی اُمید ہے اور آخر میں بھی اُمید۔ اور پُرتشدد عمل میں پہلے فرضی اُمید ہے اور آخر میں صرف مایوسی۔

امن پسند آدمی سچائی پر کھڑا ہوتا ہے اور پُرتشدد آدمی جھوٹ پر۔ امن کا راستہ شروع سے آخر تک ایک کُھلا ہوا راستہ ہے، اور تشدد کا راستہ رکاوٹوں سے بھرا ہوا راستہ۔ امن میں تعمیر ہی تعمیر ہے اور تشدد میں تخریب ہی تخریب۔ امن پسند انسان دوسروں کی محبت میں جیتا ہے اور تشدد پسند انسان دوسروں کی نفرت میں۔ امن پسندی کا خاتمہ کامیابی پر ہوتا ہے اور تشدد پسندی کا خاتمہ شرمندگی پر۔

امن پسندی میں کوئی کام بگڑتا نہیں اور ہر کام بن جاتا ہے۔ تشدد پسندی میں کوئی کام بنتا نہیں اور ہر کام بگڑ جاتا ہے۔ امن کا طریقہ انسانیت کا طریقہ ہے اور تشدد کا طریقہ حیوانیت کا طریقہ۔ امن کا عمل قانون کے دائرہ میں ہوتا ہے اور تشدد کا عمل لاقانونیت کے دائرہ میں۔

امن پسند آدمی مسائل کو نظر انداز کرکے مواقع کو استعمال کرتا ہے اور تشدد پسند آدمی مواقع کو غیر استعمال شدہ حالت میں چھوڑ کر مسائل کے خلاف بے فائدہ لڑائی لڑتا رہتا ہے۔ امن کا عمل پیار ومحبت کا باغ اُگاتا ہے اور تشدد کا عمل نفرت اور دشمنی کا جنگل اُگاتا ہے۔ امن کلچر فرشتوں کا کلچر ہے اور تشدد کلچر شیطانوں کا کلچر۔

امن میں خدا کے حقوق بھی ادا ہوتے ہیں اور انسان کے حقوق بھی۔ اور تشدد میں انسان کے حقوق کی بھی خلاف ورزی ہوتی ہے اور خدا کے حقوق کی بھی خلاف ورزی۔ امن اگر جنت ہے تو تشدد اُس کے مقابلہ میں دوزخ۔

امن اور جنگ دونوں یکساں نہیں۔ امن کسی انسان کے لیے ایک سچا انتخاب (choice) ہے۔ اور جنگ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی سچے انتخاب کو نہ پاسکا، وہ انتخاب کے ٹیسٹ میں ناکام ہوگیا۔

دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اگرچہ عملاً موجود ہیں مگر وہ امتحان کے لیے ہیں، وہ مطلوب چیز کے طور پر نہیں۔ مثلاً شراب دنیا میں موجود ہے۔ مگر شراب اس لیے نہیں ہے کہ کوئی آدمی اُس کو استعمال کرے۔ بلکہ شراب اس لیے ہے کہ آدمی اُس سے بچ کر یہ ثابت کرے کہ وہ اچھے اور بُرے کی تمیز رکھتا تھا، وہ ایک محتاط انسان تھا۔ یہی معاملہ جنگ کا بھی ہے۔ جنگ کا طریقہ اگرچہ بظاہر قابل استعمال ہے مگر کسی انسان کے لیے اعلیٰ روش یہی ہے کہ وہ جنگ کے طریقہ کو استعمال نہ کرے۔

قدیم زمانہ میں جو حالات تھے اُن میں دفاع کے لیے جنگ کی اجازت دی گئی تھی۔ مگر یہ اجازت قانونِ ضرورت (law of necessity) کے تحت تھی۔ اب نئے حالات میں یہ ضرورت باقی نہیں رہی، اس لیے اب جنگ کی بھی ضرورت نہیں۔

صلح بہتر ہے

قرآن میں فطرت کے ایک قانون کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **وَالصُّلْحُ خَيْرٌ** (4:128)۔ یعنی، صلح بہتر ہے۔ صلح کا مطلب مصالحت (reconciliation) ہے۔ صلح کا عمل ہمیشہ دو فریقوں کے درمیان ہوتا ہے۔ جب دو فریقوں کے درمیان کسی معاملہ پر نزاع ہوجائے تو ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں متشددانہ ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کرلیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ فوراً سمجھوتہ کرکے نزاعی حالت کو ختم کردیا جائے۔

تاہم بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ یہ مصالحت دونوں فریقوں کی یکساں خواہش کے مطابق ہو۔ بیشتر حالات میں یہ مصالحت یک طرفہ بنیاد پر ہوتی ہے، یعنی ایک فریق اپنی خواہش کو پیچھے رکھ کر دوسرے فریق کی خواہش پر معاملہ ختم کرنے کے لیے راضی ہوجائے۔

اس قسم کی یک طرفہ مصالحت کو بہتر کیوں کہا گیا۔ اُس کا سبب یہ ہے کہ نزاع کی حالت تعمیری عمل کو روک دیتی ہے۔ مصالحت پر راضی ہونے کا فائدہ آدمی کو یہ ملتا ہے کہ وہ اپنے وقت اور اپنی طاقت کا کوئی حصہ غیر ضروری ٹکراؤ میں ضائع کیے بغیر اپنی تعمیری جدوجہد کو جاری رکھے۔ غیر مصالحانہ طریقہ ہر حال میں نقصان کا طریقہ ہے۔ اور مصالحانہ طریقہ ہر حال میں فائدہ کا طریقہ۔

انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ کسی فرد یا گروہ نے جب بھی کوئی کامیابی حاصل کی ہے تو اُس نے یہ کامیابی مصالحانہ طریقہ اختیار کرنے کے بعد حاصل کی ہے۔ ٹکراؤ اور لڑائی کا طریقہ اختیار کرکے اس دنیا میں حقیقی کامیابی کبھی کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔ صلح کی یہ اہمیت اس لیے ہے کہ صلح میں آدمی کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ حاصل شدہ مواقع کو بھرپور طور پر اپنے حق میں استعمال کرے جب کہ ٹکراؤ کے طریقہ میں یہ ہوتا ہے کہ ساری طاقت دوسروں کی تخریب میں ضائع ہوجاتی ہے۔ تعمیر کا کوئی کام سِرے سے انجام نہیں پاتا۔ حالانکہ ترقی کا راز اپنی تعمیر واستحکام میں ہے، نہ کہ مفروضہ دشمن کو برباد کرنے میں۔

فساد فی الارض نہیں

قرآن کی سورہ نمبر 2 میں ایک کردار کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ ۙ قَالُوٓا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ (2:11)۔ یعنی، جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم زمین میں فساد نہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے لوگ ہیں۔

قرآن کی اس آیت میں جس کردار کا ذکر ہے اُس سے مراد وہ لوگ ہیں جو بظاہر ایک

اصلاحی مقصد کے لیے سرگرم ہوں، مگر اُن کا طریقہ درست نہ ہو۔ اُن کا طریقہ ایسا ہو جو عملاً فساد اور بگاڑ پیدا کرنے والا ہے۔ یہاں فساد سے مراد یہ ہے کہ اُن کے طریقہ کے نتیجے میں لوگوں میں باہمی ٹکراؤ پیدا ہو۔ لوگ ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں۔ لوگوں کے اندر اخلاقی احساس کمزور ہو جائے۔ لوگوں کے اندر منفی نفسیات پیدا ہوں۔ اِس قسم کی تمام چیزیں فساد فی الأرض کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کیوں کہ اس سے سماجی امن ختم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ لڑائی اور ٹکراؤ کی نوبت آجاتی ہے۔

قرآن کی اس تعلیم سے معلوم ہوا کہ کسی عمل کے درست ہونے کے لیے صرف یہ کافی نہیں کہ بظاہر وہ ایک اچھے مقصد کے لیے شروع کیا گیا ہو۔ اسی کے ساتھ لازمی طور پر یہ دیکھنا ہوگا کہ اصلاح کے نام پر کی جانے والی سرگرمیاں کس قسم کا نتیجہ پیدا کرتی ہیں۔ اگر وہ لوگوں کے درمیان نفرت اور تناؤ اور لڑائی جیسی چیزیں پیدا کریں تو بظاہر اصلاح کا نام لینے کے باوجود اُن کی سرگرمیاں مفسدانہ سرگرمیاں ہی کہی جائیں گی۔ ایسے لوگ انسانیت کے مجرم قرار پائیں گے، نہ کہ انسانیت کے مصلح اور خادم۔

کوئی بھی اصلاحی کام صرف اُس وقت اصلاحی کام ہے جب کہ وہ امن اور انسانیت کے دائرہ میں کیا جائے۔ اصلاح کے نام پر کیا جانے والا ہر وہ کام غلط ہے جو سماجی امن کو درہم برہم کرے۔ جس کے نتیجہ میں جان اور مال کی تباہی ظہور میں آئے۔ اصلاح کو اپنے نتیجہ کے اعتبار سے بھی اصلاح ہونا چاہیے۔ جو اصلاح اپنے نتیجہ کے اعتبار سے فساد ہو وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی فساد ہے، خواہ اُس کو کتنا ہی زیادہ خوب صورت الفاظ میں بیان کیا گیا ہو۔

سازش کا خاتمہ

قرآن کی سورہ نمبر 3 میں ارشاد ہوا ہے: اگر تم صبر کرو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تو اُن کی کوئی سازش تم کو ہرگز نقصان نہ پہنچائے گی (3:120)۔ قرآن کی اس آیت میں زندگی کی

ایک اہم حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ دنیا میں کسی فرد یا گروہ کے لیے اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اُس کے کچھ دشمن ہوں جو اُس کے خلاف سازش کررہے ہیں۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اُس فرد یا گروہ کے اندروہ صبراوروہ محتاط روش موجود نہیں جو ہر سازش کو یقینی طور پرنا کام بنا سکتی ہے۔

موجودہ دنیا میں سازش کی حیثیت اگر بارش کی ہے تو صبر وتقویٰ کی حیثیت پختہ چھت کی۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ بارش صرف اُن لوگوں کے لیے مسئلہ ہے جنہوں نے اپنے لیے پختہ چھت نہ بنائی ہو۔ جن کے پاس پختہ چھت ہو، اُن کے لیے بارش کا مسئلہ کوئی حقیقی مسئلہ نہیں۔

موجودہ دنیا کا نظام مسابقت (competition) کے اصول پر بنا ہے، اس لیے یہاں فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ایک فریق اور دوسرے فریق کے درمیان رقابت قائم ہوجاتی ہے جو بڑھ کر سازش تک پہنچ جاتی ہے۔ جب بھی کسی کے خلاف ایسی صورت حال پیدا ہوتو اُس کو دشمن کی سازش کے بجائے فطرت کے ایک قانون کا اظہار سمجھنا چاہیے۔ سازش کو دشمن کی کارروائی سمجھنا آدمی کو تشدد کی طرف لے جاتا ہے۔ اور سازش کو فطرت کے قانون کا نتیجہ سمجھنا آدمی کے اندر یہ ذہن پیدا کرتا ہے کہ وہ حسن تدبیر کے ذریعہ اپنے آپ کو اس کی زد سے بچائے، ٹھیک اُسی طرح جیسے ایک شخص بارش کے مقابلہ میں احتجاج نہیں کرتا بلکہ اس سے بچنے کے لیے گھر اور چھت کا انتظام کرتا ہے۔

شدت پسندی نہیں

قرآن کی سورہ نمبر 4 میں ایک حکم ان الفاظ میں آیا ہے: لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ (4:171)۔ یعنی، تم اپنے دین میں غلو نہ کرو۔ یہی بات حدیث میں بھی آئی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ، فَإِنَّما أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ

الْغُلُوُّ فِي الدِّينِ (ابن ماجہ، 3029)۔یعنی، تم لوگ دین میں غلو سے بچو، کیوں کہ پچھلی امتیں دین میں غلو کی وجہ سے ہلاک ہوگئیں۔

غلو کا مطلب شدت یا انتہا پسندی (extremism) ہے۔غلو ہر معاملہ میں غلط ہے۔ غلو دین کی اصل روح کے خلاف ہے۔غلو کا یہی مزاج بڑھ کر تشدد اور لڑائی تک پہنچ جاتا ہے۔ جو لوگ غلو کی نفسیات کا شکار ہوں وہ اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر اعتدال کی روش پر قانع نہیں ہوتے۔ وہ امن اور اعتدال کی روش کو معیار سے کم سمجھتے ہیں اس لیے وہ نہایت آسانی کے ساتھ تشدد کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔ وہ مقصد کے حصول کے نام پر لڑائی شروع کر دیتے ہیں۔

غلو کی ضد اعتدال ہے۔ جب لوگوں کے اندر اعتدال کی نفسیات ہو تو وہ ہمیشہ امن کے انداز میں سوچیں گے، وہ اپنی جدو جہد کو پر امن جدو جہد کے طور پر چلائیں گے۔حقیقت یہ ہے کہ اعتدال اور امن دونوں ایک دوسرے کے ساتھ نہایت گہرائی سے جڑے ہوئے ہیں۔ جہاں اعتدال ہوگا وہاں امن ہوگا۔ جہاں امن ہوگا وہاں اعتدال پایا جائے گا۔

اس کے برعکس، غلو کی نفسیات ہمیشہ آدمی کو انتہا پسندی کی طرف لے جاتی ہے، اور انتہا پسندی نہایت آسانی کے ساتھ تشدد اور ٹکراؤ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔غلو اور تشدد دونوں ایک دوسرے کے ساتھ نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دین میں غلو کو بہت زیادہ ناپسند کیا گیا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ غلو پسندی کا دوسرا نام تشدد پسندی ہے۔ اور غلو نہ کرنے کا دوسرا نام اعتدال پسندی۔

ایک انسان کا قتل ساری دنیا کا قتل

قرآن کی سورہ نمبر 5 میں ارشاد ہوا ہے: مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (5:32)۔ یعنی، جو شخص کسی کو قتل کرے، بغیر اس کے کہ اُس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد برپا کیا ہو تو گویا اُس نے سارے آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔

قتل ایک انتہائی بھیانک عمل ہے۔ کسی فرد کو قتل کرنا صرف اُس وقت جائز ہے جب کہ وہ سماجی امن کے لیے ناقابلِ علاج خطرہ بن گیا ہو۔ حقیقی وجہ جواز کے بغیر کسی ایک انسان کو قتل کرنا بھی سارے انسانوں کو قتل کرنے کے برابر ہے۔ کیوں کہ اس سے احترام جان کی روایت ٹوٹتی ہے۔ ایک انسان کو ناحق قتل کرنا بظاہر ایک آسان فعل دکھائی دینے لگتا ہے۔

شراب کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ: مَا أَسْكَرَ كَثِيرُهُ فَقَلِيلُهُ حَرَامٌ (مسند احمد، حدیث نمبر 6558)۔ یعنی، جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ کرے اس چیز کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔ یہی معاملہ قتل کا بھی ہے۔ بہت سے انسانوں کو قتل کرنا جتنا بھیانک ہے اُتنا ہی بھیانک ایک انسان کو قتل کرنا بھی ہے۔ دونوں کے درمیان فرق صرف ڈگری کا ہے، نوعیت کے اعتبار سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

قرآن کی اس آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں امن وسلامتی کی کتنی زیادہ اہمیت ہے۔ اسلام کا تقاضا ہے کہ اگر کسی سماج میں ایک شخص کو قتل کردیا جائے تو پورا کا پورا سماج اُس پر تڑپ اٹھے۔ سماج میں دوبارہ امن وسلامتی کی حالت کو قائم کرنے کے لیے اس اہتمام کے ساتھ کام کیا جائے جیسے کہ کسی نے ایک فرد کو قتل نہیں کیا ہے، بلکہ اُس نے پوری انسانیت پر حملہ کردیا ہے۔

تشدد کی آگ کو بجھانا

قرآن کی سورہ نمبر 5 میں ارشاد ہوا ہے: كُلَّمَآ اَوۡقَدُوۡا نَارًا لِّلۡحَرۡبِ اَطۡفَاَهَا اللّٰهُ (5:64)۔ یعنی، جب بھی وہ لوگ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں تو اللہ اس آگ کو بُجھا دیتا ہے۔

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق کا منصوبہ موجودہ دنیا کے بارے میں کیا ہے۔ یہ منصوبہ امن کے اصول پر مبنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی ایک فریق لڑائی کی آگ بھڑکانے پر آمادہ ہو تو دوسرے فریق کو چاہئے کہ وہ پُرامن تدبیر سے اُس کو

بجھادے تاکہ تشدد کی آگ پھیلنے نہ پائے۔ ایسا کبھی نہیں ہونا چاہئے کہ ایک فریق اگر بم مارے تو دوسرا فریق جوابی بم سے اُس کا مقابلہ کرے۔ خدا کی اس زمین پر جینے کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ ایک بم کے اوپر دوسرا بم مارا جائے۔ صحیح اور مطلوب طریقہ یہ ہے کہ بم کو ناکارہ (defuse) کردیا جائے۔

یہ خدائی اعلان بتاتا ہے کہ ایک بم کے اوپر دوسرا بم مارنا شیطان کا طریقہ ہے۔ اس کے برعکس خدا کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ بم کو غیر مؤثر بنا دیا جائے، بم کو اُس کے پہلے ہی مرحلہ میں ناکارہ کردیا جائے تاکہ امن کا ماحول بگڑنے سے بچ جائے۔

سماج میں ناخوش گوار حالات کا پیش آنا بالکل فطری ہے۔ کوئی انسانی سماج ناخوش گوار باتوں سے خالی نہیں ہوسکتا۔ ایسی حالت میں مسئلہ کا اصل حل یہ نہیں ہے کہ خود ناخوش گواری کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ اس مسئلہ کا اصل حل یہ ہے کہ ایک ناخوش گواری پر دوسری ناخوش گواری کا اضافہ نہ کیا جائے۔ ایک بم کے اوپر دوسرا بم نہ مارا جائے۔ اس طرح ناخوش گواری کو پھیلنے سے روک کر اُس کو ختم کردیا جائے۔ یہی اس مسئلہ کا حل ہے، اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی دوسرا حل ممکن نہیں۔

اصلاح کے بعد فساد

قرآن کی سورہ نمبر 7 میں ارشاد ہوا ہے: وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِي الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِهَا (7:85)۔ یعنی، زمین میں بگاڑ پیدا نہ کرو، بعد اس کے کہ اُس کی اصلاح کی جاچکی ہو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم یقین کرنے والے ہو۔

قرآن کی اس آیت میں ایک فطری حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے۔ یہ زمین جس پر انسان آباد ہے وہ اپنی تخلیق کے اعتبار سے ایک اصلاح یافتہ زمین ہے۔ یہاں کی ہر چیز اپنے مطلوب نقشہ کے مطابق، بنائی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اس

زمین پر جو کام بھی کرے، فطرت کے نقشہ کو بدلے بغیر کرے۔ اگر اُس نے فطرت کے نقشہ کو بدلا تو اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قائم شدہ اصلاحی نظام ٹوٹ جائے گا اور ہر طرف بگاڑ پھیل جائے گا۔

مثلاً ہماری دنیا میں فطرت کے نظام کے تحت بے شمار سرگرمیاں جاری ہیں — زمین کی مسلسل گردش، سورج سے اُس کا روشن ہونا، ہواؤں کا چلنا، بارش کا ہونا، دریاؤں کا بہنا، پودوں اور درختوں کا اُگنا، وغیرہ وغیرہ۔ زمین پر اس طرح کے بے شمار کام رات دن مسلسل جاری ہیں مگر یہ سارے کام انتہائی حد تک پُرامن طور پر ہو رہے ہیں۔ کہیں کوئی تشدد نہیں، کہیں ایک اور دوسرے کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں۔

یہی اصلاح کا نقشہ ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ بھی اسی نقشہ پر چلے۔ وہ تشدد اور ٹکراؤ سے مکمل طور پر پرہیز کرے۔ وہ اپنی ہر کوشش امن کے اصول پر جاری کرے۔ جو لوگ اس کے خلاف چلیں وہ یقینی طور پر زمین کے اوپر فساد برپا کریں گے، وہ کبھی زمین کے اوپر اصلاح کا نظام قائم کرنے والے نہیں۔

اعراض، نہ کہ ٹکراؤ

قرآن کی سورہ نمبر 7 میں حکم دیا گیا ہے کہ — وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰهِلِیۡنَ (7:199)۔ یعنی، تم نادان لوگوں سے اعراض کرو۔ اعراض کا مطلب احتراز (avoidence) ہے، اعراض کا اُلٹا ٹکراؤ (confrontation) ہے۔ اعراض کا طریقہ آدمی کو پُرامن دائرہ میں محدود رکھتا ہے اور ٹکراؤ کا طریقہ اُس کو فریق ثانی کے مقابلہ میں متشددانہ کارروائی کی طرف لے جاتا ہے۔

موجودہ دنیا میں کوئی انسان یا گروہ اکیلا نہیں ہے۔ اُس کے سوا دوسرے بہت سے لوگ ہیں جو اپنے اپنے مقاصد رکھتے ہیں۔ ہر ایک کا اپنا الگ ایجنڈا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں بار بار ایک دوسرے کا آمنا سامنا ہوتا ہے۔ بار بار ایک فرد اور گروہ اور دوسرے فرد اور گروہ کے درمیان کشمکش کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

ایسی حالت میں آدمی کے لیے دو راستے ہیں — اعراض یا ٹکراؤ، ان دو کے سوا کوئی تیسرا راستہ نہیں۔ اب آدمی اگر ٹکراؤ کا راستہ اختیار کرے تو دونوں فریقوں کے درمیان لڑائی ہوگی۔ ساری تاریخ کا تجربہ ہے کہ لڑائی سے صرف دل کی بھڑاس نکلتی ہے۔ حقیقی معنوں میں اُس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لیے آدمی کو چاہئے کہ وہ ٹکراؤ سے ہٹ جائے اور اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔ اعراض کا طریقہ نہ صرف مزید نقصان سے بچاتا ہے بلکہ وہ آدمی کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے ترقی کے سفر کو کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رکھ سکے۔ اعراض کا عمل بظاہر فریقِ ثانی کے مقابلہ میں ہوتا ہے مگر اعراض کا مقصد خود اپنے آپ کو بے فائدہ ٹکراؤ سے بچانا ہے۔ اعراض کا مقصد یہ ہے کہ اپنے سفر کو کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رکھا جائے۔

صبر ترقی کا راز

قرآن کی سورہ نمبر 8 میں ارشاد ہوا ہے کہ — وَاصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (8:46)۔ یعنی، تم صبر کرو کیوں کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: وَاعْلَمْ أَنَّ فِي الصَّبْرِ عَلَى مَا تَكْرَهُ خَيْرًا كَثِيرًا، وَأَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ، وَأَنَّ الْفَرَجَ مَعَ الْكَرْبِ، وَأَنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (مسند احمد، حدیث نمبر 2805)۔ یعنی، جان لو کہ بے شک ناپسندیدہ چیز پر صبر کرنے میں تمہارے لیے بہت بھلائی ہے۔ اور کامیابی صبر کے ساتھ ہے اور کشادگی مشقت کے ساتھ ہے۔ اور مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی کے سامنے مشکل حالات آئیں یا اُس کو کوئی تلخ تجربہ پیش آئے تو وہ گھبرا اُٹھتا ہے اور بعض اوقات تشدد پر اُتر آتا ہے۔ مگر اس قسم کا ردِّ عمل فطرت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فطرت کا قانون ہمیشہ اُن لوگوں کا ساتھ دیتا ہے جو حق اور انصاف پر ہوں۔ حق پرست فرد یا گروہ اگر جلد بازی نہ کرے اور صبر سے کام لے تو کامیابی اپنے آپ اُس کی طرف چلی آتی ہے۔

بیشتر حالات میں ناکامی اُن لوگوں کے حصہ میں آتی ہے جو جلد بازی سے کام لیں اور قبل از وقت پُرجوش اقدام کر بیٹھیں۔ اس کے برعکس جو لوگ صبر کا طریقہ اختیار کریں اُن کے لیے ہمیشہ ایسے اسباب پیدا ہوتے ہیں جو اُن کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دیں۔

قرآن کے مطابق، صبر کا اُلٹا عجلت ہے (46:35)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک شخص صبر کی روش اختیار کرتا ہے تو وہ فطرت کے نقشہ کی پیروی کررہا ہوتا ہے۔ اور جب وہ عجلت کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو وہ فطرت کے نقشہ سے ہٹ جاتا ہے اور جو آدمی فطرت کے نقشہ سے ہٹ جائے اُس کے لیے خدا کی اس دنیا میں کامیابی کا حصول ممکن نہیں۔

نزاع نہیں

قرآن کی سورۃ نمبر 22 میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے۔ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ (22:67)۔ یعنی، وہ تم سے امر میں ہرگز نزاع نہ کریں اور لوگوں کو تم اپنے رب کی طرف بلاؤ۔

اس آیت میں نزاع نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم انہیں نزاع کا موقع نہ دو۔ یعنی جب بھی تمہارے اور فریق ثانی کے درمیان کوئی اختلافی بات پیش آئے تو اس کو پُرامن بات چیت کے دائرہ میں محدود رکھو۔ ایسا ہرگز نہ ہونے دو کہ اختلاف اپنی ابتدائی حد سے گذر کر عملی نزاع بن جائے۔ اور متشدّدانہ مقابلہ آرائی کی نوبت آجائے۔

موجودہ دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی بات پر دو فریقوں کے درمیان تناؤ پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ تناؤ بذات خود ایک فطری چیز ہے۔ وہ ہر حال میں اور ہر مقام پر پیدا ہوگا۔ اصل قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اس تناؤ یا اس اختلاف کو حد سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ اختلاف کا امن کے دائرہ میں رہنا اس کا حد کے اندر رہنا ہے۔ اختلاف کا عملی ٹکراؤ یا تشدّد کے دائرہ میں پہنچ جانا اس کا حد سے تجاوز کرنا ہے۔ حد کے اندر کوئی بھی اختلاف برا نہیں، مگر حد کے باہر چلے جانے کے بعد ہر اختلاف بُرا بن جاتا ہے۔

قرآن کی اس آیت میں بامقصد انسان کا طریق عمل بتایا گیا ہے۔ایک انسان جو ایک سنجیدہ مقصد کے لیے اٹھا ہو،اس کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اور دوسروں کے درمیان صرف وہی چیز زیر بحث آئے جو کہ اس کا اصل مقصد ہے۔ دونوں کے درمیان کسی اور چیز کا زیر بحث آنا بامقصد انسان کے لیے زہر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ دونوں کے درمیان عدم نزاع کی یہ فضا کیسے قائم ہو۔ جواب یہ ہے کہ یہ فضا صرف اس انسان کے یک طرفہ صبر کے ذریعہ قائم ہوسکتی ہے جو ایک مثبت مقصد اپنے ساتھ لے کر اٹھتا ہے۔ عملی اعتبار سے اس کے سوا کوئی اور صورت ممکن نہیں۔ بامقصد انسان کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ یک طرفہ اعراض کے ذریعہ اپنے اور فریق ثانی کے درمیان معتدل ماحول قائم رکھے۔تا کہ اس کا سفر کسی توقف کے بغیر مسلسل جاری رہے۔

جنگ صرف دفاع کے لیے

قرآن کی سورہ نمبر22 میں ارشاد ہوا ہے کہ — أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقٰتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا (22:39)۔یعنی، ان لوگوں کو جنگ کی اجازت دی گئی جن کے خلاف جنگ کی جاری رہی ہے، کیوں کہ وہ مظلوم ہیں۔

قرآن کی یہ آیت صرف ایک آیت نہیں وہ ایک بین اقوامی قانون کا بیان ہے۔اس میں یہ بات طے کردی گئی ہے کہ جائز جنگ صرف وہ ہے جو واضح جارحیت کے مقابلہ میں دفاع کے طور پر لڑی جائے۔ جنگ کی دوسری قسم ظلم کی حیثیت رکھتی ہے اور ظالموں کے لیے خدا کی اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔اس آیت کے مطابق، دفاعی جنگ کے سوا کسی اور جنگ کے حق میں کوئی وجہ جواز نہیں۔

قرآن کے مطابق، دفاعی جنگ بھی صرف اعلان کے ساتھ لڑی جاسکتی ہے، بلااعلان نہیں۔مزید یہ کہ دفاعی جنگ بھی صرف ایک قائم شدہ حکومت لڑسکتی ہے۔غیر حکومتی افراد کو

کسی بھی عذر کی بنا پر لڑائی چھیڑنے کی اجازت نہیں۔ ان تعلیمات کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے مقرر کیے ہوئے قانون جنگ کے مطابق، مجبورانہ نوعیت کی دفاعی جنگ کے سوا ہر جنگ ناجائز ہے۔

مثلاً گوریلا وار، پراکسی وار، بلااعلان وار جارحانہ وار، یہ سب کی سب بلا شبہ اسلام میں ناجائز ہیں۔ جنگ ایک حیوانی فعل ہے، جنگ کوئی انسانی فعل نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فطرت کے ابدی قانون کے مطابق، امن ایک عموم (rule) ہے، اور جنگ صرف ایک استثناء (exception)۔ امن ہر حال میں ایک قابل اختیار چیز ہے، جب کہ جنگ صرف شدید ضرورت کے وقت اپنے بچاؤ کے لیے اختیار کی جاتی ہے، وہ بھی اس وقت جب کہ ٹکراؤ سے اعراض کی تمام پُرامن تدبیریں ناکام ہوگئی ہوں۔

صبر کا طریقہ حمایت یافتہ طریقہ

قرآن کی سورہ نمبر 8 میں کہا گیا ہے کہ— وَاصۡبِرُوۡا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ (8:46)۔ یعنی، تم لوگ صبر کی روش اختیار کرو، بیشک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو صبر کی روش اختیار کریں۔

صابرانہ طریق کار کو دوسرے لفظوں میں پُرامن طریق کار کہا جا سکتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا طریق کار متشدّدانہ طریق کار ہے۔ مذکورہ آیت فطرت کے اس قانون کو بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا میں جو لوگ پُرامن طریق کار اختیار کریں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ فطرت کے تمام اسباب ان کی حمایت میں مستعد ہو جاتے ہیں، اس کے برعکس، جو لوگ متشدّدانہ طریق کار اختیار کریں وہ قوانین فطرت کی تائید سے محروم ہو جاتے ہیں، اور جو لوگ قوانین فطرت کی تائید سے محروم ہو جائیں ان کے لیے خدا کی اس دنیا میں ناکامی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

صبر کے طریقہ کا مطلب کیا ہے۔ صبر کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی ناخوش گوار باتوں پر اپنی برداشت نہ کھوئے۔ تا کہ اس کی مثبت سوچ درہم نہ ہونے پائے۔ وہ ممکن اور ناممکن میں فرق کرے اور ممکن کو اپنا نقطۂ آغاز بنائے۔ وہ اچانک انجام کا خواہش مند نہ ہو بلکہ تدریج کا انداز اختیار کرے۔ وہ نقصان پر مایوس نہ ہو بلکہ مستقبل کے پیش نظر اپنا عمل جاری رکھے۔ جو کچھ آج ملنے والا ہے اس کو وہ آج حاصل کرے اور جو کچھ کل ملنے والا ہے اس کے لیے وہ انتظار کی پالیسی اختیار کرے۔ وہ اپنی خواہش کو فطرت کے قانون کے ماتحت رکھے، نہ کہ فطرت کے قانون کو اپنی خواہش کے ماتحت بنانے کی کوشش کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر مکمل طور پر ایک مثبت عمل ہے، صبر کوئی سلبی یا انفعالی روش نہیں۔

پُرامن نظریاتی اشاعت

قرآن کی سورہ نمبر 25 میں اہل حق کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ— وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا (25:52)۔ یعنی، تم ان کے اوپر جہاد کرو، بڑا جہاد، قرآن کے ذریعہ۔

جیسا کہ معلوم ہے، قرآن ایک کتاب ہے، ایک نظریاتی کتاب۔ وہ کوئی تلوار نہیں۔ ایسی حالت میں قرآن کے ذریعہ جہاد کا مطلب صرف یہی ہوسکتا ہے کہ قرآن کے افکار کو لوگوں تک پہنچاؤ۔ قرآن کے پیغام کو ہر امن انداز میں لوگوں کے درمیان عام کرو۔ قرآن کے نظریات کو مدلل انداز میں بیان کر کے اس کو لوگوں کے لیے قابل قبول بناؤ۔

اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں جس چیز کو جہاد کہا گیا ہے وہ پُرامن جدوجہد (peaceful struggle) ہے، اس کا تشدّد سے کوئی تعلق نہیں۔ جہاد کا لفظ عربی زبان میں مبالغہ آمیز کوشش کے لیے بولا جاتا ہے، یعنی بہت زیادہ محنت کرنا۔ کسی مقصد کے حصول کے لیے اپنی آخری کوشش صرف کردینا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پرتشدّد کوشش کے مقابلہ میں پُرامن کوشش زیادہ عظیم ہے۔ کوئی آدمی جب متشدّدانہ طریق کار اختیار کرے تو کوشش کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔ لیکن جب وہ پُرامن طریق کار اختیار کرے تو اس کا دائرہ کار لامحدود حد تک بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ متشدّدانہ طریق کار میں صرف تلوار یا گن کارآمد ہے، لیکن پُرامن طریق کار میں ہر چیز آدمی کے لیے ذریعہ اور وسیلہ بن جاتی ہے، حتیٰ کہ بند کمرہ میں استعمال ہونے والا ایک قلم بھی۔

دشمن کو دوست بنانا

قرآن کی سورہ نمبر 41 میں ارشاد ہوا ہے: بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا (41:34)۔

قرآن کی اس آیت میں فطرت کا ایک راز بتایا گیا ہے۔ وہ راز یہ ہے کہ ہر دشمن انسان کے اندر ایک دوست انسان چھپا ہوا ہے۔ اس دوست انسان کو دریافت کرو۔ اور پھر یہ معجزاتی واقعہ پیش آئے گا کہ جو آدمی بظاہر تمہارا دشمن دکھائی دیتا تھا وہ تمہارا قریبی دوست بن جائے گا۔

اصل یہ ہے کہ دشمنی کوئی فطری چیز نہیں، وہ ایک مصنوعی ردعمل ہے۔ جب بھی کسی وجہ سے کوئی شخص بظاہر تمہارا دشمن بن جائے تو تم اس کے ساتھ ردعمل کا طریقہ اختیار نہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کی کوشش کرو، خواہ یہ بہتر سلوک تم کو مفروضہ دشمن کی اشتعال انگیز کارروائیوں کے باوجود یک طرفہ بنیاد پر کرنا پڑے۔

تمہارا ایک طرفہ سلوک یہ کرے گا کہ وہ دشمن کے اندر پیدا ہونے والے منفی جذبات کو دبا دے گا۔ تمہارا ایک طرفہ سلوک دشمن کی سوئی ہوئی انسانیت کو جگا کر اس کو ایک نیا انسان بنا دے گا۔ اور یہ نیا انسان وہی ہو گا جس کو قرآن میں قریبی دوست کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر پیدا ہونے والا آدمی ایک ہی مشترک فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ ہر آدمی پہلے مسٹر نیچر ہے، اس کے بعد وہ مسٹر دشمن یا مسٹر دوست بنتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو آپ ہیں وہی آپ کا مفروضہ دشمن بھی ہے۔ اور جو آپ کا مفروضہ دشمن ہے وہی خود آپ بھی ہیں۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ بظاہر دشمنی کے باوجود وہ فریق ثانی کے اندر اپنے مشترک انسان کو تلاش کرے۔ وہ دوسروں سے بھی وہی امید رکھے جو امید وہ اپنے آپ سے کیے ہوئے ہے۔

خود اپنے عمل کا نتیجہ

قرآن کی سورہ نمبر 42 میں کہا گیا ہے کہ۔ جو مصیبت بھی تمہارے اوپر پڑتی ہے وہ صرف تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے (42:30)۔

قرآن کی اس آیت میں اس حقیقت کو بتایا گیا ہے کہ موجودہ دنیا اسباب وعلل کے اصول پر قائم ہے۔ جیسے اسباب ویسا نتیجہ۔ یہ آیت یہ تعلیم دیتی ہے کہ کسی آدمی پر جب بھی کوئی مصیبت پڑے تو اس کو چاہیے کہ اس کا سبب وہ خود اپنے اندر دریافت کرے، نہ کہ وہ اپنے سے باہر اس کا سبب تلاش کرنے لگے۔

زندگی کی یہ حقیقت جس آدمی کے ذہن میں بیٹھ جائے وہ ایسا نہیں کرسکتا کہ کسی کو اپنی مصیبت کا ذمہ دار بتا کر اس کے خلاف تشدّد کا معاملہ کرنے لگے۔ اس کے بجائے وہ صرف یہ کرے گا کہ بے لاگ طور پر اپنی زندگی کا جائزہ لے گا۔ وہ خود اپنی غلطیوں کو دریافت کرے گا تاکہ اپنی غلطیوں کی اصلاح کرکے وہ مصیبت کا شکار ہونے سے بچ جائے۔ مصیبت کا حوالہ دے کر دوسرے کے خلاف کارروائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی مریض اپنے پڑوسی کو بتا کر اس سے لڑنے لگے۔

ایک شہر جہاں کا ٹریفک دائیں چلو (keep right) کے اصول پر قائم ہو، وہاں اگر

کوئی بائیں چلو (keep left) کے اصول پر اپنی گاڑی دوڑانے لگے تو یقینی طور پر اس کی گاڑی حادثہ کا شکار ہو جائے گی۔

یہ حادثہ اگرچہ بظاہر فریق ثانی کی گاڑی کے ٹکرانے سے پیش آیا ہوگا مگر آپ یہ کہنے کا حق نہیں رکھتے کہ فریق ثانی نے ٹکر مار کر آپکو زخمی کر دیا۔ اس کے برعکس صحیح طور پر آپ کو صرف یہ کہنا چاہیے کہ میں غلط رخ پر چل رہا تھا اور فریق ثانی کی گاڑی صحیح رخ پر۔ اس لیے فریق ثانی کی گاڑی میری گاڑی سے ٹکرا گئی۔

یہی معاملہ زندگی کے دوسرے تمام پہلوؤں کا بھی ہے۔ آپ کو جب بھی اپنی زندگی میں کسی نقصان سے دو چار ہونا پڑے تو پیشگی طور پر یہ سمجھ لیجیے کہ جو کچھ ہوا وہ خود آپکی غلطی کی بنا پر ہوا۔ یہی زندگی کے معاملات میں صحیح سوچ ہے۔ اگر آپ صحیح انداز میں سوچیں تو آپ اپنی اصلاح کر کے اپنے مستقبل کو بچا لیں گے۔ اور اگر آپ اس کے برعکس، یہ کریں کہ اپنی مصیبت کا الزام دوسروں کو دیتے رہیں تو آپ اپنے مستقبل کو بھی برباد کریں گے، اور آپ کا ماضی اور حال تو پہلے ہی برباد ہو چکا ہے۔

غصہ ایک کمزوری ہے

قرآن کی سورہ نمبر 42 میں سچے انسانوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ (42:37)۔ یعنی، جب اُنہیں غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں۔

اس کا مطلب سادہ طور پر صرف غصہ کو معاف کرنا یا اُس کو بھلا دینا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب غصہ کی نفسیات سے اوپر اُٹھ کر معاملہ کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غصہ دلانے کے باوجود آدمی بے غصہ ہو کر سوچے۔ وہ غصہ سے متاثر ہوئے بغیر اس کا جواب دے۔

غصہ ایک کمزوری ہے، اور غصہ نہ کرنا ایک طاقت ہے۔ آدمی اگر غصہ نہ ہو تو وہ ہر صورت حال کو مینیج کر سکتا ہے۔ وہ ہر معاملہ کو اپنے موافق بنا سکتا ہے۔ غصہ آدمی کی عقل کو

مختل کر دیتا ہے۔ ایسا آدمی صورت معاملہ کو نہ تو صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے اور نہ صحیح طور پر اُس کا جواب دے سکتا ہے۔ کوئی آدمی غصہ ہو جائے تو فوراً وہ تشدد کی طرف جاتا ہے۔ حالاں کہ تشدد کسی مسئلہ کا حل نہیں۔ اور جو آدمی اپنے غصہ کو قابو میں رکھے، وہ مسئلہ کا پُرامن حل تلاش کرے گا۔ اور پُرامن حل ہی کسی مسئلہ کا واحد یقینی حل ہے۔

انسان کے ذہن میں غیر معمولی صلاحیتیں چھپی ہوئی ہیں۔ آدمی اگر غصہ نہ ہو تو وہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہن کی بھر پور صلاحیتوں کو اپنے حق میں استعمال کرے۔ مگر آدمی جب غصہ ہو جائے تو اُس کے ذہن کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی ذہنی صلاحیت کو بھر پور طور پر اپنے حق میں استعمال کرے۔ غصہ نہ ہونا جیت ہے، اور غصہ ہونا اُس کے مقابلہ میں ہار۔

حق پر صبر کے ساتھ جمنا

قرآن کی سورہ نمبر 103 میں بتایا گیا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو گھاٹے سے بچتے ہیں اور کامیاب زندگی حاصل کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن کے الفاظ یہ ہیں: وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (103:3)۔ یعنی، وہ لوگ جنہوں نے ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔

جب بھی کوئی آدمی سچائی کے راستہ پر قائم ہوتا ہے یا لوگوں کو سچائی کی طرف بلاتا ہے تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ اس کے مخالف بن جاتے ہیں۔ اس کو لوگوں کی طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے وقت میں حق پرست آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ صبر کا طریقہ اختیار کرے، وہ پیش آنے والی مشکلات کو اپنے اوپر سہے، وہ ان کو دوسروں کے اوپر انڈیلنے کی کوشش نہ کرے۔

صبر غیر جارحانہ طریقہ کا دوسرا نام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حق پرست آدمی کو

چاہیے کہ وہ تشدّد کے مقابلہ میں جوابی تشدّد نہ کرے۔ وہ یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو پُر امن طریق کار کا پابند بنائے۔ اسی روش کا دوسرا نام صبر ہے۔

حق اور تشدّد دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے۔ جو آدمی حق کو لینا چاہے تو اس کو تشدّد کو چھوڑنا پڑے گا۔ تشدّد، خواہ کسی بھی عذر کی بنا پر استعمال کیا جائے، وہ تشدّد ہے۔ ہر تشدّد یکساں طور پر تباہ کن ہے۔ کوئی خوب صورت عذر تشدّد کو اس کے تباہ کن اثرات سے بچا نہیں سکتا۔

حق کے حصول کے نام پر تشدّد کرنا خود حق کی نفی ہے۔ جو لوگ حق کے نام پر تشدّد کریں وہ اپنے بارے میں ثابت کرتے ہیں کہ ان کا کیس حق کا کیس نہیں۔ حق پسند آدمی کبھی تشدّد پسند نہیں ہوسکتا۔ جو آدمی تشدّد کو پسند کرے وہ یقینی طور پر حق پسند نہیں، خواہ وہ بطور خود اپنے آپ کو حق کا چیمپئن کیوں نہ سمجھتا ہو۔

امن کی قیمت

ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ کوئی چیز آدمی کو اسی وقت ملتی ہے جب کہ وہ اسکی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہو۔ ضروری قیمت ادا کیے بغیر اس دنیا میں کسی کو اپنی مطلوب چیز نہیں ملتی۔ یہی معاملہ امن کا بھی ہے۔ امن کی بھی ایک قیمت ہے۔ کوئی فرد یا گروہ اسی وقت امن کو حاصل کرسکتا ہے جب کہ وہ اسکی مطلوب قیمت ادا کرے۔ امن کی یہ قیمت نقصان کو برداشت کرنا ہے۔

یہ حقیقت قرآن کی سورہ نمبر 2 میں اس طرح بیان کی گئی ہے: ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے۔ اور ثابت قدم رہنے والوں کو خوش خبری دے دو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں۔ ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں (2:155-156)۔

قرآن کی اس آیت میں زندگی کی ایک حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ موجودہ دنیا کا نظام جس قانون کے تحت بنا ہے، اس کے مطابق، ایسا ہونا ضروری ہے کہ لوگوں کو مختلف قسم کا نقصان اٹھانا پڑے۔ کبھی انہیں دوسروں کی طرف سے چیلنج پیش آئے، کبھی انہیں اقتصادی تنگی کا شکار ہونا پڑے، کبھی انہیں ملک ومال میں کمی کا تجربہ ہو، کبھی وہ حادثہ کا شکار ہوجائیں، کبھی وہ کسی ایسے فائدے سے محروم ہوجائیں جس کو وہ اپنا حق سمجھتے تھے، وغیرہ۔

اس قسم کے ناخوش گوار تجربات عین فطرت کے قانون کے مطابق، اس دنیا میں ہر ایک کو کبھی نہ کبھی پیش آئیں گے۔ ایسی حالت میں لوگ اگر نقصان کو برداشت نہ کریں تو اسی کے نتیجے کا نام تشدّد ہے۔ اور اگر وہ اس بات کو برداشت کرلیں تو اسی کے نتیجے کا نام امن ہے۔

نقصان پیش آنے پر صبر اور برداشت کا رویہ اختیار کرنا کوئی پسپائی کی بات نہیں۔ یہ ہمت وحوصلہ کی بات ہے۔ یہ حقیقت واقعہ کو اختیارانہ طور پر تسلیم کرنا ہے۔ اس کا مطلب، ایک چیز کھونے کے بعد یہ یقین رکھنا ہے کہ بہت سی دوسری چیزیں اب بھی اس کے پاس موجود ہیں جن کے سہارے وہ ازسرنو اپنی زندگی کی تعمیر کرسکتا ہے۔

صبر وبرداشت کا فائدہ یہ ہے کہ چیز کو کھونے کے باوجود آدمی اپنے اعتدال کو نہیں کھوتا۔ وہ وقتی ناکامی کے باوجود اپنی اس صلاحیت کو باقی رکھتا ہے کہ وہ صورت حال پر معتدل انداز میں غور کرے۔ وہ معاملہ کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر ازسرنو اپنی زندگی کا منصوبہ بنائے۔ وہ کھوئے ہوئے کو بھلا کر باقی رہنے والی چیزوں کی بنیاد پر دوبارہ اپنے کام کو منظم کرے۔ وہ مایوسی کے بجائے تدبیر سے کام لے پھر سے زندگی کا سفر شروع کردے۔

موجودہ دنیا کی ایک صفت یہ ہے کہ یہاں ہر شام کے بعد دوبارہ صبح طلوع ہوتی ہے۔ دنیا امکانات ومواقع سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں ایک موقع کھونے کے بعد آدمی کو دوسرا موقع مل جاتا ہے۔ ایک زینہ سے محرومی کے بعد اس کے لیے دوسرے زینہ کے

دروازے کھل جاتے ہیں۔اس طرح اس دنیامیں بار بار یہ امکان موجود رہتا ہے کہ ایک نقشہ ٹوٹنے کے بعد آدمی دوسرے نقشہ کو استعمال کرکے اپنی زندگی کی نئی تعمیر کرلے۔

حقیت یہ ہے کہ اس دنیامیں ہر بری خبر کے ساتھ ایک اچھی خبر شامل رہتی ہے۔ ہر حادثہ آدمی کو خاموش زبان میں یہ خوش خبری دیتا ہے کہ تم مایوس اور بددل نہ ہو۔ بلکہ ہمت سے کام لے کر نئے مواقع کی تلاش کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو فطرت کا نظام پیشگی طور پر تم کو یہ خوش خبری دیتا ہے کہ تمہاری محرومی مستقل محرومی نہیں بنے گی۔ جلد ہی تم اپنے لیے ایک نئی اور زیادہ بہتر دنیا کی تعمیر کرلو گے۔ جلد ہی تمہاری شکست ایک نئی قسم کا رہنما ثابت ہوگی۔

جو لوگ نقصان کو برداشت نہ کریں وہ منفی سوچ کا شکار ہوکر اپنی زندگی کو ایک بوجھ بنا لیتے ہیں اور دوسروں کے لیے بھی بوجھ بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس، جو لوگ صبر اور ہمت سے کام لیں وہ ماضی کے کھنڈر پر اپنے لیے نیا محل تعمیر کر لیتے ہیں۔ وہ ایک شام کے بعد دوبارہ اپنے لیے ایک نئی صبح تلاش کر لیتے ہیں جس کی روشنی میں وہ اپنا سفر رکے بغیر جاری رکھ سکیں۔

صلح کی پیشکش کو قبول کرنا

پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانہ میں قریش کی جارحیت کے نتیجے میں، قریش اور مسلمانوں کے درمیان حالت جنگ قائم ہوگئی تھی۔ اس موقع پر جو احکام قرآن میں دیے گئے ان میں سے ایک حکم یہ تھا: وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَإِنْ يُرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ (8:61-62)۔ یعنی، اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی صلح کے لیے جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ تم کو دھوکا دینا چاہیں گے تو اللہ تمہارے لیے کافی ہے۔

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں امن آخری حدتک مطلوب ہے۔حتیٰ کہ اگر رسک (risk) لے کر امن قائم ہوتا ہوتو رسک لے کربھی امن قائم کیا جائے گا۔ جیسا کہ قرآن کی اس آیت میں تعلیم دی گئی ہے۔حالت جنگ کے دوران اگر فریق ثانی صلح کی پیش کش کرے تو بلا تاخیر اس کو قبول کر لینا چاہیے۔ بالفرض اگر یہ اندیشہ ہو کہ صلح کی اس پیش کش میں کوئی دھوکہ چھپا ہو ہے تب بھی اس اعتماد پر فریق ثانی سے صلح کی جائے گی کہ خدا ہمیشہ امن پسندوں کے ساتھ ہوتا ہے، نہ کہ فریب دینے والوں کے ساتھ۔

اس سے مزید یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ اس دنیا میں امن ہمیشہ وہ لوگ قائم کرتے ہیں جو اعلیٰ حوصلے کے مالک ہوں۔ موجودہ دنیا میں ہمیشہ ایک اور دوسرے فریق کے درمیان مسائل موجود رہتے ہیں۔ ہمیشہ حقوق اور بے انصافی کے مسائل پائے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں وہی لوگ امن قائم کرسکتے ہیں جو ہر دوسرے تقاضے سے بلند ہو کر سوچیں، جو کسی بھی چیز کو عذر نہ بنائیں۔صرف ایسے باحوصلہ لوگ ہی دنیا میں امن قائم کرتے ہیں۔جن لوگوں کے اندر حوصلہ نہ ہو وہ صرف لڑتے رہیں گے، وہ امن کی تاریخ نہیں بنا سکتے۔

زیادہ بڑا رزق

قرآن کی سورہ نمبر 20 میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے زندگی کی ایک حقیقت کو اس طرح بتایا گیا ہے: وَلَا تَمُدَّنَّ عَيۡنَيۡكَ اِلٰى مَا مَتَّعۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡهُمۡ زَهۡرَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۙ لِنَفۡتِنَهُمۡ فِيۡهِ ‌ؕ وَرِزۡقُ رَبِّكَ خَيۡرٌ وَّاَبۡقٰى (20:131)۔یعنی،تم ہرگز ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو جن کو ہم نے ان کے کچھ گروہوں کو ان کی آزمائش کے لیے انہیں دے رکھا ہے۔اور تمہارے رب کا رزق زیادہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔

اصل یہ ہے کہ زندگی کی دو مختلف صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی مادی دنیا کو اپنا نشانہ

بنائے۔ وہ ملک ومال میں اپنی کامیابی تلاش کرے۔ ان چیزوں میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک اور دوسرے کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ یہی مادی چیزیں ہیں جن میں چھین جھپٹ کا معاملہ چلتا رہتا ہے۔ اس لیے جو لوگ مادیات میں جیتے ہوں وہ یکسر حق تلفی یا محرومی کے احساس کا شکار رہتے ہیں۔ یہ احساس بار بار حسد اور انتقام اور تشدّد کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔

زندگی کی دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی یافت (achievement) کے احساس میں جیتا ہو۔ ایسا آدمی اپنے آپ میں مطمئن ہوگا۔ اس کے اندر پانے کا احساس اس کو اس سے بچائے گا کہ وہ دوسروں کے خلاف نفرت کرے یا ان کے خلاف تشدّد کا منصوبہ بنائے۔

یافت کا یہ احساس کن لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو قرآن کے الفاظ میں، رزق رب مل رہا ہو۔ رزق رب سے مراد یہ ہے کہ آدمی کو یہ یقین حاصل ہو کہ اس نے سچائی کو پالیا ہے۔ اس نے اس حقیقت کو دریافت کیا ہو کہ خالق نے اس کو جو وجود دیا ہے وہ سونے چاندی کے تمام ذخیروں سے زیادہ قیمتی ہے۔ وہ اس طرح بیدار ذہن کے ساتھ دنیا میں رہے کہ پوری کائنات اس کے لیے فکری اور روحانی خوراک کا دسترخوان بن جائے۔

جو آدمی دنیا سے اس طرح کا رزق رب پا رہا ہو وہ اتنا زیادہ اوپر اٹھ جاتا ہے کہ ملک ومال جیسی چیزیں اس کے لیے حقیر بن جاتی ہیں۔ اس کی یہ نفسیات اپنے آپ اس کو امن پسند بنا دیتی ہے۔ نفرت اور تشدّد جیسی چیزیں اس کو اتنا زیادہ بے معنی معلوم ہونے لگتی ہیں کہ اس کے پاس اس کا وقت نہیں رہتا کہ وہ کسی کے خلاف نفرت کرے یا کسی کے خلاف تشدّد کا منصوبہ بنائے۔ جس آدمی کو زیادہ بڑی چیز مل جائے وہ کبھی چھوٹی چیز کی طرف نہیں دوڑے گا۔

امن پسندی تحفظ کا ذریعہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ایک پیغمبر سے اس کی قوم نے کہا: وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ (11:91)۔ یہ رہط پیغمبر کے مومنین کا نہ تھا، بلکہ پیغمبر کی قوم کا تھا جو ایمان نہ لانے کے باوجود قبائلی روایت کی بنا پر پیغمبر کا تحفظ کرتے تھے۔ یہی حقیقت حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے: فَمَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا بَعْدَهُ، إِلَّا فِي مَنَعَةٍ مِنْ قَوْمِهِ (مسند احمد، حدیث نمبر 10903)۔ یعنی، ہر پیغمبر کو خدا نے اپنی قوم کی منعت (محافظ قوت) کے ساتھ بھیجا۔

قدیم زمانے میں جب کہ جدید طرز کا حکومتی نظام موجود نہ تھا لوگ قبائل کی حمایت میں رہا کرتے تھے۔ قبائلی روایات کے مطابق، ہر قبیلہ اس کا ذمہ دار ہوتا تھا کہ دوسروں کے مقابلے میں اپنے افراد کا تحفظ کرے۔ قدیم زمانے میں یہی قبائلی روایت پیغمبروں کے لیے محافظ قوت بنی رہی۔ خود پیغمبر اسلام کو بنو ہاشم کے سردار ابو طالب کی طرف سے منعہ حاصل تھا۔ ابو طالب اگر چہ آخر وقت تک ایمان نہیں لائے مگر وہ قبائلی روایات کی بنا پر، پیغمبر اسلام کے مخالفین کے مقابلے میں آپ کے لیے منعہ (محافظ قوت) بنے رہے۔ (ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 281)۔

موجودہ زمانے میں قبائلی نظام ختم ہو چکا ہے۔ مگر جدید تصور ریاست کے تحت سیکولر نظام اہل ایمان اور اہل دعوت کو یہی منعہ فراہم کر رہا ہے۔ موجودہ زمانے کی سیکولر حکومت اپنے شہری کو یہ گارنٹی دیتی ہے کہ وہ جس مذہب کو چاہے مانے اور جس مذہب کی چاہے تبلیغ کرے، اس کو کوئی روک نہیں سکتا، صرف ایک شرط کے ساتھ کہ اہل مذہب یا اہل دعوت کسی کے خلاف تشدّد نہ کریں۔

پیغمبروں کو قدیم زمانے میں جو منعہ ملا وہ قبائلی منعہ تھا، نہ کہ اسلامی منعہ۔ اس کے باوجود پیغمبروں نے اس کو قبول کیا۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کو جو منعہ ملا وہ بھی سیکولر

منعہ ہے، نہ کہ اسلامی منعہ۔ پیغمبروں کی سنت کے مطابق، مسلمانوں کو چاہیے تھا کہ وہ اس منعہ کو قبول کرتے ہوئے اس کے ماتحت پُرامن طور پر دعوت کا کام کریں۔ مگر ساری دنیا کے مسلم رہنماؤں نے سیکولرزم کو لادینیت قرار دے کر اس کے خلاف لفظی اور عملی لڑائی چھیڑ دی۔ اس طرح وہ غیر ضروری طور پر سیکولرزم کے حریف بن گئے۔ سیکولر نظام کے تحت ملا ہوا قیمتی منعہ استعمال ہونے سے رہ گیا۔

انسانوں کے لیے رحمت

قرآن کی سورہ نمبر 21 میں پیغمبر اسلام ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (21:107)۔ یعنی، ہم نے تم کو تو بس دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کا آنا ساری دنیا کے انسانوں کے لیے خدا کی رحمت کا ظہور تھا۔ آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کے وہ اصول بتائے جن کو اختیار کرکے انسان "دارالسلام" (10:25) میں آباد ہوسکتا ہے۔ یعنی امن وسلامتی کی کالونی میں۔ آپ کے ذریعہ وہ تعلیمات اتاری گئیں جو انسانی معاشرہ کو پُرامن معاشرہ بنا سکتی ہیں۔ آپ نے تاریخ میں پہلی بار امن (peace) کے تصور پر مبنی مکمل آئیڈیالوجی پیش کی۔ آپ نے زندگی کا وہ فارمولا بتایا جو آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ نفرت اور تشدّد سے بچتے ہوئے اپنے لیے ایک صحت مند زندگی کی تعمیر کرسکے۔ آپ کے ذریعہ دنیا میں وہ انقلاب آیا جس نے اس بات کو ممکن بنایا کہ ٹکراؤ اور جنگ سے بچتے ہوئے انسان ایک پُرامن سماج بنا سکے۔

پیغمبر اسلام کو اگرچہ مجبور کن حالات میں بعض ایسی لڑائیاں لڑنی پڑیں جو اتنی چھوٹی تھیں کہ ان کو جنگ کے بجائے جھڑپ کہنا زیادہ صحیح ہے۔ پیغمبر اسلام نے ایک عظیم انقلاب برپا کیا جس کو بجا طور پر غیر خونی انقلاب (bloodless revolution) کہا جاسکتا ہے۔

پیغمبر اسلام نے امن کو مکمل نظریۂ حیات کی حیثیت دی۔ آپ نے بتایا کہ تشدّد تخریب کا ذریعہ ہے اور امن تعمیر کا ذریعہ۔ آپ نے فساد کو سب سے بڑا جرم بتایا جس کا مطلب فطرت کے پُرامن نظام کو درہم برہم کرنا ہے۔ آپ نے امن کو اتنی زیادہ اہمیت دی کہ ایک انسان کے قتل کو سارے انسانوں کے قتل کے برابر قرار دیا۔

ملاقات میں السلام علیکم کہنے کو رواج دینا، اس کا مطلب یہ تھا کہ باہمی تعلقات کی بنیاد امن وسلامتی پر ہے۔ آپ نے آخرت کی کامیابی کو انسانی جدوجہد کی منزل بتایا، اس طرح آپ نے دنیوی ترقی کو نشانہ بنانے کی جڑ کاٹ دی جس کی وجہ سے ٹکراؤ اور تشدّد کی تمام صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ آپ نے انسان کے لیے بہتر زندگی کا فارمولا دیا۔ لوگوں کو نفع دینے والے بنو، اور اگر تم نفع نہیں دے سکتے تو لوگوں کے لیے بے ضرر (harmless) بن جاؤ۔ آپ نے بتایا کہ کسی کو اپنا دشمن نہ سمجھو۔ تم دشمن کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو، پھر تم کو معلوم ہوگا کہ ہر دشمن امکانی طور پر (potentially) تمہارا دوست تھا۔ ہر دشمن انسان کے اندر ایک دوست انسان چھپا ہوا تھا۔

جہاد پُرامن عمل کا نام ہے

ملّا علی قاری مشہور عالم اور فقیہ ہیں۔ ان کا پورا نام یہ ہے۔ علی بن (سلطان) محمد، نور الدین الملّا الہروی القاری۔ ملّا علی قاری ہرات میں پیدا ہوئے۔ ان کی وفات 1014ھ (1606ء) میں مکہ میں ہوئی۔ انہوں نے مختلف اسلامی موضوعات پر کثیر تعداد میں کتابیں لکھیں۔ (الاعلام للزرکلی، جلد 5، صفحہ 12)

ملا علی قاری کی ایک کتاب کا نام مرقاۃ المصابیح ہے جو مشکاۃ المصابیح کی شرح میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں ملّا علی قاری کتاب الجہاد کے تحت لکھتے ہیں کہ جہاد کے الفاظ میں لغوی طور پر جدوجہد اور مشقت کا مفہوم ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں: ثُمَّ غَلَبَ فِي الْإِسْلَامِ عَلَى قِتَالِ الْكُفَّارِ (جلد 6، صفحہ 2452)۔ یعنی، پھر جہاد کا لفظ اسلام میں اہل کفر سے جنگ کے لیے استعمال ہونے لگا۔

ہر لفظ کا ایک لغوی مفہوم ہوتا ہے اور دوسرا استعمالی مفہوم۔ یہی معاملہ جہاد کا بھی ہے۔ جہاد کا لفظ جہد سے نکلا ہے۔ لغوی طور پر اس کے معنی کوشش کے ہیں۔ اس میں مبالغہ کا مفہوم ہے۔ استعمال میں یہ لفظ مختلف قسم کی جدو جہد کے لیے لکھا یا بولا جاتا ہے۔ انھی میں سے ایک جنگ بھی ہے، تاہم اس کا استعمال صرف اس استثنائی جنگ کے لیے ہے جو فی سبیل اللہ کی گئی ہو، ملک و مال کے لیے جو جنگ کی جائے اس کو جہاد نہیں کہا جائے گا۔

قرآن میں اس سلسلے میں دو مختلف لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔ جہاد اور قتال۔ جب پُرامن جدو جہد مراد ہو تو وہاں قرآن میں جہاد کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن کے ذریعہ پُرامن دعوتی

جدو جہد مراد ہو تو وہاں قرآن میں جہاد کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن کے ذریعہ پُرامن دعوتی

جدو جہد (الفرقان، 25:25)۔ اور جب باقاعدہ جنگ مراد ہو تو وہاں قرآن میں قتال کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً (آل عمران، 3:121)۔ تاہم بعد کے زمانے میں جہاد کا لفظ اکثر قتال کے ہم معنی لفظ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ جہاد کے لفظ کے اس استعمال کو اگر بالفرض درست مانا جائے تب بھی وہ جہاد کے لفظ کا ایک توسیعی استعمال ہوگا، نہ کہ اس کا حقیقی استعمال۔

اپنے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے جہاد ایک پُرامن عمل کا نام ہے، نہ کہ متشدّدانہ عمل کا نام۔ جہاد کا عمل انسان کو ذہنی اور روحانی طور پر بدلنے کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ انسان کو قتل کرنے کے لیے۔

ہر حال میں امن

پیغمبر اسلام ﷺ انتہائی حد تک ایک امن پسند آدمی تھے۔ آپ کے مخالفین نے بار بار آپ کو لڑائی میں الجھانا چاہا مگر ہر بار آپ اعراض کر کے لڑائی سے بچتے رہے۔ تاہم چند بار یک طرفہ جارحیت کی بنا پر آپ کو وقتی طور پر دفاعی جنگ کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ انھی چند دفاعی جنگوں میں سے ایک بدر کا غزوہ ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ عین اس وقت جب کہ دونوں طرف کی فوجیں آمنے سامنے کھڑی تھیں، پیغمبر اسلام کے پاس خدا کا فرشتہ آیا۔ اس نے کہا کہ اے محمد، اللہ نے آپ کو سلام (سلامتی) کا پیغام بھیجا ہے۔ یہ سن کر پیغمبر اسلام نے فرمایا: هُوَ السَّلَامُ، ومِنْهُ السَّلَامُ، وَإِلَيْهِ السَّلَامُ (البدایہ والنہایہ لابن کثیر، جلد 3، صفحہ 267)۔ یعنی، اللہ سلامتی ہے اور اس سے سلامتی ہے اور اسی کی طرف سلامتی ہے۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عین لڑائی کے وقت بھی پیغمبر اسلام ایک امن پسند انسان بنے ہوئے تھے۔ اس ہنگامی وقت میں ایسا نہ تھا کہ آپ کا ذہن نفرت اور تشدّد سے بھر جائے بلکہ اس وقت بھی آپ امن اور سلامتی کی اصطلاحوں میں سوچتے تھے، اس وقت بھی آپ کا دل اس آرزو سے تڑپ رہا تھا کہ اللہ کی مدد سے وہ دنیا میں امن اور سلامتی کا ماحول قائم کرسکیں۔ سچا انسان وہ ہے جو جنگ کے وقت بھی امن کی بات سوچے، جو لڑائی کے ہنگاموں میں بھی سلامتی کا جذبہ اپنے دل میں لیے ہوئے ہو۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے مثبت سوچ (positive thinking) کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، جنگ تمام منفی واقعات میں سب سے بڑا منفی واقعہ ہے۔ پیغمبر عین اس کے کنارے کھڑا ہوا ہے مگر اس کی زبان سے خون اور تشدّد کے بجائے امن اور سلامتی کے الفاظ نکل رہے ہیں۔ یہ بلاشبہ اعلیٰ ترین انسانی صفت ہے۔ اعلیٰ انسان وہ ہے جو تشدّد کے درمیان بھی امن کی بات سوچے، جو جنگ کے حالات میں بھی صلح کا منصوبہ بنائے۔

اللہ کا نام سلامتی

قرآن میں اللہ کے مختلف نام (یا صفات) بتائے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک السلام ہے، یعنی سلامتی۔ گویا کہ خدا خود سلامتی کا مظہر ہے، خدا خود سلامتی کا پیکر ہے۔ خدا کو امن وسلامتی اتنا زیادہ پسند ہے کہ اس نے اپنا ایک نام السلام رکھا۔

اس آیت کی تفسیر میں الخطابی نے لکھا کہ — الَّذِي سَلِمَ الْخَلْقُ مِنْ ظُلْمِهِ (شان الدعاء للخطابی، صفحہ 41)۔ یعنی، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہستی جس کے ظلم سے لوگ محفوظ رہیں۔ لوگوں کو جس سے سلامتی کا تجربہ ہو، نہ کہ تشدّد کا۔

خدا کی حیثیت اعلیٰ ترین معیار کی ہے۔ جب خدا کا برتاؤ انسانوں سے امن اور سلامتی پر مبنی ہو تو انسانوں کو بھی دوسرے انسانوں کے ساتھ اسی برتاؤ کا معاملہ کرنا چاہیے۔ ہر انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ امن وسلامتی کا برتاؤ کرنا چاہیے، نہ کہ اس کے خلاف سختی اور تشدّد کا۔

طاقتور کون

ایک حدیث کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرَعَةِ، إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 5763)۔ یعنی، طاقت ور وہ نہیں ہے جو کُشتی میں لوگوں کو پچھاڑ دے۔ طاقتور صرف وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔

غصے کے وقت غصہ کو روکنا سلف کنٹرول (self control) کی علامت ہے۔ اور سلف کنٹرول بلاشبہ سب سے بڑی طاقت ہے۔ ایسے موقع پر سلف کنٹرول آدمی کو غلط کارروائیوں سے بچاتا ہے۔ اور جس آدمی کے اندر سلف کنٹرول کی طاقت نہ ہو، وہ غصے کے وقت بپھر اٹھے گا، یہاں تک کہ وہ متشدّدانہ کارروائی کرنے لگے گا۔ غصے کا قابو میں رکھنا امن پسند انسان کا طریقہ ہے اور غصے کے وقت بے قابو ہوجانا تشدّد پسند انسان کا طریقہ۔

ایک آدمی کی لڑائی دوسرے آدمی سے ہو اور وہ اس کو لڑائی میں پچھاڑ دے تو یہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ دوسرے آدمی کے مقابلے میں پہلا آدمی جسمانی اعتبار سے زیادہ طاقتور تھا۔ مگر جسمانی طاقت ایک محدود طاقت ہے۔ اس کے مقابلے میں جس شخص کا یہ حال ہو کہ اس کے اندر غصہ بھڑکے مگر وہ اپنے غصہ پر کنٹرول کرلے اور غصہ دلانے والے کے

ساتھ معتدل انداز میں معاملہ کرے، ایسا آدمی زیادہ بڑی طاقت کا مالک ہے۔ اس کی یہ روش اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ عقل کی طاقت رکھتا ہے، اور عقل کی طاقت بلاشبہ جسم کی طاقت سے بہت زیادہ بڑی ہے۔ ایسا آدمی اپنی دانشمندانہ منصوبہ کے ذریعہ ہر جنگ جیت سکتا ہے، بغیر اس کے کہ اس نے ایک انسان کا بھی خون بہایا ہو۔

سماجی امن کا فارمولا

سماجی امن کا فارمولا کیا ہے اور کسی سماج میں معتدل حالات کو کس طرح برقرار رکھا جا سکتا ہے، اس کے بارے میں پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: الْفِتْنَةُ نَائِمَةٌ لَعَنَ اللّٰه مَنْ أَيقَظَهَا (التدوین فی أخبار قزوین للرافعی، جلد 1، صفحہ 291)۔ یعنی، فتنہ سویا ہوا ہے۔ اس شخص پر اللہ کی لعنت ہے جو سوئے ہوئے فتنے کو جگائے۔

یہ سماجی امن کا ایک فطری فارمولا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر آدمی کے اندر انا (ego) کا جذبہ موجود ہے۔ اور انا کا جذبہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کو چھیڑا جائے تو وہ بہت بھڑک اٹھے گا اور فساد برپا کرے گا۔ مگر فطرت نے اس جذبے کو ہر آدمی کے سینے میں سلا دیا ہے۔ وہ ہر انسان کے اندر موجود ہے مگر تخلیقی نظام کے تحت وہ خوابیدہ حالت میں ہے۔ ایسی حالت میں کسی سماج کو پُرامن سماج بنانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے سینے میں سوئی ہوئی انانیت کو سویا رہنے دیا جائے۔

سماجی امن کو وہی لوگ درہم برہم کرتے ہیں جن کی انانیت کو بھڑکا دیا گیا ہو۔ اگر انانیت کو بھڑکانے سے بچا جائے تو سماج کا امن بھی تباہ نہ ہوگا۔ آپ اپنے مثبت رویہ سے دوسروں کی انا کو نہ چھیڑیے، اور پھر یقینی طور پر آپ ان کے شر سے محفوظ رہیں گے۔

خاموشی میں نجات

حدیثوں میں مختلف انداز سے خاموشی کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ ایک روایت کے

مطابق، پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: مَنْ صَمَتَ نَجَا (مسند احمد، حدیث نمبر 6654)۔ یعنی، جو شخص چپ رہا اس نے نجات پائی۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی بولنا چھوڑ دے، وہ بالکل خاموش رہے۔ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ آدمی خاموش رہ کر معاملے کو سمجھے، اس کے بعد وہ بولے۔ یہ بلاشبہ ایک بہترین طریقہ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ باقاعدہ اپنی تربیت کرکے یہ عادت ڈالے کہ وہ بولنے سے زیادہ خاموش رہے۔ وہ بولے تو اس وقت بولے جب کہ وہ سوچنے کا کام کر چکا ہو۔

یہ تربیت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ روزانہ کے معمول کی بات چیت میں وہ بالقصد اپنے آپ کو اس کا عادی بنائے۔ اگر آدمی اپنی روزمرہ کی معمولی بات چیت میں یہ عادت ڈال لے تو اپنی اس عادت کی بنا پر وہ اس وقت بھی ایسا ہی کرے گا جب کہ خلاف معمول کوئی بات پیش آ گئی ہو۔

عام طور پر لوگ یہ کرتے ہیں کہ جب ان کے سامنے کوئی بات آتی ہے تو فوری طور پر اس کا جو جواب ان کے ذہن میں آتا ہے، اس کو اپنی زبان سے بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ طریقہ درست نہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے سوچنے کا عمل کیا جائے اور پھر اس کے بعد بولنا شروع کیا جائے۔ جو لوگ ایسا کریں وہ اس انجام سے بچ جائیں گے کہ وہ اپنے بولے ہوئے الفاظ پر پچھتائیں۔ وہ اپنے کہے ہوئے بول کو لوٹانا چاہیں، حالاں کہ کسی کا کہا ہوا بول دوبارہ اس کی طرف لوٹنے والا نہیں۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی خلاف مزاج بات سامنے آتی ہے تو آدمی بھڑک کر ناپسندیدہ انداز میں کلام کرنے لگتا ہے۔ اس سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ روزمرہ کی معمولی بات چیت میں آدمی اس کی عادت ڈالے کہ وہ پہلے سوچے اور پھر بولے۔ جب ایسا ہوگا کہ معمول کی بات چیت میں وہ بولنے سے پہلے سوچنے کا عادی ہو جائے گا تو وہ اپنی اس عادت کی بنا پر خلاف معمول بات چیت میں بھی اسی طریقہ پر کاربند رہے گا۔ عام بات چیت

میں اپنے آپ پر کنٹرول رکھ کر بولنے کی عادت اس کو اس قابل بنا دے گی کہ وہ ہنگامی مواقع پر بھی اپنے آپ پر کنٹرول رکھ کر بولے، وہ ذہنی ڈسپلن کے ساتھ بات چیت کرے۔

دنیا کے اکثر فتنے الفاظ کے فتنے ہیں۔ کچھ الفاظ نفرت اور تشدّد کے جذبات کو بھڑکاتے ہیں۔ اور کچھ دوسرے الفاظ امن اور انسانیت کا ماحول قائم کرتے ہیں۔ اگر آدمی صرف یہ کرے کہ وہ بولنے سے پہلے سوچے اور اپنے جذبات کو قابو میں رکھ کر بولے تو بیشتر فتنے پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائیں گے۔

اپنے آپ کو قابو میں رکھ کر کلام کرنا ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ یہ صفت ان لوگوں میں ہوتی ہے جو اپنے آپ پر نظر ثانی کرتے رہیں، جو اپنے قول وعمل کا حساب لیتے رہیں۔

آدمی کو چاہیے کہ جب وہ کوئی بات سنے تو وہ فوراً اس کا جواب نہ دے، وہ فوراً اپنا ردعمل پیش نہ کرے۔ وہ ایک لمحہ کے لیے ٹھہر کر سوچے کہ کہنے والے نے کیا بات کہی ہے اور میری طرف سے اس کا بہتر جواب کیا ہو سکتا ہے۔ بات کو سن کر ایک لمحہ کے لیے ٹھہرنا اس بات کی یقینی ضمانت ہے کہ وہ سنی ہوئی بات کا درست جواب دے گا، وہ پتھر کا جواب پتھر سے دینے کے بجائے پتھر کا جواب پھول سے دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔

دشمن سے ٹکراؤ نہیں

پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ، وَسَلُوا اللّٰهَ الْعَافِيَةَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6810)۔ یعنی، دشمن سے مدبھیڑ کی تمنا نہ کرو، تم اللہ سے امن مانگو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اگر تمہارا دشمن بن جائے تو ایسا نہ کرو کہ تم بھی اس کے دشمن بن کر اس سے لڑنا شروع کر دو۔ بلکہ فریق ثانی کی دشمنی کے باوجود تم اس کے ساتھ اعراض کا طریقہ اختیار کرو۔ دشمنی کے حالات کے باوجود تمہارا طریقہ لڑائی سے بچنے کا ہونا چاہیے، نہ کہ اپنے آپ کو لڑائی میں پھنسا لینے کا۔

اللہ سے امن مانگو— کا مطلب یہ ہے کہ تم ٹکراؤ کے بجائے امن کا راستہ اختیار کرو اور اپنی امن پسندانہ کوششوں کے ساتھ خدا کو بھی دعاؤں کے ذریعہ اس میں شامل کرو۔ تمہاری دعا یہ نہیں ہونی چاہیے کہ خدایا، دشمن کو ہلاک کر دے بلکہ یہ ہونی چاہیے کہ خدایا، مجھے توفیق دے کہ میں لوگوں کی دشمنی کے باوجود تشدّد اور ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہ کروں بلکہ امن کے راستے پر اپنی زندگی کا سفر طے کرتا رہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ فطرت کے نقشے کے مطابق، اس دنیا میں امن کی حیثیت عموم (rule) کی ہے اور تشدّد کی حیثیت صرف ایک استثنا (exception) کی۔ مزید اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر بظاہر کوئی شخص یا گروہ آپ کا دشمن ہو تو اس سے نپٹنے کی صرف یہی ایک شکل نہیں ہے کہ اس سے مڈبھیڑ کی جائے۔ زیادہ بہتر مؤثر شکل یہ ہے کہ امن کی تدبیر سے دشمن کے مسئلہ کا حل نکالا جائے۔ امن کی طاقت تشدّد کی طاقت کے مقابلے میں، زیادہ کارگر بھی ہے اور زیادہ مفید بھی۔

نان وائلنس کا طریقہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ فرمایا: إِنَّ اللّٰهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ، وَيُعْطِي عَلَى الرِّفْقِ مَا لَا يُعْطِي عَلَى الْعُنْفِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر، 2593)۔ یعنی، اللہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا۔ یہ دراصل فطرت کے اس قانون کا بیان ہے جو خدا نے موجودہ دنیا میں قائم کر رکھا ہے۔ اسی قانون کی بنا پر ایسا ہے کہ جب کوئی شخص نرمی اور عدم تشدّد کے حدود میں رہ کر کام کرے تو اس کا کام زیادہ نتیجہ خیز بن جاتا ہے۔ اور جو شخص سختی اور تشدّد کا طریقہ اختیار کرے اس کا کام آگے بڑھنے کے بجائے اور پیچھے کی طرف چلا جاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص سختی اور تشدّد کا طریقہ اختیار کرے تو اس کی کوششیں غیر ضروری طور پر دو محاذوں میں بٹ جاتی ہیں۔ ایک محاذ، اپنی داخلی تعمیر کا۔ اور دوسرا محاذ،

خارجی حریف سے لڑنے کا۔ اس کے برعکس، جو شخص نرمی اور عدم تشدّد کا طریقہ اختیار کرے، اس کے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی تمام طاقتوں کو صرف ایک محاذ، داخلی تعمیر کے محاذ پر لگائے، اور اس کے فطری نتیجے کے طور پر زیادہ بڑی ترقی حاصل کرلے۔

اس حدیث میں فطرت کے اس قانون کا ذکر ہے جس پر ہماری دنیا کا نظام چل رہا ہے۔ یہاں جو کچھ کسی کو ملتا ہے وہ اسی نظام کے تحت ملتا ہے، اس کے بغیر نہیں۔ فطرت کا یہ نظام تمام تر امن اور عدم تشدّد کے اصول پر قائم ہے۔ اس لیے یہاں جب بھی کسی کو کچھ ملے گا، امن اور عدم تشدّد کے اصول پر ملے گا، اس سے انحراف کر کے کسی کو کچھ ملنے والا نہیں۔

اختلاف کی حد

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف یہ فرمایا کہ: أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ، أَوْ أَمِيرٍ جَائِرٍ (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 4344)۔ یعنی، ظالم حکمراں کے سامنے حق وعدل کی بات کہنا افضل جہاد ہے۔

دوسری طرف حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام نے فرمایا: مَنْ رَأَى مِنْ أَمِيرِهِ شَيْئًا يَكْرَهُهُ فَلْيَصْبِرْ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1849)۔ یعنی، جو شخص اپنے حاکم میں ایسی چیز دیکھے جو اس کو پسند نہ ہو تو وہ اس پر صبر کرے۔ اسی طرح آپ نے فرمایا: تَسْمَعُ وَتُطِيعُ لِلْأَمِيرِ، وَإِنْ ضُرِبَ ظَهْرُكَ، وَأُخِذَ مَالُكَ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1847)۔ یعنی، تم اپنے حاکم کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو، خواہ وہ تمہاری پیٹھ پر کوڑا مارے اور تمہارا مال چھین لے۔

ان حدیثوں میں بظاہر دو قسم کے احکام ہیں۔ ایک طرف یہ حکم ہے کہ تم اپنے حاکم میں کوئی غلط بات دیکھو تو کھلے طور پر اس کا اعلان کرو۔ دوسری طرف حدیث یہ بتاتی ہے کہ امیر کے اندر تمہیں کوئی غلط بات دکھائی دے تو اس پر صبر کرو، اگر وہ تمہارے اوپر ظلم کرے تب بھی تم اس کو برداشت کرو۔

یہ ایک بے حد اہم ہدایت ہے جس سے دو چیزوں کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ ہے، اعلان اور اقدام کا فرق۔ یہ ایک مطلوب بات ہے کہ آدمی حکمراں کے اندر کوئی غلط بات دیکھے تو وہ نصیحت اور خیر خواہی کے انداز میں اس کا اعلان کرے۔ مگر جہاں تک عملی اقدام کا تعلق ہے تو آدمی کو اس سے مکمل طور پر باز رہنا چاہیے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ نصیحت اور ٹکراؤ کی سیاست میں فرق کرے۔ نصیحت کے جائز حق کو استعمال کرتے ہوئے وہ سیاسی ٹکراؤ سے مکمل طور پر بچے۔

فرق کا اصول بے حد اہم ہے۔ سماج میں جب بھی تشدّد کا ماحول بنتا ہے، وہ اس وقت بنتا ہے جب کہ لوگ حکمراں کے خلاف عملی ٹکراؤ کی مہم شروع کر دیں۔ وہ اصلاح سیاست کے نام پر حکمراں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کا منصوبہ بنائیں۔ لیکن اگر اس قسم کی نزاعی سیاست سے بچتے ہوئے صرف قولی نصیحت پر اکتفا کیا جائے تو ہمیشہ ایسا ہوگا کہ سماج میں امن قائم رہے گا، سماج کبھی بھی تشدّد کا جنگل نہیں بنے گا۔

پُرامن طریق کار زیادہ بہتر

ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ معاملات میں پیغمبر اسلام کی پالیسی کیا تھی۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: مَا خُيِّرَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم بَيْنَ أَمْرَيْنِ إِلَّا أَخَذَ أَيْسَرَهُمَا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3367)۔ یعنی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی کسی معاملے میں دو میں سے ایک طریقہ کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان تر انتخاب کرتے تھے۔

اختیار ایسر کے اصول کو اگر متشدّدانہ طریق کار اور پُرامن طریق کار کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ پیغمبر کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی معاملہ پیش آئے تو اس سے نپٹنے کے لیے متشدّدانہ طریق کار کو اختیار نہ کیا جائے بلکہ پُرامن طریق کار کو اختیار کیا جائے۔ کیوں کہ متشدّدانہ طریق کار یقینی طور پر مشکل ہے اور پُرامن طریق کار یقینی طور پر آسان۔

تاہم یہ سادہ طور پر صرف آسان اور مشکل کا معاملہ نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاملات میں پُرامن طریقہ ہمیشہ نتیجہ خیز ہوتا ہے اور متشدّدانہ طریقہ یقینی طور پر بے نتیجہ ہے۔ وہ مسئلہ کو حل نہیں کرتا البتہ اس میں کچھ اور اضافہ کر کے اس کو مزید پیچیدہ بنا دیتا ہے۔ حدیث میں مشکل طریقہ سے مراد وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ مقصد کا حصول مشکل ہو۔ اس کے مقابلے میں آسان سے مراد وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ مقصد کا حصول آسان اور یقینی ہو۔

لچک کا طریقہ، نہ کہ اکڑ کا طریقہ

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے— صحیح البخاری، کتاب التوحید، صحیح مسلم، کتاب المنافقین، سنن الدارمی، کتاب الرقاق، مسند احمد۔ اس حدیث میں مومن، بالفاظ دیگر، خدا پرست انسان کی مثال خامہ سے دی گئی ہے۔ خامہ نرم پودے کی طرح ہے۔ جب بھی ہوا کا کوئی جھونکا آتا ہے تو وہ اس کے مطابق، جھک جاتا ہے۔ اور جب جھونکا چلا جائے تو وہ دوبارہ اٹھ جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو بلا اور مصیبت سے بچا لیتا ہے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 5644؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 2810)۔

اس حدیث کے مطابق، کسی طوفان کا سامنا کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے مقابلے میں اکڑ دکھائی جائے۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں لچک کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مقابلے کا ایک طریقہ متشدّدانہ طریقہ ہے اور دوسرا طریقہ پُرامن طریقہ۔ خدا کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ پہلے طریقہ کو چھوڑ دیا جائے اور دوسرے طریقہ کو اختیار کیا جائے۔

طوفان کے مقابلے میں جو لوگ اکڑ کا طریقہ اختیار کریں وہ اپنے اس عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ وہ انانیت میں مبتلا ہیں۔ اس کے مقابلے میں امن کا طریقہ تواضع پر مبنی

ہے۔ خدا کی اس دنیا میں انانیت کی روش اختیار کرنے والوں کے لیے تباہی ہے اور تواضع کی روش اختیار کرنے والوں کے لیے کامیابی۔ یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے: مَنْ تَوَاضَعَ رَفَعَهُ اللّٰهُ (مسند الشہاب، حدیث نمبر 335)۔ یعنی، جس نے تواضع کی روش اختیار کی، خدا اس کو بلندی عطا فرمائے گا۔

پُرامن شہری

حدیث میں آیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ: المؤمِنُ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ على دِمائِهِمْ وأَمْوالِهِم (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2815)۔ یعنی، مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنے خون اور اپنے مال کے معاملے میں مامون ہوں۔

کسی سماج میں رہنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی لوگوں کے درمیان امن کے ساتھ رہے۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ دوسروں سے لڑائی جھگڑا کرتا رہے۔ اس حدیث کے مطابق، ایمانی طریقہ یہ ہے کہ آدمی لوگوں کے درمیان پُرامن شہری بن کر رہے۔ دوسروں کی جان اور مال اور عزت کے لیے وہ مسئلہ نہ بنے۔ وہ کسی حال میں دوسروں کے خلاف تشدّد کا طریقہ اختیار نہ کرے۔

زندگی کا وہ طریقہ کیا ہے جس میں سماج کے افراد ایک دوسرے کی زیادتیوں سے محفوظ ہوں۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ شکایت کے باوجود آدمی اپنی معتدل روش کو برقرار رکھے۔ دوسروں سے شکایت کو وہ اپنے سینے میں دفن کردے، وہ اپنے سینے کی آگ کو دوسروں کے اوپر انڈیلنے سے بچے۔ اسی قسم کا سماج وہ سماج ہے جہاں لوگ ایک دوسرے سے مامون رہ کر زندگی گزاریں۔ پُرامن سماج معیاری انسانی سماج ہے۔ اس کے برعکس، جس سماج میں تشدّد ہو وہ حیوانی سماج ہے، نہ کہ انسانی سماج۔ امن پسندی ایک اعلیٰ اخلاق ہے۔ اس کے مقابلے میں تشدّد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی انسانی اخلاق کی سطح سے گر کر حیوانی اخلاق کی سطح پر آ گیا ہو۔

انتظار بھی حل ہے

پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: أَفْضَلُ الْعِبادةِ انْتظارُ الْفَرَجِ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3571)۔یعنی، کشادگی کا انتظار کرنا ایک افضل عبادت ہے۔

ہر فرد اور گروہ پر ہمیشہ ایسے حالات آتے ہیں جن میں وہ اپنے آپ کو تنگی میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ ایسے موقع پر بیشتر لوگ یہ کرتے ہیں کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر تنگی کو ایک مستقل حالت سمجھ لیتے ہیں اور اس کو فوراً اپنے آپ سے دور کرنے کے لیے حالات سے لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی لڑائی ہمیشہ بے فائدہ ثابت ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ تنگی پر کچھ اور مشکلات کا اضافہ کرلیا جائے۔

تنگی کبھی ہمیشہ کے لیے نہیں آتی، وہ صرف وقتی طور پر آتی ہے۔ ایسی حالت میں تنگی کے مسئلے کا آسان حل صرف یہ ہے کہ انتظار کی پالیسی ختیار کی جائے۔یعنی غیر ضروری طور پر حالات سے لڑائی نہ چھیڑی جائے بلکہ سادہ طور پر انتظار کرو اور دیکھو(wait and see) کی پالیسی اختیا کی جائے۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی کا ذہنی سکون برباد نہ ہوگا۔ اور جو کچھ ہونے والا ہے وہ اپنے آپ اپنے وقت پر ہو جائے گا۔

جب کوئی مسئلہ پیش آتا ہے تو آدمی یہ چاہنے لگتا ہے کہ فوراً اس کا حل نکل آئے۔ یہی اصل غلطی ہے۔ آدمی اگر پیش آئے ہوئے مسئلے کو انتظار کے خانے میں ڈال دے تو کوئی مسئلہ، مسئلہ نہیں۔

خدائی انتباہ، نہ کہ انسانی ظلم

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی امت کو بعد کے جن حالات سے پیشگی طور پر آگاہ کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں مسلم امت دوسری قوموں کی زد میں آجائے گی۔ چنانچہ فرمایا: يُوشِكُ الْأُمَمُ أَنْ تَدَاعَى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْأَكَلَةُ إِلَى قَصْعَتِهَا (سنن

ابو داؤد، حدیث نمبر 4297)۔یعنی، قریب ہے کہ قومیں تمہارے خلاف ایک دوسرے کو پکاریں جس طرح کھانا کھانے والے ایک دوسرے کو دسترخوان پر پکارتے ہیں۔

قرائن بتاتے ہیں کہ واقعہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں پیش آیا۔ ابتداءً یورپ کی نوآبادیاتی قوموں کے ذریعہ یہ واقعہ ہوا۔اس کے بعد دوسری قومیں اس میں شریک ہوتی چلی گئیں۔ اس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ایسا کیوں ہوا۔ قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ براہِ راست خدا کی سنت کے تحت پیش آیا۔خدا کی سنت یہ ہے کہ قوموں کو جگانے کے لیے ان پر تنبیہات نازل کی جاتی ہیں۔ یہ گویا شاک ٹریٹمنٹ (shock treatment) ہوتا ہے تاکہ وہ چونکیں اور اپنی اصلاح کریں۔ چنانچہ فرمایا:

فَلَوْلَآ اِذْ جَاۗءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (43:6)۔یعنی، پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ وہ گڑگڑائے۔ بلکہ ان کے دل سخت ہوگئے۔اور شیطان ان کے عمل کو ان کی نظر میں خوش نما کرکے دکھاتا رہا۔

اس آیت میں تزئین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔اس کا مطلب ہے— ایک برے کام کو خوبصورت الفاظ میں بیان کرنا تاکہ اس کی برائی چھپ جائے۔موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے ساتھ عین یہی واقعہ پیش آیا۔موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر عین وہی کام کیا جس کو مذکورہ آیت میں تزئین کہا گیا ہے۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے ساتھ غیر قوموں کی طرف سے جو مسائل پیش آئے وہ خدائی انتباہ (warning) تھے۔مگر مسلم رہنماؤں نے ان مسائل کو ظلم اور سازش کی اصطلاحوں میں بیان کرنا شروع کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو واقعہ اس لیے تھا کہ مسلمان اپنی کوتاہیوں کو محسوس کریں اور اپنی داخلی اصلاح میں سرگرم ہوجائیں۔اس کے بجائے مسلم رہنماؤں کی غلط رہنمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ساری سوچ غیر اقوام کی

طرف متوجہ ہوگئی۔جس واقعہ سے احتساب خویش کا ذہن پیدا ہونا چاہیے تھا، اس سے احتسابِ غیر کا ذہن جاگ اٹھا، جو بڑھتے بڑھتے تشدّد تک جا پہنچا۔

خاموشی کی طاقت

حضرت عمر فاروق اسلامی تاریخ کے دوسرے خلیفہ ہیں۔ان کا ایک قول ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: اَمِیتُوا الْبَاطِلَ بِالصَّمْتِ عَنْهُ (ابونعیم اصبہانی، حلیۃ الأولیاء، جلد 1، صفحہ 55)۔یعنی، تم لوگ باطل کو ہلاک کرو اس کے بارے میں چپ رہ کر۔

فطرت کے قانون کے مطابق، اس دنیا میں حق کو زندگی ملتی ہے اور باطل کے لیے موت مقدر ہے۔ایسی حالت میں باطل کی ہلاکت کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ اس کے بارے میں خاموشی اختیار کرلی جائے۔باطل کے خلاف بولنا یا اس کے خلاف ہنگامہ کرنا اس کو زندگی دیتا ہے۔اور باطل کو نظر انداز کرکے اس کے بارے میں چپ رہنا اس کی موت کا سبب بن جاتا ہے۔

باطل کے بارے میں چپ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو نظر انداز کیا جائے۔اس کے خلاف کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا جائے۔اس کے مقابلے میں احتجاج اور صف آرائی کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔تاہم ایسا کرنا صرف ان لوگوں کے لیے ممکن ہے جو فطرت کی طاقت جانیں اور اس پر بھروسہ کرسکیں۔جو لوگ فطرت کی طاقت کو نہ جانیں، وہی لوگ باطل کے خلاف ہنگامہ آرائی کرکے اس کو زندگی دینے کا سبب بن جاتے ہیں۔

تشدّد مایوسی کا نتیجہ

تشدّد محرومی کے احساس کا نتیجہ ہے، اور امن یافت کے احساس کا نتیجہ۔جو لوگ اس احساس میں مبتلا ہوں کہ وہ محروم ہیں، دوسروں نے ان کی چیز ان سے چھین لی ہے، ایسے لوگ ہمیشہ منفی نفسیات میں مبتلا رہتے ہیں۔اور ان کا یہی احساس اکثر تشدّد کی صورت میں

ظاہر ہوتا ہے۔لیکن جولوگ اس احساس میں جیتے ہوں کہ انھوں نے اپنی زندگی میں یافت کا تجربہ کیا ہے، ایسےلوگ ذہنی سکون سےہم کنار ہوتے ہیں۔وہ ہمیشہ پُرامن زندگی گزارتے ہیں۔

جو فرد یا گروہ دوسروں کے خلاف نفرت کرے، جو دوسروں کے خلاف تشدّد پر اتر آئے، وہ اپنے عمل سے ثابت کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو محروم سمجھ رہا ہے۔اس کے برعکس، جو فرد یا گروہ امن پسندی کی زندگی گزارے، وہ اپنے عمل سے اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں وہ چیز پالی ہے، جو اس کو پانا چاہیے۔

اب سوال یہ ہے کہ محرومی کا احساس کسی کو کیوں پیدا ہوتا ہے اور وہ کون لوگ ہیں جو ہمیشہ یافت کے احساس میں جیتے ہیں۔

اس دنیا میں سب سے بڑا پانا یہ ہے کہ آدمی نے خدا کو پالیا ہو اور وہ سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ آدمی خدا کو پانے سے محروم ہو۔خدا کو پانے کے بعد کوئی اور چیز پانے کے لیے باقی نہیں رہتی، اور جولوگ خدا کو پانے سے محروم ہوں وہ گویا محرومی کی آخری حالت پر پہنچ گئے ہیں جہاں محرومی ہی محرومی ہے، اوّل بھی اور آخر بھی، کوئی بھی چیز ان کی محرومی کے احساس کو ختم کرنے والی نہیں۔

پازیٹیو اسٹیٹس کوازم

جب بھی کوئی آدمی عمل کرنا چاہے تو اس کو فوراً محسوس ہوتا ہے کہ اس کے راستے میں کچھ رکاوٹیں حائل ہیں۔ ایسا ایک فرد کے لیے بھی ہوتا ہے اور پوری قوم کے لیے بھی۔اب عمل کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پہلے رکاوٹوں سے لڑ کر ان کو راستے سے ہٹا دیا جائے اور اس کے بعد اپنا مطلوب عمل شروع کیا جائے۔اس طریقہ کو عام طور پر ریڈیکلزم (radicalism) کہا جاتا ہے۔

ریڈیکلزم کا طریقہ جذباتی لوگوں کو یا انتہا پسند لوگوں کو بظاہر پسند آتا ہے، مگر وہ کسی مثبت مقصد کے لیے مفید نہیں۔ ریڈیکلزم کا طریقہ تخریب کے لیے کارآمد ہے، وہ تعمیر کے لیے کارآمد نہیں۔ ریڈیکلزم کے طریقہ میں صرف موجودہ سسٹم ہی نہیں ٹوٹتا، بلکہ اس عمل کے دوران وہ سماجی روایات ٹوٹ جاتی ہیں جو صدیوں کے درمیان بنی تھیں۔ قتل وخون اورتوڑ پھوڑ کی وجہ سے بے شمار لوگ طرح طرح کی مصیبتوں کا شکار ہوتے ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ ریڈیکلزم کا طریقہ نظریاتی طور پر بظاہر خوب صورت معلوم ہوتا ہے، مگر عملی انجام کے اعتبار سے اس میں کوئی خوبی نہیں۔

اس کے مقابلے میں دوسرا طریقہ یہ ہے کہ صورت موجودہ سے ٹکراؤ نہ کرتے ہوئے ممکن دائرہ میں اپنے عمل کی منصوبہ بندی کی جائے۔ صورت موجودہ (status quo) کو وقتی طور پر قبول کرتے ہوئے ان مواقع کو استعمال کیا جائے جو اب بھی موجود ہیں۔ اس طریقے کو ایک لفظ میں پازیٹیو اسٹیٹس کوازم (positive statusquoism) کہا جاسکتا ہے۔

ریڈیکلزم کا طریقہ ہمیشہ تشدّد پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس، پازیٹیو اسٹیٹس کوازم سماج کے امن کو باقی رکھتے ہوئے اپنا کام انجام دیتا ہے۔ ریڈیکلزم کا طریقہ ہمیشہ مسئلہ میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس، پازیٹیو اسٹیٹس کوازم کا طریقہ سماج میں کوئی مسئلہ پیدا کیے بغیر اپنا عمل انجام دیتا ہے۔ ایک اگر بگاڑ کا راستہ ہے تو دوسرا بناؤ کا راستہ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قدیم عرب میں اصلاح کا جو طریقہ اختیار کیا اس کو ایک لفظ میں، پازیٹیو اسٹیٹس کوازم کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً اس زمانے میں خانہ کعبہ کے اندر 360 بت رکھے ہوئے تھے۔ یہ ایک بڑا مسئلہ تھا۔ مگر قرآن کے ابتدائی دور میں اس قسم کا حکم نہیں اترا کہ: طَهِّرِ الْكَعْبَةَ مِنَ الْأَصْنَامِ (کعبہ کو بتوں سے پاک کرو)۔ اس کے بجائے اس ابتدائی دور میں قرآن میں جو آیت اتری وہ تھی: وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (74:4)۔ یعنی، اپنے کپڑوں کو پاک کرو۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اپنے اخلاق کو اور دوسروں کے اخلاق کو درست بناؤ۔

تشدّد کا کوئی جواز نہیں

تشدّد انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ تشدّد انسانیت کا قتل ہے۔ تشدّد تمام جرموں میں سب سے بڑا جرم ہے۔ اس کے باوجود لوگ کیوں تشدّد کرتے ہیں۔ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ ایسے لوگ خودساختہ طور پر اپنے لیے تشدّد کا ایک جواز (justification) ڈھونڈ لیتے ہیں۔ وہ بطور خود یہ خیال قائم کر لیتے ہیں کہ فلاں وجہ سے ان کے لیے تشدّد کرنا جائز ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ تشدّد کا ہر جواز جھوٹا جواز ہے۔ کوئی فرد یا گروہ جب بھی تشدّد کرتا ہے، عین اسی وقت اس کے لیے عدم تشدّد یا پُرامن طریق کار موجود ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں تشدّد کیوں۔ جب تشدّد کے بغیر عمل کرنے کا موقع موجود ہو تو تشدّد کیوں کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تشدّد مطلق طور پر قابل ترک ہے اور امن مطلق طور پر قابل اختیار۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ کسی بھی عذر کی بنا پر تشدّد نہ کرے، وہ ہر صورت حال میں پُرامن طریق عمل پر قائم رہے۔

عداوت کے مسئلہ کا حل

بہت سے لوگ یہ خیال کر لیتے ہیں کہ فلاں قوم ہماری دشمن ہے۔ پھر اس مفروضہ کے تحت وہ اس قوم کے خلاف متشدّدانہ لڑائی چھیڑ دیتے ہیں تاکہ اس کی دشمنی کے انجام سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔ مگر یہ مفروضہ بھی غلط ہے اور اس مفروضہ کی بنیاد پر بنایا جانے والا نقشہ کار بھی غلط۔

دشمنی ہاتھ کی انگلی کی طرح انسانی وجود کا کوئی مستقل حصہ نہیں۔ وہ انسانی وجود کا ایک اوپری حصہ ہے۔ مثبت تدبیر کے ذریعہ ہر دشمنی کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ دشمنی کی مثال ایسی ہے جیسے گلاس کے اوپر لگی ہوئی مٹی۔ ایسی مٹی کو نہایت آسانی کے ساتھ پانی سے دھو کر

صاف کیا جاسکتا ہے۔ گویا کہ کلاس میں مٹی کا لگنا مسئلہ نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ کے پاس مٹی کو دھونے کے لیے صاف پانی نہ ہو۔

تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے بجتی ہے، ایک ہاتھ سے کبھی تالی نہیں بجتی۔ اسی طرح دشمنی ایک دوطرفہ عمل ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کا دشمن بنے تو آپ خود اس کے دشمن نہ بنیں۔ اس کے بعد دشمنی اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔ دشمن کے ساتھ دشمنی نہ کرنا ہی دشمنی کے مسئلہ کا سب سے زیادہ کارگر عمل ہے۔

ہتھیار جمع کرنا بے فائدہ

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک کامیاب تاجر ہیں۔ گفتگو کے دوران انہوں نے کہا کہ میرا گھر شہر کے ایک ایسے کنارے پر ہے جہاں سے غیر قوم کی آبادی شروع ہو جاتی ہے۔ میں نے سوچا کہ مجھے اپنی اور اپنے بچوں کی حفاظت کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے پیسہ خرچ کر کے اپنے گھر کے ہر فرد کے لیے لائسنس بنوایا اور پھر گھر کے ہر فرد کے نام گن اور ریوالور حاصل کر لیا۔ اب میں اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو محفوظ سمجھتا ہوں۔ اب مجھے دنگے اور فساد کا کوئی ڈر نہیں۔

میں نے کہا کہ آپ تجارت کا اصول جانتے ہیں مگر آپ سماجی زندگی کے اصول کو نہیں جانتے۔ سماجی تحفظ کا ذریعہ گن اور ریلوالور نہیں ہے۔ سماجی تحفظ کا اصول یہ ہے کہ آپ دوسروں کے لیے بہترین پڑوسی بن کر رہیں۔ آپ دوسروں کو اپنے شر سے بچائیں۔ اس کے بعد لازمی طور پر ایسا ہو گا کہ آپ دوسروں کے شر سے محفوظ رہیں گے۔ اگر آپ دوسروں سے نفرت کریں تو دوسروں کی طرف سے بھی آپ کو نفرت ملے گی اور اگر آپ کے دل میں دوسروں کے لیے خیر خواہی ہو تو دوسروں کی طرف سے بھی آپ کو محبت اور خیر خواہی کا تحفہ ملے گا۔

میں نے کہا کہ اگر آپ کے گھر کے سامنے غیر قوم کی بھیڑ اکٹھا ہو جائے اور آپ اپنی بالکنی پر کھڑے ہو کر اس کے اوپر گولی چلا دیں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بس اتنے ہی پر معاملہ ختم ہو جائے گا۔ ہر گز نہیں۔ آپ کو جاننا چاہیے کہ انسانوں کے اوپر گولی چلانا آپ کے لیے قابل دست اندازی پولیس جرم (cognizable offence) کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ جب بھی ایسا ہو گا تو پولیس فوراً وہاں آجائے گی اور آپ ہر گز پولیس سے لڑ نہیں سکتے۔

آپ کو جاننا چاہیے کہ آپ کے پاس گن ہونا اور پولیس کے پاس گن ہونا دونوں میں بے حد بنیادی فرق ہے۔ آپ گن رکھنے کے باوجود کسی کو گولی مارنے کا قانونی حق نہیں رکھتے۔ لیکن پولیس کے پاس گن ہے تو وہ گولی مارنے کا قانونی حق بھی رکھتی ہے۔ غیر قوم کے مقابلے میں بظاہر مقابلہ دو مساوی فریق کے درمیان نظر آتا ہے مگر جب معاملہ آپ کے اور پولیس کے درمیان کا ہو جائے تو یہ مقابلہ مکمل طور پر غیر مساوی ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں آپ گولی چلانا اپنے نتیجے کے اعتبار سے، آبیل مجھے مار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا اقدام تحفظ نہیں ہے بلکہ وہ اپنے نتیجے کے اعتبار سے صرف ہلاکت کی حیثیت رکھتا ہے۔

ضمیر بہترین جج ہے

ایک شہر میں ایک مسلمان نے اپنے لیے نیا گھر بنایا۔ گھر سے ملی ہوئی ایک زمین کو انھوں نے حصار بنا کر اپنے گھر میں داخل کر لیا۔ ان کے پڑوس میں ایک ہندو ٹھیکہ دار تھا۔ اس ہندو ٹھیکہ دار کا دعویٰ تھا کہ یہ زمین اس کی ہے۔ چنانچہ اس نے شہر کے کٹّر ہندوؤں سے مل کر انھیں بھڑکایا۔ یہاں تک کہ ایک دن ہندوؤں کی ایک بھیڑ گھر کے سامنے سڑک پر اکٹھا ہو گئی، اور نعرے لگانے لگی۔

مذکورہ مسلمان کے پاس اس وقت دو بندوقیں تھیں۔ مگر انھوں نے بندوق نہیں اٹھائی۔ وہ تنہا اور خالی ہاتھ گھر سے نکل کر باہر آئے۔ انھوں نے نعرہ لگانے والی بھیڑ سے کچھ

نہیں کہا۔ انہوں نے صرف یہ پوچھا کہ آپ کا لیڈر کون ہے۔ ایک صاحب جن کا نام مسٹر سونڈ تھا، آگے بڑھے اور کہا، وہ میں ہوں، بتائیے کہ آپ کو کیا کہنا ہے۔ مسلمان نے بھیڑ سے کہا کہ آپ لوگ یہاں ٹھہریئے اور مسٹر سونڈ کو لے کر گھر کے اندر آ گئے۔ ان کو کمرہ میں لا کر انہیں کرسی پر بٹھا دیا۔

اس کے بعد مسلمان نے کہا کہ مسٹر سونڈ آپ لوگ کس سلسلے میں یہاں آئے۔ مسٹر سونڈ نے غصہ میں کہا کہ آپ نے ایک ہندو بھائی کی زمین پر قبضہ کرلیا ہے، ہم اسی کے لیے یہاں آئے ہیں۔ مسلمان نے نرمی کے ساتھ کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ زمین کاغذ پر ہوتی ہے۔ زمین کا فیصلہ کاغذ کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ آپ ایسا کیجیے کہ میرے پاس جو کاغذات ہیں ان کو لے لیجیے اور ٹھیکہ دار صاحب کے پاس جو کاغذات ہیں ان کو بھی لے لیجیے۔ اور پھر نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے گھر چلے جائیے۔ اس معاملے میں میں آپ کو ہی جج مانتا ہوں۔ آپ کاغذات کو دیکھنے کے بعد جو بھی فیصلہ کر دیں وہ مجھے بلاشرط منظور ہوگا۔ یہ سن کر مسٹر سونڈ بالکل نارمل ہو گئے۔ وہ غصہ کی حالت میں اندر گئے تھے اور ہنستے ہوئے باہر نکلے انہوں نے سڑک پر کھڑی ہوئی بھیڑ سے کہا کہ تم لوگ اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔ میاں جی نے خود ہمیں جج بنا دیا ہے۔ اب ہم دونوں کے کاغذات دیکھ کہ فیصلہ کریں گے۔ مسٹر سونڈ نے اس کے بعد گھر جا کر دونوں کے کاغذات کو دیکھا اور معاملہ کو اچھی طرح سمجھا۔ چند دن کے بعد انہوں نے صدفی صد مسلمان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

مذکورہ مسلمان اگر بندوق کو لے کر بھیڑ کے اوپر گولی چلاتے تو وہ بھیڑ کے نفس امارہ (انانیت) کو جگا دیتے۔ اور پھر یقینی طور پر سارا معاملہ مسلمان کے خلاف ہو جاتا۔ مگر جب انہوں نے گن کے بجائے معقولیت کو استعمال کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کا نفس لوّامہ (ضمیر) جاگ اٹھا۔ اور جب ضمیر جاگ اٹھے تو اس کا فیصلہ ہمیشہ انصاف کے حق میں ہوتا ہے، ضمیر کبھی ظلم اور بے انصافی کا فیصلہ نہیں کرتا۔

فتح بھی شکست ہے

شاہ پائرس (King Pyrrhus) تیسری صدی قبل مسیح کا ایک یونانی بادشاہ تھا۔ اس کی لڑائی رومیوں سے ہوئی۔ اس جنگ میں آخر کار شاہ پائرس کو رومیوں کے اوپر فتح حاصل ہوئی۔ مگر لڑائی کے دوران شاہ پائرس کی فوج اور اس کے ملک کی اقتصادیات بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ شاہ پائرس کے لیے یہ بظاہر فتح تھی، مگر وہ اپنے نتیجے کے اعتبار سے شکست کے ہم معنی تھی۔ اس تاریخی واقعہ کی بنا پر ایک اصطلاح مشہور ہوئی ہے جس کو پرک وکٹری (Pyrrhic Victory) کہا جاتا ہے، یعنی بظاہر فتح مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے مکمل شکست۔

جنگوں کی تاریخ کو دیکھا جائے تو یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اکثر فتح پرک فتح ہی ہوتی ہے۔ ہر فاتح کے حصہ میں دو نقصان کا پیش آنا لازمی ہے۔ ایک، جان اور مال کی تباہی۔ دوسرے، مفتوح کے دل میں فاتح کے خلاف نفرت۔ کوئی بھی فاتح ان نقصانات سے بچ نہیں سکتا۔ اگر فرق ہے تو صرف یہ کہ کوئی فاتح اس نقصان کو فوراً بھگتتا ہے، اور کسی فاتح کے حصہ میں یہ نقصان کسی قدر دیر کے بعد آتا ہے۔ نقصان کا یہ معاملہ صرف پُرتشدّد طریق کار کے ساتھ وابستہ ہے۔ پُرامن طریق کار کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ پُرامن طریق کار میں صرف فتح ہے، پُرامن طریق کار میں شکست کا کوئی سوال نہیں۔ حتیٰ کہ اگر پُرامن طریق کار کا نتیجہ بظاہر شکست کی صورت میں نکلے تب بھی وہ فتح ہے۔ اس لیے کہ پُرامن طریقِ کار کی صورت میں آدمی جنگ کو کھوتا ہے مگر وہ مواقع کو نہیں کھوتا۔ مواقع اور امکانات اب بھی اس کے پاس موجود ہوتے ہیں۔ وہ ان مواقع کو استعمال کر کے دوبارہ ایک نئی جدوجہد شروع کر سکتا ہے اور از سر نو اپنی کامیابی کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

شکایت کو فوراً ختم کرنا

شکایتی مزاج ایک قاتلانہ مزاج ہے۔ شکایتی مزاج آدمی کے اندر منفی سوچ پیدا کرتا

ہے۔ وہ آدمی کو مثبت سوچ سے محروم کردیتا ہے۔ اور اس قسم کا مزاج بلاشبہ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ اکثر تشدّد کے پیچھے شکایتی مزاج ہی کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

موجودہ دنیا کا تخلیقی نظام کچھ اس طرح بنا ہے کہ یہاں لازماً ایک کو دوسرے سے شکایت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ ایسے موقع پر کرنے کا کام یہ ہے کہ شکایت کا خیال آتے ہی فوراً اس کو اپنے دماغ سے نکال دیا جائے۔ شکایت جب پیدا ہوتی ہے تو پہلے وہ آدمی کے شعوری ذہن (conscious mind) میں ہوتی ہے۔ اگر اس کو یاد رکھا جائے یا بار بار دہرایا جائے تو وہ دھیرے دھیرے آدمی کے غیر شعوری ذہن (unconscious mind) میں چلی جاتی ہے۔ اور اس طرح بیٹھ جاتی ہے کہ اس کے بعد کسی طرح اس کو نکالا نہیں جاسکتا۔

ایسی حالت میں عقل مندی یہ ہے کہ شکایت کے معاملہ میں وہ ’’گربہ کشتن روزِ اوّل‘‘ کا معاملہ کیا جائے۔ شکایت پیدا ہوتے ہی اس کو فوراً ختم کردیا جائے۔ اگر پہلے ہی مرحلہ میں اس کو ختم نہ کیا جائے تو دھیرے دھیرے وہ آدمی کی نفسیات کا مستقل جزء بن جائے گی۔ وہ دوسروں کو اپنا دشمن سمجھ لے گا۔ اگر موقع ہو تو وہ دوسروں کے خلاف تشدّد پر اتر آئے گا۔ یہاں تک کہ وہ زیرِ شکایت لوگوں سے عملی ٹکراؤ شروع کردے گا، خواہ اس کا نتیجہ برعکس صورت میں کیوں نہ ظاہر ہو۔

شکایت کو پہلے ہی مرحلے میں ختم کرنے کا فارمولا کیا ہے، وہ فارمولا قرآن کے الفاظ میں یہ ہے: وَمَآ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ (42:30)۔ یعنی، جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی آپ کو دوسرے کے خلاف شکایت پیدا ہو تو فوراً آپ کو یہ کرنا چاہیے کہ شکایت کا رخ اپنی طرف کرلیں۔ معاملہ کی کوئی ایسی توجیہ ڈھونڈیں جس میں قصور

خود آپ کا نکلتا ہو۔ جب آپ کو احساس ہوگا کہ کوتاہی خود آپ کی ہے، نہ کہ کسی غیر کی تو ایسی حالت میں یہ ہوگا کہ آپ اپنی کوتاہیوں کو دور کرنے میں لگ جائیں گے، نہ کہ کسی مفروضہ دشمن کے خلاف فریاد اور احتجاج میں ضائع کریں گے۔

دہشت گردی کیا ہے

موجودہ زمانہ میں ایک برائی ظاہر ہوئی ہے جس کو دہشت گردی (terrorism) کہا جاتا ہے۔ دہشت گردی کو عام طور پر کنڈم کیا جاتا ہے مگر دہشت گردی کیا ہے، اس کی کوئی واضح تعریف غالباً ابھی تک سامنے نہ آسکی۔ قرآن وحدیث کے مطالعہ سے میں نے سمجھا ہے کہ دہشت گردی نام ہے، غیر حکومتی تنظیموں کا ہتھیار اٹھانا (armed action by NGOs)۔

اسلام کے متفقہ اصول کے مطابق، جنگ کا اعلان صرف ایک قائم شدہ حکومت کا کام ہے (اَلرَّحِیلُ لِلْإِمَامِ)۔ وہ چیز جس کو موجودہ زمانہ میں دہشت گردی کہا جاتا ہے، وہ سب کی سب غیر حکومتی تنظیموں کے مسلح اقدام کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہیں۔ اس قسم کی مسلح تحریک بلاشبہ اسلام میں ناجائز ہے۔ عوام کو پُرامن انداز میں اپنی بات کہنے کا حق ہے مگر کسی بھی عذر کی بنا پر مسلح تحریک چلانا عوام کے لیے ہرگز جائز نہیں۔

مزید یہ کہ قائم شدہ حکومت کے لیے بھی جنگی اقدام کی کئی لازمی شرطیں ہیں۔ مثلاً ایک قائم شدہ حکومت بھی صرف جنگ کر سکتی ہے، جارحانہ جنگ چھیڑنے کا حق حکومت کو بھی نہیں۔ اسی طرح ایک جائز جنگ بھی اعلان کے ساتھ لڑی جائے گی۔ بلا اعلان جنگ (undeclared war) کی کوئی گنجائش اسلام میں نہیں۔ اسی طرح ایک جائز دفاعی جنگ میں بھی حکومت صرف مقاتل (combatants) پر وار کر سکتی ہے، غیر مقاتل (non combatants) کو مارنا یا ان کو نقصان پہنچانا جنگ کی حالت میں بھی ہرگز جائز نہیں۔

ان حقیقتوں کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ اسلام میں جنگ کی صرف ایک قسم کا جواز ہے، اور وہ دفاعی جنگ ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی جنگ، مثلاً جارحانہ وار، پراکسی وار، گوریلا وار اور پھر بلا اعلان وار، یہ سب کی سب اسلام میں قطعی ناجائز ہیں۔ کسی بھی عذر کی بنا پر اس قسم کی جنگوں کو اسلامی جنگ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مذکورہ تعریف کے مطابق، دہشت گردی کی ہر تحریک یقینی طور پر ناجائز ہے، ایسی کسی تحریک کو اسلامی جہاد کا نام دینا اس کو جائز نہیں بناتا۔ ایسی ہر کوشش گناہ پر سرکشی کا اضافہ ہے، وہ یقینی طور پر ایسی کسی جنگ کا اسلامی جواز نہیں۔

کھلی مذمت ضروری

قرآن و حدیث میں اہل ایمان کو جو احکام دیے گئے ہیں ان میں سے ایک حکم وہ ہے جس کو انکار منکر کہا جاتا ہے۔ یعنی برائی ہو رہی ہو تو اس کو دیکھ کر چپ رہنا ایک سنگین جرم ہے۔ کسی آدمی کے لیے صرف یہ کافی نہیں کہ وہ براہ راست طور پر برائی میں شریک نہیں۔ اگر وہ برائی کو دیکھنے کے باوجود چپ رہے تو وہ بالواسطہ طور پر اس کا مجرم قرار پائے گا۔

مثلاً موجودہ زمانہ میں مسلمان جگہ جگہ جہاد کے نام پر وہ کر رہے ہیں جس کو ساری دنیا کا پریس دہشت گردی کے عنوان سے رپورٹ کرتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس معاملہ میں دنیا کے تقریباً تمام مسلمان خدا کی نظر میں مجرم ثابت ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے علم کے مطابق، ساری دنیا میں کوئی بھی قابل ذکر مسلمان نہیں جو تشدّد کی اس برائی کو کھلے طور پر کنڈم کرتا ہو۔

مسلمانوں کی ایک تعداد وہ ہے جو اس متشدّدانہ سرگرمی کو عین اسلامی جہاد قرار دیتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ خودکش بمباری (suicide bombing) کو استشہاد (طلب شہادت) کا نام دے کر اس کو عین درست بتاتی ہے۔ مسلمانوں کا دوسرا گروہ وہ ہے جو مذمت کے الفاظ

بولتا ہے مگر حقیقت میں وہ مذمت نہیں ہوتی۔ مثلاً وہ کہیں گے کہ اسلام میں دہشت گردی نہیں، اسلام دہشت گردی کی اجازت نہیں دیتا۔ مگر وہ یہ نہیں کہیں گے کہ فلاں فلاں مقام پر مسلمان جو متشدّدانہ تحریک چلا رہے ہیں وہ دہشت گردی ہے اور وہ اسلام کے خلاف ہے۔ ایسی حالت میں ان کی مذمت ایک خودفریبی کے سوا اور کچھ نہیں۔ مسلمانوں کا ایک اور گروہ ہے جو بظاہر نام لے کر مذمت کرتا ہے مگر اسی کے ساتھ وہ ایسے دفاعی الفاظ بھی بولتا ہے جس سے ثابت ہو کہ اس دہشت گردی کی اصل ذمہ داری مسلم دشمنوں کی ہے، نہ کہ خود مسلمانوں کی۔

مذمت کے یہ طریقے یقینی طور پر غیر اسلامی ہیں۔ مذمت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ نہ صرف دہشت گردی کو خلاف اسلام بتایا جائے بلکہ مختلف مقامات پر جہاد کے نام پر جو دہشت گردی ہو رہی ہے اس کو کھلے لفظوں میں رد کیا جائے اور کہا جائے کہ یہ جہاد نہیں ہے بلکہ فساد ہے۔ مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ کی یہی مجرمانہ خاموشی ہے جس کی بنا پر یہ ہو رہا ہے کہ جہاد کے نام پر ہونے والا تشدّد کسی طرح ختم نہیں ہوتا۔ اس مجرمانہ تشدّد میں خودساختہ مجاہدین اگر براہ راست شریک ہیں تو بقیہ مسلمان بالواسطہ طور پر اس میں شریک ہیں۔ اور اسلامی نقطہ نظر سے، براہ راست شریک اور بالواسطہ شرکت کے درمیان صرف ڈگری کا فرق ہے، ان کے درمیان نوعیت کا کوئی فرق نہیں۔

ناکامی کا کیس

امن کی طاقت تشدّد کی طاقت سے زیادہ ہے۔ مزید یہ کہ امن دانش مندوں کا طریقہ ہے اور تشدّد نادانوں کا طریقہ۔ ایسی حالت میں جب کوئی شخص تشدّد کرتا ہے تو وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے زیادہ طاقتور طریقہ استعمال کرنے میں ناکام رہا۔ اسی طرح ایسا آدمی اپنے متشدّدانہ عمل سے یہ بھی ثابت کر رہا ہے کہ وہ اپنے مسئلہ کو حل کرنے کے معاملہ میں ایک نادان آدمی ثابت ہوا، نہ کہ دانش مند آدمی۔

امن اورتشدّد سادہ طور پرصرف دوطریقے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ انسانیت کے دومختلف معیار ہیں۔امن کا طریقہ اختیار کرنے والا آدمی اپنی انسانیت کو بلند کرتا ہےاورتشدّد کا طریقہ اختیار کرنے والا آدمی اپنے آپ کو انسانیت کے اعلیٰ معیار سے نیچے گرالیتا ہے۔

کوئی مسئلہ پیش آنے کے بعد جب ایک آدمی امن کا طریقہ اختیار کرتا ہےتو وہ اپنے اندر مثبت سوچ کو فروغ دیتا ہے۔وہ اپنے اخلاقی معیار کو بلند کرتا ہے۔وہ اپنی شخصیت کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔وہ اپنے انسان ہونے کی حیثیت کو عملی طور پر ثابت شدہ بناتا ہے۔اس کے برعکس جب ایک آدمی اپنے مسئلہ کے حل کے لیے تشدّد کا طریقہ اختیار کرتا ہےتو وہ اپنے آپ کو انسانیت کے نچلے درجہ کی طرف لے جاتا ہے۔وہ اپنے انسان ہونے کی حیثیت کو عملی طور پر مشتبہ بنا رہا ہے۔

امن اورتشدّد دونوں کسی انسان کی اصل حیثیت کی پہچان ہیں۔ایک طریقہ اگر انسان کو انسان ثابت کرتا ہےتو دوسرا طریقہ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک حیوان تھا، اگرچہ ظاہری طور پر وہ ایک انسان دکھائی دے رہا تھا۔

مذہب خطرہ میں ہے

نفرت اورتشدّد کا ایک سبب وہ جذباتی سیاست ہے جو اس نعرہ پر چلتی ہے کہ مذہب خطرہ میں ہے۔ کچھ لکھنے اور بولنے والے لوگ غلط یا مبالغہ آمیز تصور پیش کرکے عوام کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ ان کا مذہب دوسروں کی طرف سے خطرہ میں ہے۔اب تحفظ مذہب کے نام پر جلسہ اور جلوس اور نعرے اور جھنڈے کی سیاست چل پڑتی ہے۔ یہ سیاست مذہب کو تو خطرہ سے نہیں بچاتی البتہ مذہب کو خطرہ سے بچانے کے نام پر پورے سماج کے امن کو تباہ کرکے اس کو خطرہ میں ڈال دیتی ہے۔

اگر مذہب خطرہ میں ہو تو ظاہر ہے کہ کوئی غیر ہوگا جو مذہب کو خطرہ میں ڈالے ہوئے

ہوگا۔اس طرح ”مذہب خطرہ میں“ جیسی سیاست ایک گروہ کے دل میں دوسرے گروہ کے خلاف نفرت پیدا کرتی ہے۔ پھر نفرت کی سیاست سے جب مذہب کے خلاف مفروضہ خطرہ ختم نہیں ہوتا تو اس کے بعد لوگوں کے اندر مایوسی کی سیاست شروع ہوتی ہے۔ مایوسی کی سیاست اپنی آخری تدبیر کے طور پر تشدّد کی سیاست جاری کر دیتی ہے۔ پھر جب تشدّد کی سیاست کارگر ثابت نہیں ہوتی تو خودکشی کی سیاست شروع ہوجاتی ہے۔ جوش میں بھرے ہوئے نوجوان اپنی بڑھی ہوئی نفرت کو اپنے مفروضہ دشمن کے خلاف خودکش بمباری کی صورت میں انڈیل دیتے ہیں۔ مذہبی خطرہ کی سیاست اپنی آخری حد پر پہنچ کر مذہبی خودکشی کی سیاست بن جاتی ہے۔ زندگی کے نام پر اٹھنے والے لوگ یہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے صرف موت کا پیغام ثابت ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس تباہ کن سیاست سے نکلنے کا واحد حل یہ ہے کہ تشدّد کو ایک ایسا فعل قرار دیا جائے جو ہر حال میں قابل ترک ہو۔ کوئی بھی عذر، خواہ وہ بظاہر کتنا ہی بڑا ہو، تشدّد کے طریقہ کو استعمال کرنے کے لیے کافی نہ سمجھا جائے۔

موجودہ دنیا اختلافات کی دنیا ہے۔ ہر آدمی مسٹر ڈفرنٹ اور ہر عورت مزڈفرنٹ ہے۔ اس لیے اس دنیا میں لازمی طور پر لوگوں کے درمیان طرح طرح کے اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ یہی اختلاف جذباتی صورت اختیار کر کے لوگوں کو نفرت اور تشدّد تک پہنچاتا ہے۔ اور پھر سارا سماج قبرستان کا نمونہ بن جاتا ہے۔

اس مسئلہ کا ایک ہی حل ہے۔ اور وہ یہ کہ لوگوں کے اندر یہ ذہن بنایا جائے کہ تم کو ہر حال میں امن کے دائرے میں کام کرنا ہے۔ کسی بھی حال میں تم کو امن کے دائرے سے باہر نہیں جانا ہے۔ یہ ذہن اس وقت بن سکتا ہے جب کہ لوگوں کو اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ کیا جائے کہ اس دنیا میں کوئی کام صرف امن کے ذریعہ بنتا ہے، تشدّد کے

ذریعہ کبھی کوئی کام بننے والا نہیں۔ تشدّد صرف تخریب میں معاون ہوتا ہے، تشدّد کبھی تعمیر میں معاون نہیں ہوتا۔

"مذہب خطرہ میں" جیسی سیاست کے ذریعہ کا یہ فائدہ تو ہوتا ہے کہ کچھ ہائی پروفائل میں بولنے والے قائد بن کر ابھر آئیں۔ وہ وقتی طور پر لوگوں میں نمایاں ہو جائیں۔ ان کے گرد عوام کی بھیڑ اکٹھا ہو۔ مادّی رونقیں انہیں حاصل ہو جائیں۔ مگر جہاں تک مذہب اور اہل مذہب کا تعلق ہے، ان کے حصے میں صرف یہ آتا ہے کہ معتدل ماحول سے محروم ہو کر وہ نفرت کے ماحول میں جینے پر مجبور ہو جائیں۔ تشدّد کا شکار ہو کر وہ اپنے مستقبل کو غیر محفوظ بنا لیں۔

مذکورہ قسم کی سیاست کا آخری نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ کچھ افراد ممتاز افراد (celebrities) بن کر نمایاں ہو جائیں۔ مگر یہ طریقہ مثبت معنوں میں قوم کی تعمیر نہیں کرتا اور نہ کر سکتا ہے۔ یہ طریقہ لیڈر سازی کے لیے کارآمد ہے، مگر وہ ملت سازی کے لیے ہرگز کارآمد نہیں۔

انتقام سے تشدّد تک

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص کو دوسرے شخص سے کوئی تکلیف پہنچ جائے یا ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طرف سے کوئی ٹھیس پہنچے تو فوراً ان کے اندر انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ وہ فریق ثانی سے انتقام لینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ تاریخ کی اس وارننگ کو بھول جاتے ہیں جو ہر جگہ خاموش الفاظ میں گونج رہی ہے۔ انتقام لینے سے پہلے سوچ لو کہ انتقام کا بھی انتقام لیا جائے گا۔

چنانچہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک فریق دوسرے فریق کے خلاف انتقام کی کارروائی کرتا ہے۔ پھر دوسرا فریق دوبارہ پہلے فریق سے انتقام لیتا ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے جو صرف اس وقت ختم ہوتا ہے جبکہ دونوں اتنے تباہ ہو جائیں کہ وہ مزید انتقام لینے کے

قابل نہ رہیں۔ کسی فرد یا گروہ کے خلاف کوئی قابل شکایت بات پیش آئے تو اس کا حل جوابی کارروائی نہیں ہے بلکہ اس کو درگزر کرکے آگے بڑھ جانا ہے۔ درگزر کرنے سے معاملہ پہلے ہی مرحلے میں ختم ہوجاتا ہے۔اور اگر درگزر نہ کیا جائے تو نفرت اور انتقام اور تشدّد کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

انتقام کا رخ دوسرے کے خلاف ہوتا ہے مگر اس کا سب سے زیادہ شکار خود انتقام لینے والا بنتا ہے۔ انتقامی پالیسی کی بھاری قیمت اس کو یہ دینی پڑتی ہے کہ اس کا دماغ منفی سوچ کا کارخانہ بن جائے۔ وہ اپنے وسائل کو اپنی تعمیر میں صرف کرنے کے بجائے انہیں صرف دوسرے کی تخریب میں صرف کرنے لگے۔ دوسرے فریق نے اگر آپ کو پچاس فی صد نقصان پہنچایا تھا تو اپنی انتقامی کارروائی کے نتیجے میں اپنی بقیہ پچاس فی صد طاقت کو بھی ضائع کردیتے ہیں۔

انتقام کا مطلب یہ ہے کہ قاتلانہ حملہ کے بعد کوئی شخص خود اپنے آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ انتقام ہر حال میں برا ہے اور انتقام نہ لیتے ہوئے معاملہ کو بھلادینا ہر حال میں اچھا ہے۔ انتقام لینے والا اگر آپ کا دشمن تھا تو انتقام لے کر آپ خود اپنے دشمن بن جاتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنے دشمن آپ بن جائیں ان کو تباہی سے کون بچاسکتا ہے۔

جنگ کا زمانہ ختم

وسیع تر تقسیم میں جنگ کے دو دور ہیں۔ ایک وہ ابتدائی دور جب کہ جنگی مقابلہ کا فیصلہ تلوار کے ذریعہ ہوتا تھا۔ دوسرا دور جدید دور ہے کہ لڑائی میں بم کی طاقت استعمال کی جاتی ہے۔ دونوں دوروں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ کہ تلوار جب چلائی جاتی تھی تو وہ صرف ایک دشمن کی گردن کو کاٹتی تھی۔ اب بم کے زمانے میں جنگ کا مطلب یہ نہیں۔ اب جنگ کا

مطلب صرف تباہی ہے۔ جو بم دشمن کے اوپر ڈالا جاتا ہے وہ مختلف پہلوؤں سے خود ڈالنے والے کے لیے بھی تباہی کا سبب بنتا ہے۔ ایسی حالت میں جنگ ایک بے فائدہ عمل بن چکی ہے۔ اب جنگ ایک دیوانگی ہے، نہ کہ کسی مقصد کے حصول کے لیے اقدام۔

حقیقت یہ ہے کہ نئے ہتھیاروں کے ظہور کے بعد جنگ اب ایک قابل ترک چیز بن چکی ہے۔ جب جنگ مثبت معنوں میں بے نتیجہ ہو جائے تو ایسی حالت میں جنگ چھیڑنا ایک دیوانگی ہے، نہ کہ عقل مندی۔

زمانہ کے خلاف

موجودہ زمانہ گلوبلائزیشن (globalization) کا زمانہ ہے۔ ساری دنیا ایک گلوبل ویلیج کی مانند ہو گئی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو موجودہ زمانے میں تشدّد یا مسلح جدو جہد ایک ایسی چیز بن چکی ہے جو زمانہ کے خلاف عمل (anachronism) کی حیثیت رکھتی ہے۔

موجودہ زمانے میں جو لوگ ہتھیار کی لڑائی لڑ رہے ہیں ان سے پوچھئے کہ وہ کیوں جنگ کر رہے ہیں تو وہ بتائیں گے کہ قائم شدہ حکومت کو بدلنے کے لیے وہ جنگ کر رہے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ ہم ایک نیا نظام بنانا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے حکومت پر قبضہ کرنا ضروری ہے۔ مگر یہ بات صرف زمانے سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

موجودہ زمانے میں ایسی تبدیلیاں ہو چکی ہیں کہ اب کسی حکومت پر قبضہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ حکومت پر قبضہ کیے بغیر ہر وہ کام کر سکتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

برداشت کی ضرورت

عدم برداشت کا نتیجہ تشدّد ہے۔ اور برداشت کا نتیجہ امن۔ انہی دو لفظوں میں امن اور

تشدّد کا خلاصہ پایا جاتا ہے۔جس سماج میں برداشت کی صفت ہو، اس سماج میں امن کا ماحول رہے گا۔ اور جس سماج کے لوگوں میں برداشت کا مزاج نہ ہو وہاں تشدّد ہونے لگے گا۔ اور تشدّد، نہ تشدّد کرنے والے کے لیے مفید ہے اور نہ ان لوگوں کے لیے مفید جن کے اوپر تشدّد کیا گیا ہے۔

برداشت ایک اعلیٰ اخلاقی اور انسانی صفت ہے۔ اس کے مقابلے میں برداشت نہ کرنا ایک حیوانی صفت ہے۔ برداشت مجبوری نہیں، برداشت ایک اعلیٰ ترین عمل ہے۔ لوگ جس مقصد کو بے برداشت طور پر حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس کو برداشت کے ذریعہ زیادہ بہتر طور پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔

کوئی ناخوش گوار صورت حال پیش آنے پر آدمی جب بے برداشت ہوجائے تو وہ اپنے آپ کو مقابلہ کے لیے کمزور کرلے گا۔لیکن جب وہ ناخوش گوار صورت حال میں برداشت کے رویہ پر قائم رہے تو وہ اپنی ساری طاقتوں کو محفوظ رکھتا ہے۔ وہ زیادہ مؤثر طور پر پیش آمدہ صورت حال کا مقابلہ کرسکتا ہے۔

ناخوش گوار صورت حال پیش آنے کے باوجود بے برداشت نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی اپنے آپ پر کنٹرول کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اور جس آدمی کے اندر یہ طاقت ہو کہ وہ اپنے آپ پر کنٹرول کرسکے، وہ اتنا زیادہ طاقتور ہوجاتا ہے کہ کسی کے لیے بھی اس کو شکست دینا ممکن نہیں۔

امن کے فائدے

دنیا کے تمام اچھے کام پُرامن کوشش کے ذریعہ ہوئے ہیں۔تشدّد کی طاقت سے کبھی کوئی اچھا کام نہیں ہوا۔ کوئی پُل، کوئی سڑک کبھی بھی تشدّد کی طاقت سے نہیں بنے۔ سائنس کی دریافتیں اور ٹکنالوجی کی ترقیاں کبھی تشدّد کی طاقت سے ظہور میں نہیں آئیں۔

تعلیم گاہیں اور تحقیق کے ادارے کبھی تشدّد کی طاقت سے نہیں بنے۔ لوہے کا مشین میں ڈھلنا یا سٹی پلاننگ جیسے کام امن کے ذریعہ انجام پائے، نہ کہ تشدّد کے ذریعہ۔ سماجی فلاح سے لے کر انفراسٹرکچر تک ہر کام ہمیشہ پُرامن تدبیروں کے ذریعہ تکمیل پذیر ہوئے ہیں۔

تشدّد ایک تخریبی عمل ہے۔ اور ایک تخریبی عمل کے ذریعہ کبھی کوئی تعمیری واقعہ ظاہر نہیں ہوسکتا۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ اور فطرت کے قانون میں تبدیلی ممکن نہیں۔

مسلم پالیسی کو بدلنے کی ضرورت

اپریل 2002ء کے آخری ہفتہ میں مکہ میں رابطہ عالم اسلامی کی چوتھی عالمی کانفرنس ہوئی۔ اس میں مختلف ملکوں کے مسلم علما اور دانشور تقریباً پانچ سو کی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس کا موضوع ''اسلام اور گلوبلائزیشن'' بتایا گیا۔ اس کانفرنس کی ایک رپورٹ لاہور کے ماہنامہ محدث (مئی 2002) میں دیکھی۔ اس کا ایک حصہ یہاں کسی قدر تصرف کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے۔

بوسنیا کے رئیس العلما مصطفیٰ سیرچ نے سابق صدر بوسنیا عزت بیگووچ کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ ہم بوسنیا کے تلخ تجربہ کی روشنی میں یہ کہنا مناسب سمجھتے ہیں کہ عربوں کو اسرائیل سے صلح وآشتی کا راستہ اختیار کرلینا چاہیے۔ دکتور یوسف القرضاوی فوراً مائیک پر آئے اور نہایت شدید الفاظ میں عزت بیگوچ کے اس نظریہ کی تردید کی۔ رپورٹ کے مطابق، بظاہر پوری کانفرس میں کوئی شخص بھی عزت بیگوچ کی حمایت میں بولنے کے لیے کھڑا نہیں ہوا (صفحہ 54)۔

جس زمانے میں عزت بیگوچ نے بوسنیا کے آزاد مسلم مملکت ہونے کا اعلان کیا اور اس کے نتیجے میں وہاں خونی جنگ چھڑ گئی، اس وقت ساری مسلم دنیا میں عزت بیگووچ ہیرو بن گئے۔ مگر آج یہی عزت بیگووچ جب امن اور صلح کی بات کرتے ہیں تو اب وہ مسلمانوں کے

یہاں زیرو بنے ہوئے ہیں۔اس واقعہ پر غور کیجیے تو کچھ سبق آموز باتیں سامنے آئیں گی۔

1۔ موجودہ زمانے کے مسلمان محصور ذہنیت (besieged mentality) میں جی رہے ہیں۔ان کے نااہل دانشوروں اور لیڈروں نے انہیں یہ بتا رکھا ہے کہ وہ مظلوم ہیں اور دشمنوں کی سازش کا شکار ہو رہے ہیں۔جو لوگ ایسی نفسیات میں مبتلا ہوں ان کا حال یہ ہوگا کہ وہ لڑائی کی زبان تو سمجھیں گے مگر وہ صلح کی زبان سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔

2۔ مسٹر عزت بیگووچ نے جو پیغام بھیجا وہ ایک ادھورا پیغام تھا۔اس بنا پر وہ کسی کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔عزت بیگووچ کا پیغام اپنی موجودہ شکل میں صرف مجبوری کے ہم معنی ہے۔اور کوئی بھی مسلمان مجبوری کے تحت کسی پالیسی کو اختیار کرنے پر راضی نہیں ہوگا۔عزت بیگووچ کو چاہیے کہ وہ مسلح اقدام کے بجائے پُرامن اقدام کا طریقہ دریافت کریں۔اس کے بعد لوگوں کے لیے ان کا پیغام قابل قبول بن جائے گا۔

3۔ مکہ کی کانفرنس کی روداد دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں بولنے والے تمام مسلمان صرف شکایت اور احتجاج کی بولی بولتے رہے، وہ مسائل پر تقریریں کرتے رہے۔یہی موجودہ زمانے میں تمام مسلم کانفرنسوں کا حال ہے۔ہر کانفرنس میں صرف مسائل کا پر شور تذکرہ ہوتا ہے۔علما اور دانشوروں کے اس مزاج نے موجودہ زمانے کی تمام مسلم کانفرنسوں کو سراسر بے نتیجہ بنا دیا ہے۔کانفرنس کا مقصد مواقع کار کی مثبت نشاندہی ہونا چاہیے، نہ کہ مسائل کے نام پر منفی چیخ وپکار، قرآن کے الفاظ میں، عسر میں یسر کی نشاندہی۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے جب نبوت کے تیرھویں سال مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو اس وقت آپ مسائل کے جنگل سے گذر کر وہاں پہنچے تھے۔مدینہ پہنچ کر آپ نے

وہاں کے لوگوں کے سامنے جو پہلا خطبہ دیا وہ ابن ہشام نے اس عنوان کے ساتھ نقل کیا ہے:

أَوَّلُ خُطْبَةٍ خَطَبَهَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي الْمَدِينَةِ (رسول اللہ ﷺ کا پہلا خطبہ جو آپ نے مدینہ میں دیا)۔

یہ پورا خطبہ سیرت ابن ہشام میں آج بھی موجود ہے۔ اس کو پڑھیے تو اس میں ایک لفظ بھی شکایت اور احتجاج کا نہیں ملے گا۔ اس پورے خطبہ کا خلاصہ ان کے اس جملہ میں ہے: فَمَنْ اسْتَطَاعَ أَنْ يَقِيَ وَجْهَهُ مِنْ النَّارِ وَلَوْ بِشِقٍّ مِنْ تَمْرَةٍ فَلْيَفْعَلْ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 501-500)۔ یعنی، اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ کیوں نہ ہو۔

عجیب بات ہے کہ اسی رسول کے امتی آج رسول کی سنت کے برعکس شکایت اور احتجاج کی سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔ حتیٰ کہ مکہ اور مدینہ میں بھی یہی خلاف سنت کام نہایت دھوم کے ساتھ جاری ہے۔ کوئی اللہ کا بندہ اگر انہیں اس روش کو ترک کرنے کی نصیحت کرے تو وہ اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی خلاف سنت سرگرمیاں بلاشبہ خدا کے غضب کو دعوت دینے والی ہیں، خواہ یہ سرگرمیاں مقدس مقامات پر کیوں نہ کی جارہی ہوں۔

اصل یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے انسانوں کا ظلم نہیں ہے بلکہ وہ براہ راست اللہ تعالیٰ کا انتباہ ہے۔ یہ سب مسلمانوں کو چوکنا کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے لیے فلاح کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ توبہ کریں۔ وہ تشدّد کا راستہ مکمل طور پر چھوڑیں اور امن کا راستہ مکمل طور پر اختیار کرلیں۔ اسلام یا اہل اسلام کے نام پر وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس کو امن کے دائرہ میں رہتے ہوئے انجام دیں۔ اس کے سوا ان کے لیے فلاح اور کامیابی کی کوئی صورت نہیں۔

متفرق مسائل

ہجر جمیل

قرآن کی سورہ نمبر 73 میں ایک حکم ان الفاظ میں آیا ہے: وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (73:10)۔ اردو مترجمین نے اس آیت کے جو ترجمے کیے ہیں ان میں سے چند یہاں نقل کیے جاتے ہیں

1۔ اور سہتا رہ جو کہتے رہیں اور چھوڑ ان کو بھلی طرح کا چھوڑنا (شاہ عبدالقادر)

2۔ اور یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ۔ (اشرف علی تھانوی)

3۔ اور یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور ان کو خوبصورتی سے نظر انداز کر۔ (امین احسن اصلاحی)

اس آیت کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا جائے تو وہ اس طرح ہوگا۔

Endure patiently whatever they say, and avoid them in a decent manner.

قرآن کی آیت مکی دور میں اتری۔ اسوقت مکہ میں مشرکین کا غلبہ تھا۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ رسول اور اصحاب رسول نے ان کے آبائی دین سے انحراف کیا ہے۔ اس بنا پر وہ لوگ رسول اور اصحاب رسول کو ستانے لگے۔ انھوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائیں۔ اس ماحول میں قرآن کی یہ آیت اتری۔ اس میں خدا کی طرف سے حکم دیا گیا کہ تم لوگ صبر کرو اور ہجر جمیل کا طریقہ اختیار کرو۔

ہجر جمیل کے لفظی معنی ہیں۔خوبصورتی کے ساتھ چھوڑنا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ستانے والوں کے ساتھ حسن اعراض کا طریقہ اختیار کرو۔ان کے معاملے میں تمہارا طریقہ منفی ردعمل کا طریقہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ مثبت ردعمل کا طریقہ ہونا چاہیے۔تم کو چاہیے کہ ان کے

معاملے میں درگزر کرو اور انکے برے انداز کے مقابلے میں تم ان کے ساتھ اچھا انداز اختیار کرو۔

مفسرین نے عام طور پر لکھا ہے کہ صبر اور ہجر جمیل کا یہ حکم آیات قتال کے نزول کے بعد منسوخ ہو گیا۔ مگر یہ ایک غلط تفسیر ہے۔ ہجر جمیل (حسن اعراض) کوئی مجبوری کا فعل نہیں ہے، یہ اہل ایمان کا ایک مثبت رویہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن منفی ردعمل کا تحمل نہیں کرسکتا۔ شکایت کی نفسیات شکر کے جذبہ کی قاتل ہے۔ اس لیے مومن یک طرفہ طور پر شکایت کے جذبات کو ختم کرتا ہے۔ تا کہ اس کے اندر شکر کا جذبہ مجروح نہ ہونے پائے۔ اسی طرح نفرت کی نفسیات محبت کے جذبہ کی قاتل ہے اس لیے مومن نفرت کی نفسیات کو اپنے اندر پنپنے نہیں دیتا تا کہ اس کے اندر محبت الٰہی کا جذبہ پوری طرح باقی رہے۔ اس کام کو کبھی سختی سے کرنا پڑتا ہے اور کبھی حسن تدبیر سے۔

ہجر جمیل (حسن اعراض) بظاہر دوسرے کے مقابلے میں ہوتا ہے مگر اس کا تعلق خود اپنی ذات سے ہے۔ مومن آخری حد تک یہ چاہتا ہے کہ اس کے اندر اعلیٰ اسلامی احساس ہمیشہ زندہ رہے۔ کسی بھی حال میں اس کے اندر نقصان (erosion) نہ ہونے پائے۔

قرآن کے مطابق، اللہ نے کسی انسان کے اندر دو دل نہیں بنائے (33:4)۔ یعنی، انسان کے دل میں بیک وقت دو متضاد نفسیات پرورش نہیں پا سکتیں۔ جو دل انسان سے نفرت کرے، عین اسی وقت وہ خدا سے محبت نہیں کرسکتا۔ جس دل کے اندر انسانوں کے بارے میں شکایات بھری ہوئی ہوں وہ دل کبھی خدا کے شکر سے سرشار نہیں ہوسکتا۔ جس آدمی کا سینہ انتقامی نفسیات کا جنگل بنا ہوا ہو وہ خدا سے طلب عفو کی لذت کا تجربہ نہیں کرسکتا۔ جو انسان ظلم کی یادوں میں جی رہا ہو وہ خدائے رحمن اور رحیم کی یادوں کا تجربہ نہیں کرسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ صبر اور حسن اعراض مومن کے لیے ایک خود حفاظتی تدبیر ہے۔ یہ اپنے آپ کو اس سے بچانا ہے کہ اس کے سینے میں غیر مومنانہ نفسیات کی پرورش ہونے لگے۔ اس لیے جب بھی ایسا کوئی موقع پیش آتا ہے تو مومن کہہ اٹھتا ہے کہ میں اس قسم کی

منفی سوچ کا تحمل نہیں کرسکتا۔ یہاں اس معاملے کی مزید وضاحت کے لیے رسول اور اصحاب رسول کی زندگی سے اعراض کی کچھ عملی مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

1۔ ابن اسحق کی روایت ہے کہ مکہ کے قریش رسول اللہ ﷺ کی ہجو کرتے تھے اور سب وشتم کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے آپ کا نام محمد کے بجائے مذمّم رکھ دیا تھا۔ محمد کا مطلب ہے، تعریف کیا ہوا۔ اس کے بجائے وہ آپ کو مذمّم (مذمت کیا ہوا) کہتے تھے۔ روایت کے مطابق، رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا:

> أَلَا تَعْجَبُونَ لِمَا صَرَفَ اللَّهُ عَنِّي مِنْ أَذَى قُرَيْشٍ، يَسُبُّونَ وَيَهْجُونَ مُذَمَّمًا وَأَنَا مُحَمَّدٌ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 6)۔ یعنی، کیا تم کو تعجب نہیں کہ اللہ نے مجھے قریش کی اذیت سے کس طرح بچالیا، وہ سب وشتم کرتے ہیں اور مذمّم کہہ کر ہجو کرتے ہیں، حالاں کہ میں محمد ہوں۔

پیغمبر اسلام کے اس قول کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ مثلاً قریش اگر یہ کہیں کہ — "مذمّم مجنون ہے" تو رسول اللہ اس کا برا اثر نہ لیتے ہوئے یہ کہہ دیں گے کہ تمہاری یہ بات اس کے اوپر پڑے گی جس کا نام مذمّم ہو، میرا نام تو محمد ہے۔ یہ حسن اعراض کی ایک لطیف مثال ہے۔ اس طرح مومن اپنے آپ کو نقصان سے بچاتا ہے کہ کسی کی بدگوئی اس کے اندر منفی نفسیات پیدا کرنے کا سبب بن جائے۔ مومن کا قول یہ ہوتا ہے کہ میں منفی جذبات کا تحمل نہیں کرسکتا۔

اس طرح کے حسن اعراض کی ایک دلچسپ مثال ڈاکٹر ذاکر حسین کے یہاں پائی جاتی ہے۔ ایک بار وہ دہلی کی ایک سڑک پر اپنی گاڑی چلا رہے تھے، اتفاق سے ان کی گاڑی ایک اور شخص کی گاڑی سے معمولی طور پر ٹکرا گئی۔ ان کی گاڑی میں رگڑ (dent) آ گیا۔ اس آدمی نے ذاکر صاحب کی طرف روک کر اترا۔ ذاکر صاحب بھی اپنی گاڑی روک کر اتر گئے۔ اس آدمی نے ذاکر صاحب کی طرف غصہ سے دیکھتے ہوئے کہا کہ ایڈیٹ (idiot)۔ اس

انگریزی لفظ کے معنی ہوتے ہیں، احمق۔ ذاکر صاحب نے جوابی غصہ نہیں دکھایا۔ انہوں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے نرمی سے کہا:

Sir, I am not Mr. Idiot, I am Zakir Husain.

جناب، میں مسٹر ایڈیٹ نہیں ہوں۔ میں ذاکر حسین ہوں۔ یہ سن کر اس آدمی کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ ساری (sorry) کہہ کر وہ خاموشی کے ساتھ اپنی گاڑی پر بیٹھا اور آگے کے لیے روانہ ہو گیا۔

2۔ ہجرت کے بعد حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا۔ مکہ کے سرداروں نے رسول اللہ ﷺ کو اور آپ کے صحابہ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اس وقت حدیبیہ کے مقام پر دونوں فریقوں کے درمیان ایک معاہدۂ امن تیار کیا گیا۔ اس معاہدہ کے وقت قریش نے ضد کا مظاہرہ بھی کیا اور تشدّد کا مظاہرہ بھی۔ انہوں نے اصرار کیا کہ ان کی یک طرفہ شرطوں پر معاہدہ کیا جائے۔ اصحاب رسول کو اس سے بے حد تکلیف ہوئی۔ اس طرح کی شرطوں پر معاہدہ کرنا ان کو بظاہر ذلت کا معاہدہ معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ — قریش آج جو خاکہ بھی پیش کریں گے، بشرطیکہ اس میں صلہ رحمی کو ملحوظ رکھا گیا ہو، میں ضرور اس پر راضی ہو جاؤں گا (سیرت ابن ہشام، جلد 3، صفحہ 358)۔ دشمن کی یک طرفہ شرطوں کو ماننا ایک سخت ناگوار معاملہ تھا۔ مگر آپ نے مذکورہ بات کہہ کر اس ناگوار کو ایک گوارا معاملہ بنالیا۔

رسول اللہ ﷺ کا یہ قول ہجر جمیل کی ایک حکیمانہ مثال ہے۔ قدیم عربوں کے نزدیک صلہ رحمی بہت بڑی انسانی قدر سمجھی جاتی تھی۔ اور قطع رحمی کو وہ بہت برا سمجھتے تھے۔ اس لیے اس کا سوال ہی نہ تھا کہ وہ معاہدہ کے لیے ایسا خاکہ پیش کریں جس میں قطع رحم کی دفعہ رکھی گئی ہو۔ باعتبار حقیقت رسول اللہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہر قیمت پر قریش سے صلح کرلوں گا۔ اس بات کو کہنے کے باعزت طریقہ کے طور پر آپ نے فرمایا کہ میں قریش کی طرف سے صلح کے ہر خاکہ کو منظور کرلوں گا بشرطیکہ اس میں قطع رحم نہ پایا جاتا ہو۔ حالاں کہ پیشگی طور پر یہ معلوم تھا کہ وہ قطع رحم کی شرط کبھی نہیں رکھیں گے۔

3۔رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تو جلد ہی یہاں کے باشندوں کی اکثریت اسلام میں داخل ہوگئی۔اس وقت مدینہ میں ایک شخص تھا جس کا نام عبداللہ بن ابی تھا۔وہ اپنے زمانہ کا ایک بڑا لیڈر تھا۔وہ بھی اگرچہ اپنے قبیلہ والوں کے ساتھ اسلام میں داخل ہو گیا مگر اس کے دل میں رسول اللہ ﷺ کے خلاف حسد کا جذبہ تھا، جس کی وجہ سے وہ اکثر آپ کے خلاف شر انگیز باتیں کیا کرتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے اس معاملہ کا ذکر مدینہ کے ایک مسلمان اسید بن حضیر سے کیا۔ انہوں نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، ارْفُقْ بِهِ، فو اللّٰه لَقَدْ جَاءَنَا اللّٰهُ بِكَ، وَإِنَّ قَوْمَهُ لَيَنْظِمُونَ لَهُ الْخَرَزَ لِيُتَوِّجُوهُ، فَإِنَّهُ لَيَرَى أَنَّكَ قَدْ اسْتَلَبْتَهُ مُلْكًا (سیرت ابن ہشام، جلد 3، صفحہ 336)۔یعنی، اے خدا کے رسول، اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیجیے، خدا کی قسم، اللہ آپ کو ہمارے پاس لے آیا اور اس کی قوم کے لوگ اس کے لیے تاج تیار کر رہے تھے تاکہ وہ اس کو اپنا بادشاہ بنائیں۔وہ محسوس کرتا ہے کہ آپ نے اس کا مقام اس سے چھین لیا ہے۔

یہ حسن اعراض کی ایک حکیمانہ مثال ہے۔ایک صورت یہ تھی کہ عبداللہ بن ابی کی شر انگیزی کا جواب سختی کے ساتھ دیا جاتا۔صحابی نے گویا اپنے جواب میں یہ بتایا کہ اس معاملہ میں سختی کی ضرورت نہیں۔حسن اعراض ہی اس مسئلہ کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے۔

4۔اوپر ہجر جمیل کی وہ مثالیں ہیں جو سطوریں ہوتی ہیں۔اب ایک بین السطور کی مثال لیجیے۔جب کسی معاملہ میں ہجر جمیل کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اس میں ایک اور بات پوشیدہ ہوتی ہے جو اگرچہ زبان سے بولی نہیں جاتی مگر وہ حقیقی مطلوب کے طور پر اس میں شامل رہتی ہے۔اس کی ایک مثال حدیبیہ کا معاہدہ ہے۔

حدیبیہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ نے دو ہفتہ قیام فرمایا۔اس دوران قریش نے

مختلف قسم کی زیادتیاں کیں۔ مثلاً ایک صحابی کو تنہا پا کر انہیں تیر مار کر ہلاک کر دیا۔ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ باجماعت نماز ادا کر رہے تھے، اتنے میں قریش کے کچھ لوگ آئے اور آپ پر تیر برسانے لگے۔

اس طرح کی اشتعال انگیز صورت حال کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش سے دس سال کا امن معاہدہ کرلیا۔ اس معاہدہ کی دفعات حضرت عمر پر سخت نا گوار تھیں۔ وہ حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور کہا:

يَا أَبَا بَكْرٍ أَلَيْسَ برَسُول اللّٰه قَالَ: بلَى

قَالَ: أَو لسنا بِالْمُسْلِمين؟ قَالَ: بلَى

قَالَ أَو لَيْسُوا بِالْمُشْرِكِينَ؟ قَالَ: بَلَى

قَالَ: فَعَلَامَ نُعْطِي الدَّنِيَّةَ فِي دِينِنَا

(السيرة النبوية لابن كثير، جلد 3، صفحہ 320)۔

یعنی اے ابوبکر، کیا محمد اللہ کے رسول نہیں، انہوں نے کہا ہاں۔ عمر نے کہا کہ کیا ہم مسلمان نہیں، انہوں نے کہا کہ ہاں۔ عمر نے کہا کہ کیا وہ مشرک نہیں، انہوں نے کہا کہ ہاں۔ عمر نے کہا کہ پھر ہم اپنے دین میں ذلت کیوں گوارا کریں۔ روایات کے مطابق، حضرت عمر نے یہی بات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی کہی۔

یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش کی زیادتیوں کے باوجود ان کی یک طرفہ شرطوں پر دس سال کا جو امن معاہدہ کیا تھا، وہ ایک نہایت اہم اسلامی مصلحت کی بنا پر تھا۔ اور وہ مصلحت یہ تھی کہ دشمن سے معاہدۂ امن کر کے معتدل حالات پیدا کیے جائیں تا کہ اسلامی دعوت کا عمل مؤثر طور پر جاری ہو سکے۔ مگر یہ نصیحت نہ امن معاہدہ کے اندر لکھی گئی اور نہ حضرت عمر اور دوسرے صحابہ کی شدید نا گواری کے باوجود آپ نے حدیبیہ کے مقام پر اس کا اعلان کیا۔

یہ ہجر جمیل (حسن اعراض) کا دوسرا پہلو ہے۔ یہ دوسرا پہلو ہمیشہ مخفی حالت میں ہوتا ہے۔ اس پہلو کو لفظوں میں پانا ممکن نہیں۔ اگر اس کو لفظوں میں لکھا یا بولا جائے تو اس کی ساری معنویت ختم ہو جائے گی۔

ایسی حالت میں لوگوں کے لیے صرف دو میں سے ایک رویہ درست ہے۔ یا تو وہ اتنا زیادہ ہوش مند ہوں کہ سطور کے اندر بین السطور کو پڑھ لیں۔ وہ اعلان کے بغیر اس کی اہمیت کو دریافت کرلیں۔ جن لوگوں کے اندر اتنی ہوش مندی نہیں ہے ان کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ اپنے لیڈر کی بصیرت پر اعتماد کریں۔ وہ صرف اعتماد اور حسن ظن کی بنا پر یہ عقیدہ رکھیں کہ ان کے رہنما نے جو بات کہی ہے اس کے پیچھے ضرور کوئی گہری مصلحت ہوگی۔ ہمارا کام اپنے رہنما کی اتباع کرنا ہے، نہ کہ اس کی دیانت داری (integrity) پر شک کرنا۔

5۔ صلح حدیبیہ بظاہر ایک ایسی صلح تھی جو دشمن کے مقابلے میں دب کر کی گئی۔ مگر اس کے اندر ایک غیر اعلان شدہ مقصد چھپا ہوا تھا اور وہ تھا ٹکراؤ کو اوائڈ کرکے اپنے لیے وقفۂ تعمیر حاصل کرنا۔ اگر یہ بات معاہدہ کے متن میں لکھ دی جاتی یا رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے درمیان اسی وقت اس کا اعلان کر دیتے تو صلح کے مقاصد سرے سے فوت ہو جاتے۔ اس قسم کے مقاصد ہمیشہ اعلان کے بغیر ہوتے ہیں، نہ کہ اعلان کے ساتھ۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ خاموش رہے۔ یہاں تک کہ بعد کو جب اس کا عملی نتیجہ ظاہر ہو گیا، اس وقت لوگوں نے جانا کہ اس صلح کے اندر کتنی بڑی مصلحت چھپی ہوئی تھی۔

یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابوبکر صدیق نے بعد کے زمانہ میں ان الفاظ میں بیان کی: مَا كَانَ فَتْحٌ أَعْظَمَ فِي الْإِسْلَامِ مِنْ فَتْحِ الْحُدَيْبِيَةِ، وَلَكِنَّ النَّاسَ يَوْمَئِذٍ قَصُرَ رَأْيُهُمْ عَمَّا كَانَ بَيْنَ مُحَمَّدٍ وَرَبِّهِ، وَالْعِبَادُ يَعْجَلُونَ وَاللّٰهُ لَا يَعْجَلُ كَعَجَلَةِ الْعِبَادِ حَتَّى يُبَلِّغَ الْأُمُورَ مَا أَرَادَ (مغازی الواقدی، جلد 2، صفحہ 610)۔ یعنی، اسلام میں حدیبیہ کی فتح

سب سے بڑی فتح تھی۔لیکن معاہدہ کے دن لوگوں کواس بات میں رائے قائم کرنے میں کوتاہی ہوئی جومحمد اورآپ کے رب کے درمیان تھا۔انسان عجلت پسند ہے اوراللہ انسانوں کی طرح عجلت نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ امور کو وہاں تک پہنچا دے جو وہ چاہتا ہے۔

6۔ہجر جمیل (حسن اعراض) سادہ طور پر محض ایک بچاؤ کی تدبیر نہیں، بلکہ وہ بامقصد انسان کی سوچی سمجھی ایک مستقل اخلاقی روش ہے۔ بامقصد انسان کے سامنے ایک متعین منزل ہوتی ہے، جہاں پہنچنا اس کا سب سے بڑا کنسرن (concern) ہوتا ہے۔اس لیے وہ راستے کے ہر الجھاؤ سے اپنے آپ کو دور رکھتا ہے تا کہ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر اپنی آخری منزل تک پہنچ سکے۔

جیسا کہ معلوم ہے، قدیم مکہ کے لوگوں نے پیغمبر اسلام کو بہت زیادہ ستایا تھا۔آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر اتنا زیادہ تشدّد کیا کہ آپ کو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مکہ چھوڑ دینا پڑا۔اس ترک وطن کے بعد بھی وہ آپ کے خلاف مسلسل جارحیت کرتے رہے۔

آخر کار وہ وقت آیا جب کہ پیغمبر اسلام اللہ کی مدد سے مکہ کے فاتح بن گئے۔اب وقت تھا کہ ماضی کے ظلم کی انہیں سزا دی جائے۔عام رواج کے مطابق، ان کو قتل کر دینا عین جائز تھا۔مگر پیغمبر اسلام نے ان لوگوں کے ساتھ ہجر جمیل کی روش اختیار کی۔تاریخ بتاتی ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب قریش کے یہ مجرمین آپ کے سامنے حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا۔انہوں نے کہا کہ۔اخ کریم وابن اخ کریم۔(آپ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں)۔

پیغمبر اسلام نے اس کے بعد فرمایا کہ ٹھیک ہے۔میں تمہارے بارہ میں وہی کہوں گا جو پیغمبر یوسف نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (12:92)۔یعنی، آج تمہارے اوپر کوئی الزام نہیں یہ کہہ کر آپ نے فرمایا کہ۔جاؤ تم سب لوگ آزاد ہو۔اس طرح آپ نے ان تمام لوگوں کو آزاد کر دیا جو اس سے پہلے آپ کے خلاف کھلے دشمن بنے ہوئے تھے۔

پیغمبر اسلام کا یہ عمل ایک بامقصد انسان کے عمل کی ایک اعلیٰ مثال تھی۔ پیغمبر اسلام کا مقصد یہ تھا کہ آپ بیت اللہ کو بتوں سے پاک کریں۔ مکہ کے لوگوں کو شرک سے نکال کر انھیں خدائے واحد کا پرستار بنائیں۔ اپنے دشمن انسان کو دوست انسان میں تبدیل کر کے توحید کی بنیاد پر وہ انقلاب لائیں، جس کے لیے آپ کو مبعوث کیا گیا تھا۔

پیغمبر اسلام کے یک طرفہ حسن سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ کے تمام لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔ راوی کہتے ہیں کہ — فَخَرَجُوا كَأَنَّمَا نُشِرُوا مِنَ الْقُبُورِ فَدَخَلُوا فِي الْإِسْلَامِ (شرح معانی الآثار للطحاوی، حدیث نمبر 5454)۔ یعنی، پھر وہ لوگ وہاں سے اس طرح نکلے جیسے کہ وہ قبروں سے نکلے ہوں اور وہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

پیغمبر اسلام اگر اس کے برعکس ان دشمنوں سے ان کی ظالمانہ روش کا انتقام لیتے تو اس کے بعد یہ ہوتا کہ وہاں انتقام در انتقام کا دور چل پڑتا۔ ایک انتقام کے بعد دوسرا انتقام شروع ہو جاتا اور پھر حالات ایسا منفی رخ اختیار کر لیتے کہ سارا تعمیری منصوبہ درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔

غیر فطری ردعمل

جب کوئی خلاف مزاج بات پیش آئے تو اس کے مقابلے میں آدمی کی روش کی دو مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک جذباتی ردعمل کا طریقہ، اور دوسرا غیر جذباتی ردعمل کا طریقہ۔ جذباتی ردعمل عین وہی چیز ہے جس کو میڈیکل اصطلاح میں الرجی (allergy) کہا جاتا ہے۔ الرجی کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ الرجی نام ہے، معتدل حالات میں غیر معتدل ردعمل کا۔

Abnormal reaction to normal things.

مثلاً اپنے خلاف تنقید کو سن کر غصہ ہونا، اسی قسم کی ایک الرجی ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کی کسی بات پر تنقید کرتا ہے تو اس کا معتدل اور فطری ردعمل یہ ہے کہ آپ کھلے ذہن کے ساتھ

اس کو سنیں اور کھلے ذہن کے ساتھ اس پر غور کریں۔ اگر تنقید غلط ہے تو آپ کو چاہیے کہ آپ دلیل کے ساتھ اس کا جواب دیں اور اگر تنقید درست ہے تو سیدھی طرح اس کو مان لیں۔ اس کے برعکس، تنقید کو سن کر بگڑ جانا تنقید کا غیر معتدل اور غیر فطری انداز میں جواب دینا ہے۔ پہلی صورت مریضانہ ذہنیت کا ثبوت ہے اور دوسری صورت صحت مند ذہنیت کا ثبوت۔

اسی طرح مخالفانہ نعرہ سن کر مشتعل ہو جانا، توہین کے کسی معاملہ پر بھڑک اٹھنا، اپنے راستے میں کوئی رکاوٹ دیکھ کر بگڑ جانا، اپنی سوچ کے خلاف سوچ کو برداشت نہ کرسکنا، یہ سب جذباتی ردعمل کی صورتیں ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ دوسروں کے خلاف نفرت اور تشدّد میں پڑے رہتے ہیں۔ وہ زندگی کے مثبت اور تعمیری رخ کا تجربہ کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

اس کے برعکس، دوسرا طریقہ غیر جذباتی ردعمل کا طریقہ ہے۔ اسی کو قرآن میں ہجر جمیل کہا گیا ہے۔ یعنی جب اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات پیش آئے تو مشتعل نہ ہو کر ٹھنڈے ذہن کے ساتھ اس پر غور کرنا، اور سوچے سمجھے فیصلے کے تحت معتدل انداز میں اس کا جواب دینا۔

اس معتدل جواب کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ سادہ طور پر بس اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یعنی وہی رویہ جس کو عام زبان میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے — کتے بھونکتے رہتے ہیں اور ہاتھی چلتا رہتا ہے۔

اسی طرح کبھی ہجر جمیل کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مخالف گروہ کی بدعملی کا جواب خوش عملی سے دیا جائے۔ اس کے پست اخلاق کے مقابلہ میں برتر اخلاق کا طریقہ اختیار کر کے اس کو مغلوب کر لیا جائے۔ اسی طرح کبھی حالات کا تقاضا یہ ہو سکتا ہے کہ دباؤ کی سیاست (pressure tactics) کا طریقہ اختیار کر کے اس کو خاموش ہونے پر مجبور کر دیا جائے۔

ہجر جمیل کی کوئی ایک لگی بندھی صورت نہیں۔ حالات کے اعتبار سے اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ تاہم جو صورت بھی اختیار کی جائے وہ سوچے سمجھے منصوبہ کی بنیاد پر ہوگی،

نہ کہ بلاسوچے سمجھے ردعمل کی حیثیت سے۔ اس کا بنیادی مقصد اعراض کرنا ہوگا، نہ کہ الجھ جانا۔ وہ ہمیشہ امن کے اصول پر ہوگی، نہ کہ تشدّد کے اصول پر۔ اس کے پیچھے کبھی بھی نفرت اور انتقام کا جذبہ نہیں ہوگا بلکہ صرف یہ جذبہ ہوگا کہ کسی نہ کسی طرح حسن تدبیر کے ذریعہ معاملہ کو ٹال دیا جائے تاکہ زندگی کی گاڑی معمول کے مطابق اپنے مطلوب رخ پر چلنے لگے۔

ہجر جمیل کا نشانہ خارجی مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ آدمی کی خود اپنی ذات ہوتی ہے۔ ہجر جمیل کا نشانہ یہ نہیں ہوتا کہ خود مسئلہ کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس کا نشانہ یہ ہوتا ہے کہ مسئلہ کو اپنے خلاف مسئلہ بننے سے روک دیا جائے۔

جنگ سے امن تک

قرآن میں دومقام پر آیت آئی ہے کہ فتنہ کوختم کرنے کے لیے جنگ کرو: وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (2:193)۔ اس آیت میں فتنہ سے مراد مذہبی جبر (religious persecution) ہے۔ اس آیت کے ذریعہ رسول اور اصحاب رسول کو حکم دیا گیا ہے کہ تم لوگ مذہبی جبر کے موجودہ نظام کو توڑ دو تا کہ دنیا میں مذہبی آزادی کا ماحول قائم ہو جائے۔ جو لوگ اللہ کے دین کو اختیار کرنا چاہیں ان کے راستے میں کوئی پابندی باقی نہ رہے۔ واضح ہو کہ پیغمبر اسلام کے معاصر قوتوں نے آپ کے خلاف خود ہی بدء (التوبۃ، 9:13) کا عمل کیا۔ اس طرح انھوں نے جارحیت کا آغاز کر کے فتنہ کے خلاف آپ کے آپریشن کو دفاعی جنگ کی صورت دے دی۔

اس آیت میں ایک معلوم اور متعین مقصد کے لیے جنگ کا حکم دیا گیا تھا، اور وہ تھا، مذہبی جبر کا خاتمہ۔ اس آیت کو لے کر کسی اور مقصد کے لیے جنگ چھیڑنا درست نہ تھا۔ مگر بعد کے زمانے میں ایسا کیا گیا کہ قتالِ فتنہ کے حکم کی توسیع کر کے اس کو دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک انحراف (deviation) یا گاڑی کا اپنی پٹری سے اترنا (derailment) تھا۔ مگر ایسا ہوا، اور اس کا سلسلہ کسی نہ کسی عنوان سے آج تک جاری ہے۔

1۔ اس سلسلے میں پہلا انحراف اصحاب رسول کی دوسری نسل (second generation) میں پیش آیا۔ اس معاملہ میں دو نام زیادہ نمایاں ہیں۔ ایک الحسین بن علی (م 61ھ) اور دوسرے عبداللہ بن الزبیر (م 73ھ)۔ دونوں حضرات نے اموی حکمراں یزید بن معاویہ کے خلاف خروج (بغاوت) کیا۔ دونوں حضرات نے اپنے عمل کے وجہ

سے جواز کے طور پر یزید کے ظلم کا حوالہ دیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جس قتال فتنہ کا تعلق مذہبی جبر سے تھا اس میں تصرف کر کے اس کو انہوں نے سیاسی بدعنوانی (political corruption) تک وسیع کر دیا۔

قتال فتنہ کے حکم کی یہ توسیع بلا شبہ ایک اجتہادی خطا تھی۔ اس کا قطعی ثبوت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے واضح طور پر یہ حکم دیا تھا کہ میرے بعد حکمرانوں کے بگاڑ کو لے کر ہرگز ان کے خلاف خروج نہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں حضرات کی جنگوں کے وقت صحابہ کرام کی بڑی تعداد موجود تھی، مگر وہ ان جنگوں میں شریک نہیں ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے واضح طور پر اعلان کیا کہ بعد کے زمانے کی یہ جنگ قتال فتنہ کے حکم سے انحراف ہے، نہ کہ اس کا اتباع (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7095)۔

2۔ اس سلسلہ کا دوسرا انحراف زیادہ بڑے پیمانہ پر خلافت راشدہ کے بعد شروع ہوا اور پھر تقریباً ہزار سال تک جاری رہا۔ یہ انحراف مسلم حکمرانوں کی طرف سے کیا گیا۔ انہوں نے مذہبی جبر کے خلاف جنگ کے مفہوم میں اضافہ کر کے اس کو مسلم سلطنت کی توسیع (political expansion) کے معنی میں لے لیا۔ وہ پوری دنیا میں مسلم سلطنت کی توسیع کے لیے لڑائیاں لڑتے رہے۔

قتال فتنہ کے حکم کی یہ توسیع بھی بلا شبہ ایک انحراف تھی۔ قرآن میں امت کو عالمی مشن دیا گیا تھا وہ شہادت علی الناس تھا، نہ کہ لوگوں کے اوپر اپنا سیاسی اقتدار قائم کرنا۔ یہی بات پیغمبر اسلام نے اس طرح فرمائی کہ اللہ نے مجھ کو سارے انسانوں کے لیے بنا کر بھیجا ہے۔ اس لیے تم میرے لائے ہوئے پیغام کو میری طرف سے تمام دنیا والوں تک پہنچا دو: فَأَدُّوا عَنِّي (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 607)۔ اس اعتبار سے بعد کے دور میں مسلمانوں کا اصل کام دعوت الی اللہ تھا، نہ کہ اقتدار کی سیاست چلانا۔

3۔اس سلسلہ کا تیسرا شدید تر انحراف وہ ہے جو موجودہ زمانہ میں پیش آیا۔ یہ کچھ مسلم مفکرین کی طرف سے مذکورہ قرآنی آیت کی نام نہاد انقلابی تفسیر تھی۔ان لوگوں نے آیت کے حکم میں خود ساختہ توسیع کر کے اس کو قتال برائے تنفیذ احکام کے معنی میں لے لیا۔انہوں نے کہا کہ اس آیت کے مطابق، ہر زمانے کے مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ وہ حکمرانوں سے جنگ کر کے اسلام کے احکام کو ہر جگہ نافذ کریں۔

قتال فتنہ کے حکم میں یہ توسیع ایک مہلک قسم کا انحراف ہے۔اس نے مسلمانوں کے اندر غلط طور پر یہ ذہن پیدا کیا کہ ہر جگہ اسلامی حکومت قائم کرنا ان کا مذہبی فریضہ ہے۔اس کے نتیجے میں ہر جگہ جہاد کے نام پر تشدّد ہونے لگا۔ کچھ مسلمان گن اور بم لے کر دنیا والوں پر ٹوٹ پڑے۔ دوسرے مسلمان جنہوں نے اس متشدّدانہ فعل میں عملاً شرکت نہیں کی، وہ بھی اس انقلابی نظریہ سے اتنا مسحور ہوئے کہ وہ اس کی ہمت نہ کر سکے کہ وہ کھل کر اس کی مذمت کریں اور اس کے غیر اسلامی ہونے کا اعلان کریں۔

بیسویں صدی عیسوی پوری کی پوری اسلام کے نام پر اس غیر اسلام کا نمونہ بن گئی۔ اس کا نتیجہ دو مہلک صورتوں میں برآمد ہوا۔ایک، اسلام کی بدنامی۔ ساری دنیا میں اسلام خلافِ واقعہ طور پر نفرت اور تشدّد کا مذہب سمجھا جانے لگا۔اس کی ایک مثال یہ ہے کہ لندن کے مشہور انگریزی روزنامہ میں اسلام کے بارے میں ایک آرٹیکل چھپا جس کا عنوان یہ تھا۔ایک مذہب، جو تشدّد کو جائز قرار دیتا ہے۔

A religion that sanctions violence.

دوسری خرابی یہ ہوئی کہ موجودہ زمانے میں اسلامی دعوت کے حق میں جو نئے قیمتی امکانات پیدا ہوئے تھے وہ استعمال ہونے سے رہ گئے۔مسلمان خود ساختہ جہاد کے نام سے اپنے آپ کو بے فائدہ طور پر ہلاک کرتے رہے، وہ جدید مواقع کو استعمال کر کے اسلام کا حیات بخش پیغام دوسروں تک نہ پہنچا سکے۔

اکیسویں صدی عیسویں میں مسلمانوں کے لیے پہلا ضروری کام اسی غلطی کی تصحیح ہے۔ کوئی بھی دوسرا کام کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اسلام کے نام پر ہونے والے تشدّد کو فوری طور پر اور مکمل طور پر بند کر دیا جائے۔ اس معاملے میں کسی بھی عذر کو، خواہ وہ بظاہر کتنا ہی سنگین ہو، رکاوٹ نہ بنایا جائے۔ موجودہ زمانے میں اسلام کے حقیقی احیاء کا نقطہ آغاز یہی ہے۔ نفرت اور تشدّد کے ماحول کو ختم کر کے اہل اسلام سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں، اس کے بغیر کچھ بھی نہیں۔

امن برائے امن

امن (peace) کیا ہے۔ اہل علم اس کی تعریف کس طرح کرتے ہیں کہ امن عدم جنگ (absence of war) کا نام ہے۔ یعنی جنگ نہ ہو رہی ہو تو کہا جائے گا کہ امن قائم ہے۔ جنگ کی حالت نہ ہونے کا نام امن کی حالت ہے۔ جو لوگ اپنے کسی حق (right) کے نام پر متشدّدانہ جنگ کر رہے ہیں، وہ اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ امن مع انصاف (peace with justice) کا نام امن ہے۔ جس امن سے انصاف حاصل نہ ہو وہ امن بھی نہیں۔

یہ دوسرا نظریہ ایک غلط سوچ کا نتیجہ ہے۔ جو لوگ اس طرح سوچیں ان کو نہ کبھی امن ملے گا اور نہ انصاف۔ حقیقت یہ ہے کہ امن مقصد مواقع (opportunities) کو حاصل کرنا ہے، نہ کہ انصاف کو حاصل کرنا۔ امن بجائے خود کسی کو انصاف نہیں دیتا۔ امن صرف یہ کرتا ہے کہ وہ معتدل حالات قائم کر دیتا ہے جس میں عمل کر کے انصاف یا حق حاصل کیا جا سکے۔

موجودہ دنیا میں جب بھی کسی کو کوئی چیز ملتی ہے وہ اس کے اپنے عمل کے نتیجے میں ملتی ہے۔ امن کا فائدہ صرف یہ ہے کہ وہ آپ کے حق میں معتدل حالات پیدا کر دے جس میں آپ کے لیے اپنے موافق منصوبہ بندی کرنا ممکن ہو جائے۔ جنگ و تشدّد کے حالات کام

کے مواقع کو برباد کرتے ہیں۔ جب کہ امن اور صلح کے حالات کام کرنے کے تمام دروازے اس طرح کھول دیتے ہیں کہ اس کا کوئی دروازہ بند نہیں رہتا۔

جنگ کا دور ختم

پائرس (Pyrrhus) قدیم یونان کا یک بادشاہ تھا۔ وہ 319 ق م میں پیدا ہوا، اور 272 ق م میں اسکی وفات ہوئی۔ 279 ق م میں اس کی لڑائی رومیوں (Romans) سے ہوئی۔ اس جنگ میں شاہ پائرس جیت گیا۔ مگر جب لڑائی ختم ہوئی تو اس کی اقتصادیات اور اس کی سیاسی اورفوجی طاقت پوری طرح تباہ ہوچکی تھی۔ اسی واقعہ سے پرک وکٹری (Pyrrhic Victory) کی اصطلاح بنی ہے، یعنی تباہ کن فتح۔

قدیم زمانے میں پرک وکٹری یا تباہ کن فتح کا واقعہ بہت کم پیش آسکتا تھا۔ مگر موجودہ زمانے میں جدید ہتھیاروں کی ایجاد کے بعد ہر جنگ تباہ کن جنگ بن چکی ہے۔ اب جنگ جیتنے والے اور جنگ ہارنے والے کے درمیان اتنا ہی فرق ہوتا ہے کہ اخباروں میں دونوں کی خبریں الگ الگ الفاظ میں چھپتی ہیں، ورنہ حقیقت کے اعتبار سے دونوں کا معاملہ ایک ہوتا ہے۔ موجودہ زمانے میں ہار بھی ہار ہے اور جیت بھی ہار۔

موجودہ زمانے میں جنگ صرف خودکشی ہے، جنگ اب کسی مثبت مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں۔ کسی قوم سے کوئی چیز کھوئی گئی ہو تو اس کے لیے صبر ہے، نہ کہ جنگ۔ کیوں کہ جنگ اب اس کے لیے محرومی پر ذلت کا اضافہ ہے۔ امن کا بدل جنگ نہیں، امن کا بدل گفت وشنید ہے۔

اس معاملے کی ایک مثال پاکستان کی تاریخ میں ملتی ہے۔ پاکستان 1947 میں بنا۔ اس وقت بنگلہ دیش پاکستان کا مغربی حصہ تھا۔ پھر ایسے حالات پیش آئے کہ بنگلہ دیش پاکستان سے پوری طرح الگ ہوگیا۔ آخرکار پاکستان نے حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے

اس جغرافی محرومی پر صبر کرلیا۔ اگر پاکستان ایسا نہ کرتا تو وہ اپنے کھوئے ہوئے حصہ کی خاطر اپنے بقیہ حصہ کو بھی تباہ کرلیتا۔ جنگ کا مطلب نتیجے کے اعتبار سے یہ ہے کہ جو کچھ بچا ہے اس کو بھی کھودیا جائے، جزئی محرومی کو کلی محرومی بنادیا جائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جنگ اب کسی کے لیے بھی انتخاب (option) نہیں۔ آج کی جنگ میں ہارنے والے کے لیے بھی ہار ہے اور جیتنے والے کے لیے بھی ہار۔ تاہم اس میں مایوسی کی کوئی ضرورت نہیں۔ دور جدید نے اگر ایک طرف جنگ کو ناممکن بنادیا ہے تو دوسری طرف جدید دور کے نتیجہ میں ایسی انقلابی تبدیلیاں ظہور میں آئی ہیں کہ کوئی محرومی ثابت نہ ہو۔ آج کوئی فرد یا گروہ، خواہ وہ کسی بھی حال میں ہو، از سرنو اپنی منصوبہ بندی کرکے دوبارہ پہلے سے زیادہ بڑی کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔ کھونے کے بعد وہ کامیابی کے نئے امکانات کو پاسکتا ہے۔

موجودہ زمانے میں کمیونیکیشن نے چھوٹے ملک اور بڑے ملک کے فرق کو مٹا دیا ہے۔ گلوبلائزیشن کے جدید دور نے جغرافی حدودیت کے تصور کو عملاً غیر موثر بنادیا ہے۔ جدید تبدیلیوں کے بعد اب جنگ کی حیثیت کسی صحت مند انتخاب کی نہیں رہی۔

اب جنگ سادہ طور پر جنگ نہیں، وہ غصہ اور نفرت اور مایوسی کے تحت پیش آنے والا ایک منفی واقعہ ہے، نہ کہ کسی تعمیری منصوبہ بندی کا مثبت نتیجہ۔ اب جنگ صرف خودکشی کی مایوسانہ چھلانگ ہے، وہ کسی صحت مند ذہن کے تحت کیا ہوا مفید اقدام نہیں۔

صحبت کا فلسفہ

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کو اسلام میں جو امتیازی درجہ ملا وہ صحبت رسول کی بنا پر تھا۔ یہ بات بجائے خود صحیح ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ صحبت کوئی پُراسرار (mysterious) چیز ہے اور اس کی پراسرار تاثیر کے نتیجے میں اصحاب رسول کو مجرد صحبت کی بنا پر خود بخود یہ فائدہ حاصل ہوا۔ یہ نظریہ علمی طور پر درست نہیں۔ وہ اس معاملے کی پوری توجیہ نہیں کرتا۔ مثلاً اس نظریہ میں اس واقعہ کی توجیہ موجود نہیں کہ مدینہ کے سیکڑوں دوسرے لوگ جو بظاہر ایمان لائے اور پیغمبر کی صحبت میں بار بار بیٹھے، مگر وہ آپ کی صحبت سے فیض حاصل نہ کر سکے اور اسلام کی تاریخ میں منافق کہلائے گئے۔

اصل یہ ہے کہ کسی انسان کے لیے اعلیٰ ایمان حاصل کرنے کا ذریعہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے معرفت یا ذہنی ارتقاء۔ ایمان قبول کرنے کے بعد آدمی کے اندر معرفت کے رخ پر ایک تفکیری عمل (thinking process) جاری ہوتا ہے۔ یہ تفکیری عمل ہی دراصل کسی مومن کے لیے اعلیٰ ایمانی درجہ حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔

پیغمبر کی صحبت میں دراصل یہی تفکیری عمل جاری رہتا تھا۔ لوگ آپ کی باتوں کو سنتے، وہ آپ کی باتوں کو اپنے ذہن میں اس طرح جگہ دیتے کہ وہ ان کے ذہن میں ہلچل پیدا کر دیتا۔ اس طرح ان کے اندر تفکیر کا عمل مسلسل ہر صبح وشام جاری رہتا۔ رسول اللہ کی صحبت اس تفکیری عمل کا ذریعہ تھی، اس لیے اس کو صحبت رسول سے منسوب کیا گیا۔

تاہم پیغمبر کی باتیں سادہ طور پر صرف سننا کافی نہیں۔ پیغمبر کی باتیں صرف اس انسان کے لیے مفید بنیں گی جو ریسپٹیو (receptive) ہو، جو یکسو ہو کر سنے اور پھر نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہو کر اس کو قبول کر سکے۔ مخلص اہل ایمان میں قبولیت (receptivity)

پوری طرح موجود تھی اس لیے ان کو صحبت رسول کا فائدہ حاصل ہوا۔ منافقین کے اندر یہ قبولیت موجود نہ تھی اس لیے وہ صحبت رسول کے باوجود اس کا فائدہ نہ پا سکے۔

صحابیت کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ — مَنْ رَأَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُؤْمِنًا بِهِ، وَمَاتَ عَلَى ذَلِكَ، فَهُوَ صَحَابِيٌّ (جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کو حالت ایمان میں دیکھا اور اس پر اس کی موت واقع ہوئی تو وہ صحابی ہے)۔ یہ تعریف صحابیت کی ایک ناقص تعریف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صحبت کا مفہوم متعین کرنے کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ رسول اللہ کے زمانے میں عملی طور صحبت کی صورت کیا تھی۔ وہاں ایسا نہ تھا کہ مجلس میں رسول اللہ ﷺ خاموش بیٹھے ہوں اور صحابہ بھی بعد از ایمان آپ کی صحبت میں خاموش بیٹھ کر صرف آپ کو دیکھتے رہتے ہوں۔ آپ کی صحبت میں ہمیشہ تفکر و تدبر کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ قرآن کے الفاظ میں تعلیم حکمت کا ایک حلقہ ہوتا تھا (البقرۃ، 2:151)۔

اس کے برعکس، واقعات بتاتے ہیں کا آپ کی صحبت ایک زندہ صحبت تھی۔ آپ ان لوگوں کے سامنے نعمت رب کی تحدیث فرماتے تھے (الضحیٰ، 93:11)۔ آپ حاضرین کو اس رزق رب سے باخبر کرتے تھے جس کی توفیق آپ کو اللہ کی طرف سے دی جاتی تھی (طٰہٰ، 20:131)۔ آپ قرآن کی آیتوں کی تشریح فرماتے تھے۔ آپ لوگوں کے سوال کا جواب دیتے تھے۔ آپ وہ باتیں فرماتے تھے جس سے لوگوں کا شک یقین میں بدل جاتا تھا۔ آپ لوگوں کو ذکر و دعا اور حمد و شکر کے کلمات کی تعلیم دیتے تھے۔ آپ لوگوں کو قرآن کے نازل شدہ حصّے سناتے تھے۔ آپ لوگوں کو پچھلے انبیاء اور پچھلے اہل ایمان کے پُر تاثر واقعات کی خبر دیتے تھے، وغیرہ۔

رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں بیٹھنے والے آپ سے اس قسم کی زلزلہ خیز باتیں سنتے تھے۔ آپ کی صحبت میں لوگوں کو اس طرح فکری ہلچل کی غذا ملتی تھی۔ آپ کی صحبت مکمل معنوں میں ایک زندہ صحبت تھی۔ آپ کی صحبت کا اس طرح زندگی بخش ہونا وہ اصل سبب تھا جس نے

آپ کے ہم زمانہ اہل ایمان کو عظیم درجہ دے دیا جس کو تاریخ میں اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔ یہ فکری انقلاب کا ایک واقعہ تھا، نہ کہ سادہ طور پر صرف صحبت میں بیٹھنے کا۔

یہی معاملہ بعد کے دور کے علما اور بزرگوں کا ہے۔ ان میں سے کسی کی صحبت میں پراسرار تاثیر نہیں۔ یہ معاملہ تمام تر صحبت میں بیٹھنے والوں اور وہاں کی باتیں سننے والوں کی اپنی استعداد پر منحصر ہے۔ جن افراد کے اندر مادّہ قبولیت ہوگا وہ صحبت کا فائدہ حاصل کر سکیں گے۔ اور جن افراد کے اندر قبولیت کا مادّہ نہ ہوگا وہ فائدے سے محروم رہیں گے۔ اس تشریح کی روشنی میں صحابی کی زیادہ صحیح تعریف یہ ہونا چاہیے۔ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حالت ایمان میں دیکھا اور آپ کی صحبت سے استفادہ کیا اور اسی حال میں اس کی موت ہوئی تو وہ صحابی ہے۔

عمومی صحبت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمومی صحبت جو اکثر مسجد میں یا کسی اور مجلس میں آپ کے اصحاب کو حاصل ہوتی تھی، اس کی ایک مثال یہاں نقل کی جاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ آپ کی مجلسوں میں اصحاب رسول کو کس طرح ذہنی تعمیر کی خوراک ملتی رہتی تھی۔

عَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى اللّٰه عليه وسلم: كَيْفَ أَنْتُمْ وَأَئِمَّةٌ مِنْ بَعْدِي يَسْتَأْثِرُونَ بِهَذَا الْفَيْءِ؟ قُلْتُ: أَمَا وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ أَضَعُ سَيْفِي عَلَى عَاتِقِي ثُمَّ أَضْرِبُ بِهِ حَتَّى أَلْقَاكَ أَوْ أَلْحَقَكَ. قَالَ: أَوَلَا أَدُلُّكَ عَلَى خَيْرٍ مِنْ ذَلِكَ تَصْبِرُ حَتَّى تَلْقَانِي (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 4759)۔

یعنی، ابوذر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اس وقت تمہارا حال کیا ہوگا جب میرے بعد والے حکمراں آئیں گے۔ وہ فئ (اموال حکومت) کو اپنے لیے خاص کرلیں گے۔ میں نے کہا کہ اس خدا کی قسم، جس نے آپ کو حق کے ساتھ

بھیجا ہے، میں تلوار کو اپنے کندھے پر رکھوں گا اور پھر اس سے انہیں ماروں گا یہاں تک کہ میں آپ سے مل جاؤں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا میں تم کو اس سے زیادہ بہتر بات نہ بتاؤں۔ تم صبر کرو، یہاں تک کہ تم مجھ سے مل جاؤ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ارشاد کے ذریعے اپنے اصحاب کو ایک نئی فکری روشنی دی۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ جب اپنے حکمرانوں میں بگاڑ دیکھتے ہیں تو وہ اصلاحِ سیاست کے نام پر ان سے متشدّدانہ ٹکراؤ شروع کر دیتے ہیں۔ رسول اللہ نے بتایا کہ بگاڑ کے زمانے میں حکمرانوں سے ٹکرا کر شہید ہو جانے سے زیادہ بہتر بات یہ ہے کہ ان کے بگاڑ پر صبر کیا جائے، اور یہ سب اس وقت تک جاری رکھا جائے جب کہ انسان کی موت آجائے۔

اس حدیث میں ''صبر'' سے مراد بے عملی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ایک عظیم ترین عمل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکمرانوں سے نزاع کا طریقہ چھوڑ کر اپنے عمل کے لیے غیر نزاعی طریقہ ڈھونڈنا اور اس پر کاربند ہو جانا۔ سیاسی نزاع کا طریقہ ہمیشہ بے صبری کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں نزاع کو اوائڈ کرتے ہوئے عمل کرنا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی اپنے جذبات پر کنٹرول کر کے صابرانہ انداز میں اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔

یہ ایک عظیم حکمت تھی جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو تلقین فرمائی، صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین نے اس حکمت کو سمجھا اور اس پر بھرپور عمل کیا۔ اس کے نتیجے میں دورِ اوّل میں وہ عظیم اسلامی کام انجام پایا جو مذکورہ صابرانہ سیاست کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔

جیسا کہ معلوم ہے، خلفائے راشدین کے بعد فوراً سیاست میں بگاڑ آ گیا۔ مسلم حکمراں شریعت کے مقرر راستے سے ہٹ گئے۔ اس زمانے میں اگر اہل ایمان اپنے حکمرانوں سے متشدّدانہ ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کرتے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پہلی اور دوسری نسل کے تمام بہترین لوگ قتل کر دیے جاتے۔ ابتدائی نسل کے وہ تمام تاریخ ساز لوگ قبروں میں دفن ہو جاتے۔ اسلام کی عظیم تاریخ بننے کی نوبت ہی نہ آتی جو ان لوگوں کے ذریعہ بنی۔

مثلاًابتدائی نسل کے یہی وہ لوگ ہیں جوسیاسی ٹکراؤ کےمحاذ کوچھوڑ کر پُرامن دعوت کے میدان میں سرگرم ہو گئےاورکروڑوں لوگوں کواسلام کے دائرہ میں داخل کردیا۔انہوں نے دور پریس سے پہلے قرآن کی حفاظت اوراشاعت کاوہ عظیم کام انجام دیاجس کی مثال دوسری آسمانی کتابوں میں نہیں ملتی۔انہوں نے لاکھوں حدیثوں کوجمع کرکےان کی چھان بین کی اورصحیح احادیث کےمجموعے تیارکرکے دنیا کوعلم حدیث کاقیمتی تحفہ دیا۔انہوں نےفقہ کی تدوین کاوہ عظیم کام انجام دیاجس کی مثال کسی اوردین میں موجودنہیں۔

اسی طرح یہی ابتدائی نسل کےلوگ ہیں جنہوں نےحکومتی بگاڑ سے صرفِ نظرکرکے تمام اسلامی علوم کو مدون کیا۔مثلاً سیرت،تاریخ،عقائدوکلام،عربی زبان کے لغات تیار کرنا،نحواورصرف اور بلاغت اوردوسرے متعلق علوم کی ترتیب وتدوین۔

دوراوّل کے اہل ایمان کی انہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اسلام ہراعتبار سے ایک محفوظ اور معتبر تاریخی دین بن گیا۔جب کہ کسی بھی دوسرےمذہب کو یہ حیثیت حاصل نہیں۔اور یہ تمام کارنامےصرف اس لیےانجام پائے کہ دورِاوّل کے مسلمانوں نے پیغمبر اسلام کی دی ہوئی رہنمائی کی بناپر یہ حکیمانہ طریقہ اختیارکیا کہ انہوں نے سیاسی بگاڑ کے مقابلے میں متشدّدانہ ٹکراؤ کاطریقہ چھوڑ دیا،اورخدمت اسلام کےان بقیہ شعبوں میں پُرامن طورپرسرگرم عمل ہوگئے،جوغیرنزاعی میدان میں انھیں حاصل تھا۔

توسیع صحبت

قرآن کی سورہ نمبر26 میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبراسلام ﷺ کی بابت فرمایاہے کہ وہ ساجدین کے درمیان تمہارےتقلب کودیکھ رہاہے(26:219)۔قرآن کی اس آیت میں ساجدین سےمرادمومنین ہیں۔اورتقلب کا مطلب ہے،چلنا پھرنا۔اس سےمرادرسول اللہ ﷺ کی صبح وشام کی سرگرمیاں ہیں جوآپ اہل ایمان کی اصلاح کے لیےاوران کے اندر

دینی شعور کو بیدار کرنے کے لیے انجام دیتے تھے۔آپ کی یہ کوششیں بھی توسیعی مفہوم میں صحبت رسول کا ایک حصہ تھیں۔ان کی کوششوں کے دوران آپ مسلسل اہل ایمان کے دینی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔توسیع صحبت کے معاملہ کو سمجھنے کے لیے یہاں اس قسم کی ایک مثال نقل کی جاتی ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: أَنَّ رَجُلًا شَتَمَ أَبَا بَكْرٍ وَالنَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم جَالِسٌ، فَجَعَلَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم يَعْجَبُ وَيَتَبَسَّمُ، فَلَمَّا أَكْثَرَ رَدَّ عَلَيْهِ بَعْضَ قَوْلِهِ، فَغَضِبَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم وَقَامَ، فَلَحِقَهُ أَبُو بَكْرٍ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ كَانَ يَشْتُمُنِي وَأَنْتَ جَالِسٌ، فَلَمَّا رَدَدْتُ عَلَيْهِ بَعْضَ قَوْلِهِ غَضِبْتَ وَقُمْتَ! قَالَ: " إِنَّهُ كَانَ مَعَكَ مَلَكٌ يَرُدُّ عَنْكَ، فَلَمَّا رَدَدْتَ عَلَيْهِ بَعْضَ قَوْلِهِ، وَقَعَ الشَّيْطَانُ، فَلَمْ أَكُنْ لِأَقْعُدَ مَعَ الشَّيْطَانِ " (مسند احمد، حدیث نمبر 9624)۔یعنی، ابوہریرہ بتاتے ہیں کہ ایک شخص نے ابوبکر کے خلاف سب وشتم کیا اور رسول اللہ ﷺ وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اس پر متعجب ہوتے رہے اور تبسم فرماتے رہے۔ جب اس آدمی نے بہت زیادہ سخت کلامی کی تو ابوبکر نے اس کی بعض باتوں کا جواب دے دیا۔اس کے بعد رسول اللہ ﷺ غصہ ہو گئے اور وہاں سے اٹھ گئے۔ پھر ابوبکر چل کر ان سے ملے۔انہوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، وہ آدمی مجھ کو سب شتم کر رہا تھا اور آپ بیٹھے رہے۔ پھر جب میں نے اس کی بعض باتوں کا جواب دیا تو آپ غصہ ہو گئے اور وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔آپ نے فرمایا کہ پہلے تمہارے ساتھ ایک فرشتہ تھا جو تمہاری طرف سے بول رہا تھا۔ پھر جب تم نے اس کو بعض باتوں کا جواب دیا تو (فرشتہ چلا گیا) اور شیطان آ گیا۔تو میں نے شیطان کے ساتھ بیٹھنا گوارا نہیں کیا۔

یہ اس چیز کی ایک اعلیٰ مثال ہے جس کو ہم نے پیغمبر کے ذریعہ ملی ہوئی شعوری بیداری کہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر دو قسم کی صفات ہوتی ہیں— نفس امّارہ اور نفس لوّامہ۔ نفس امّارہ شیطان کی علامت ہے اور نفس لوّامہ فرشتہ کی علامت۔ ایک آدمی آپ کو گالی دے اور آپ چپ رہیں تو گالی دینے والے کا نفس لوامہ بیدار ہو کر اندر ہی اندر اس کو ملامت کرتا رہتا ہے۔ یہ گویا آپ کی طرف سے فرشتہ کا جواب دینا ہے۔ اس کے برعکس، جب آپ ایسا کریں کہ سخت کلامی کے جواب میں آپ بھی سخت کلامی کریں تو دوسرے آدمی کا نفس امّارہ متحرک ہو جائے گا۔ یہ آدمی کا شیطان کے زیر اثر آجانا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس تلقین کے ذریعے صحابہ کو ایک عظیم حقیقت بتائی۔ آپ نے صحابہ کے اندر وہ فکری روشنی پیدا کی جو ہر معاملہ میں ان کی کامیابی کی ضامن بن جائے، خواہ وہ معاملہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے ارشاد کے ذریعہ اہل ایمان کو ایک گہری سوچ عطا کی۔ آپ نے بتایا کہ ہر انسان کے اندر پیشگی طور پر دو مختلف قسم کی شخصیتیں چھپی ہوئی ہیں۔ ایک، تمہاری دشمن شخصیت اور دوسری، تمہاری دوست شخصیت۔ یہ تمہارے اپنے اختیار میں ہے کہ تم فریق ثانی کو اپنا دوست بناتے ہو یا اپنا دشمن۔ اگر تم نے فریق ثانی کے نفس امّارہ کو جگایا تو اس کی دشمن شخصیت تمہارے حصہ میں آئے گی۔ اور اگر تم نے اس کے نفس لوّامہ کو جگایا تو اس کی دوست شخصیت تمہارے حصہ میں آئے گی۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعہ اس اہم حقیقت کی طرف نشاندہی فرمائی کہ اس دنیا میں کچھ نہ کرنے کا نام بھی کرنا ہے اور کچھ نہ بولنے کا نام بھی بولنا۔ اگر

ایک شخص آپ کے خلاف سب شتم کر رہا ہے، اور آپ جواب نہیں دیتے اس کا مطلب سادہ طور پر یہ نہیں ہے کہ آپ نے جواب نہیں دیا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے خاموش رہ کر زیادہ طاقت ور متکلم کو بولنے کا موقع دیا، یعنی خدا کے فرشتے کو۔ اس طرح یہ ممکن ہوا کہ آپ جو کام کم موثر انداز میں انجام دیتے، اس کو خدا کے فرشتہ نے زیادہ موثر انداز میں انجام دے دیا۔

دعوتِ اسلام
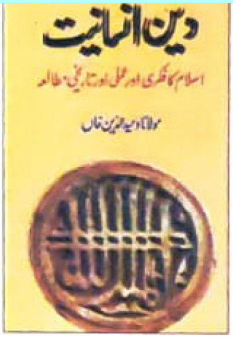
دین انسانیت
اسلام کا فکری اور عملی اور تاریخی مطالعہ
مولانا وحیدالدین خاں
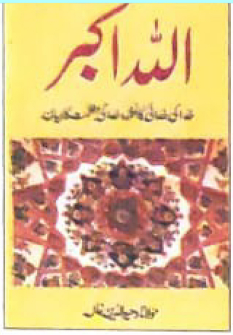
اللہ اکبر
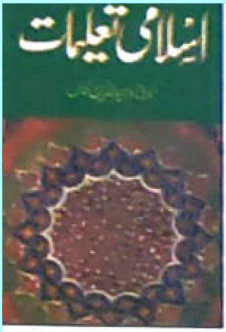
اسلامی تعلیمات

اقوالِ حکمت

قال اللہ
وقال الرسول
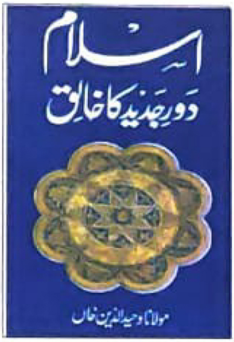
اسلام
دورِ جدید کا خالق
مولانا وحیدالدین خاں

خاتونِ اسلام

مطالعہ سیرت
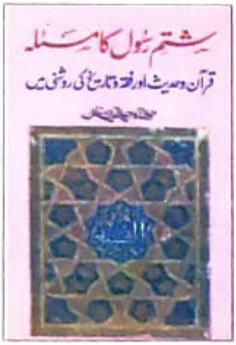
شتمِ رسول کا مسئلہ
قرآن وحدیث اور فقہ وتاریخ کی روشنی میں
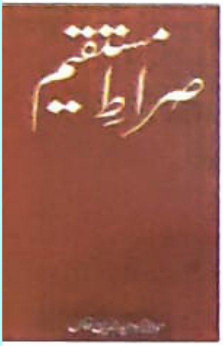
صراطِ مستقیم
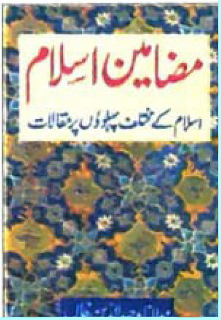
مضامین اسلام
اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مقالات

اسلام
دین فطرت
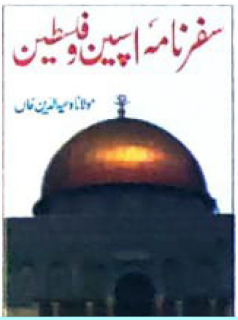
سفرنامہ اسپین وفلسطین
مولانا وحیدالدین خاں
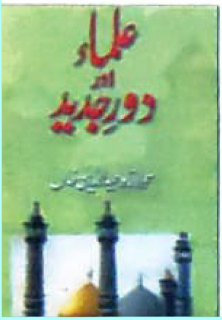
علماء
اور
دورِ جدید